سیرت النعمان (کامل)

یعنی

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

کی سوانح عمری

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

سیرت النعمان (کامل)
یعنی
امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ
کی سوانح عمری
شمس العلماء مولانا شبلی نعمانیؒ
اسلامی کتب خانہ
اردو بازار ○ لاہور ○ پاکستان
Ph: 7223506

نام کتاب .... **سیرت النعمان** (کامل)

مولف .... شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی

ناشر .... اسلامی کتب خانہ
فضل الٰہی مارکیٹ' چوک اردو بازار' لاہور۔

مطبع .... رضوان نیاز پرنٹر

کمپوزنگ .... پرنٹ ویژن

سرورق' سب ٹائٹل ایم۔اے۔حافظ

نوٹ

ہماری قارئین سے درخواست ہے کہ ہماری تمام تر کوشش (اچھی پروف ریڈنگ' معیاری پرنٹنگ) کے باوجود اس بات کا امکان ہے کہ کہیں کوئی لفظی غلطی یا کوئی اور خامی رہ گئی ہو تو ہمیں مطلع فرمائیں تا کہ آئندہ اشاعت میں اس غلطی یا خامی کو دور کیا جائے۔

شکریہ!
(ادارہ)

فہرست عنوانات سیرۃ النعمان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

حمد و ستائش کہ بہ عنوان خوش ست | نعت ہماں گو نہ ہماں ساں خوش ست
شیفتگا نیم و پیمبر پرست | سجدہ اگر نیست زمیں بوس ہست
تابخودی پایہ نگہدار باش | دم زشریعت زن وہشیار باش
درراہ الفت کہ بود پیچ پیچ | پاچو نہی بر تو نگیریم ہیچ!

من کہ دریں دائرہ ازدیر باز | پائے زخلوت نہ نہادم فراز
باز برانم کہ دریں دا وری | دل برم از خلق بافسوں گری
خواستہ ام طرح دگرر یختن | شعبدۂ تازہ برانگیختن
بزم دگر ہست و تماشا دگر | بادہ دگر آرم و مینا دگر
زمزمہ تازہ برساز افگنم | غلغلۂ در حلقۂ رازا فگنم
بادہ فرستم بہ حریفاں دگر | ازمے دو شیں قدرے تندتر
زخمہ کر برتار سخن مے زنم | ہاں بنگر تابچہ فن مے زنم
قاعدۃ سحر طرازی ست ایں | نیک نگہ کن کہ چہ بازی ست ایں
پاچودریں معرکہ افشردہ ام | پایۂ فن تا بہ کجا بردہ ام
حرمت ایں کار نگہ داشتن | نامہ بہ لعل وگہرانبا شتن
کارِمن ست ایں حدِ ہر خام نیست | ایں بود آں مے کہ بہر جام نیست
دست اگر سوئے قدح بردہ ام | جائے عنب لخت دل افشردہ ام
کان معانی ہمہ کا دیدہ ام | کیں گہرے چند فراچیدہ ام
غارتِ بت خانۂ چیں کردہ ام | تا صفحے چند گزیں کردہ ام
خاک درِ میکدہ ہا بیختم | کیں مۓ صافی بہ قدح ریختم
دایہ اگر ازدگراں خواستم | چارہ نہ زوبود ازاں خواستم
فنِ سیر گرچہ بودد لپذیر | نیست دروخودز روایت گریز

مایہ اگر از دگر آوردہ ام قطرہ ربودم گہر آوردہ ام

گرچہ مراشیوۂ فن ایں نبود حرف بہ اردو زدن آئیں نبود
بیشتر ارگرم طلب بودہ ام بادیہ پیمائے عرب بودہ ام
بزم چو آں فسرہ وآں ساز داشت ساغرِ من بادۂ شیراز داشت
لیک چوں آں مطرب وساقی نماند خوشتر ازاں نیز کہ می خواستم
گرچہ سروبرگ سخن دیگرست شمع ہماں ست، لگن دیگرست
باد گوارابہ عزیزاں تمام
بادۂ گلگوں بہ سفالینہ جام

ناموران اسلام

جس کا ایک بڑا حصہ المامون چھپ کر شائع ہو چکا ہے اول مجھ کو اس کا خیال پیدا ہوا تو نہایت وسیع بنیاد پر ہوا۔ جس طرح میں نے خلافت وسلطنت کے مختلف خاندانوں سے نامور انتخاب کئے ارادہ تھا اسی طرح سے علوم وفنون کے جدا جدا خاندان قائم کیے جائیں اور جولوگ ان خاص خاص فنون میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے ان کو سلسلہ کو ہیرو قرار دیا جائے مگر اتنا بڑا کام تنہا میرے بس کا نہ تھا۔ مجبوراً حیثیت حکومت کی قید لگا کر میں نے اس وسیع خیال کو بہت کچھ محدود کر دیا۔ بلکہ سلسلۂ حکومت سے بھی بہت سے خاندان چھوڑ دیے تاہم وہ خیال دل سے نہ گیا کہ فرصت ہوتو اہل کمال کا دربار بھی سجایا جائے کہ السیف والقلم تو اَمان۔

المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتد بہ حصہ لکھ لیا تھا لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لیے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔ اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں۔ حالانکہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو ان تصنیفات کے لیے نہایت ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں ابھی تک پوری چھپ کر نہیں آچکیں اس زمانہ انتظار میں بے کار بیٹھنا تو مشکل تھا، خیال ہوا کہ کسی اور نامور کی لائف شروع کروں۔ لیکن یہ دیکھ کر الفاروق ناتمام ہے طبیعت رک جاتی تھی اور اس میدان میں ایک قدم آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔

ادھر یہ خش چین نہ لینے دیتی تھی کہ علمی نامآوروں کے کارنامے دکھانے بھی ضرور ہیں کیونکہ اسلام میں تیغ وقلم کا ہمیشہ ساتھ رہا تھا ہے۔

آخر یہ خیال غالب آیا اور چند روز کے لیے خاندانِ حکومت کو چھوڑ کر علمی سلسلہ کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ فقہ، حدیث، ادب، منطق، فلسفہ ریاضی مختلف خاندان سامنے تھے، بعض وجوہ سے فقہ کو ترجیح دی اور امام ابوحنیفہ کو جو فقہ کے بانی ہیں اس کا ہیرو قرار دیا، امام ابوحنیفہ کے اجتہادی مسائل قریباً بارہ سو برس سے تمام اسلامی ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں بڑی بڑی عظیم الشان اسلامی سلطنتوں میں ان ہی کے مسائل قانون تھے اور آج بھی اسلامی دنیا کا غالب حصہ ان ہی کے مسائل کا پیرو ہے۔ عربی، فارسی، ترکی بلکہ یورپ کی زبانوں میں ان کی متعدد سوانحعمریاں لکھی گئیں، ظلم تھا اگر ان کے حالات زندگی خود اردو میں نہ لکھے جاتے جو بلحاظ غالب انہی کے پیرووٗں کی زبان ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کو اسلام میں جو مرتبہ حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جس کثرت سے ان کی سوانح عمریاں لکھی گئی کسی کی نہیں لکھی گئیں۔ مسلمانوں میں جو علم رجال کو ترقی ہوئی دنیا میں اس کی کوئی نظیر موجود نہیں۔ تراجم، طبقات، قرون وفیات، اعیان، سنین وغیرہ کے نام جدا جدا عنوان قائم ہوئے اور ایک عنوان کے ذیل میں اس کثرت سے کتابیں لکھی گئیں کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ لیکن خاص سیرت (لائف) کے فن کو چنداں ترقی نہیں ہوئی علماء شعراء قضاۃ، حکماء میں سے بہت کم ایسے خوش قسمت ہیں جن کے حالات مستقل تصنیفوں میں لکھے گئے، جہاں تک ہم کو معلوم ہے صرف امام ابوحنیفہ ایک شخص ہیں جن کے واقعات زندگی کے ساتھ معمول سے زیادہ اعتنا کیا گیا۔ نہایت کثرت سے ان کی سوانح عمریاں لکھی گئیں اور ان ناموروں نے لکھیں جو خود اس قابل تھے کہ ان کی مستقل سوانح عمریاں لکھی جاتیں۔ اس خصوصیت میں اگر کوئی شخص امام ابوحنیفہؒ کا ہمسر ہے تو وہ صرف امام شافعیؒ ہیں۔

امام ابوحنیفہ کے حالات میں جس قدر کتابیں لکھی گئیں، ان میں سے جسقدر ہم تحقیق کر سکے، حسب ذیل ہیں۔

نام کتاب[1]	نام مصنف	کیفیت
ا۔عقود المرجان	امام احمد بن طحاوی المتوفی ۳۲۱ھ	امام طحاوی حدیث وفقہ کے مشہور امام اور صرف ایک واسطہ سے امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں ان کی تصنیفات میں سے معانی الآثار چھپ گئی ہے۔
۲۔قلائد عقود الدرو العقیان	امام احمد بن محمد طحاوی	یہ عقد المرجان کا خلاصہ ہے
۳۔ الروضۃ العالیۃ الحنیفہ		
مناقب النعمان	امام محمد بن احمد بن شعیب المتوفی ۳۵۷ھ	امام محمد بن احمد حدیث میں حاکم کے استاد میں یہ کتاب ۲ جزول میں ہے (الجواہر المفتیہ ترجمہ محمد بن احمد)
۴۔مناقب	شیخ ابو عبد اللہ الضمیر ی حسین بن علی	قاضی ضمیری بڑے فقیہ اور فن حدیث میں دار قطنی کے شاگرد تھے۔ مورخ خطیب نے ان سے روایت کی ہے قاضی ابوالولید حاجی نے ان کو امام الحنیفہ کہا ہے ۴۷۶ ہجری میں وفات پائی۔ یہ تصنیف ایک ضخیم کتاب ہے اور امام ابو حنیفہ کے متعلق زیادہ تر ماخذ یہی کتاب ہے۔ (الجواہر المفیہ فے طبقات الحنیفہ)

[1] یہ فہرست زیادہ تر کشف الظنون سے ماخوذ ہے بعض کتابوں کے نام مصنفین اور کتب کے زائد حالات اور کتابوں سے لیے گئے ہیں اور وہاں خاص تصریح کردی گئی ہے۔

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۵۔مناقب النعمان	ابو العباس احمد بن الصلت الحمانی التوفی ۳۰۸ھ	نہایت مفصل کتاب ہے صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ خطیب بغدادی نے ابو العباس کی تصنیف کی ہے جیسا کہ حنفیوں کی نسبت ان کی عادت ہے۔
۶۔شقائق النعمان فی	علامہ جاراللہ زمخشری	زمخشری ایک نامور مصنفین ہیں تفسیر
مناقب النعمان	التوفی ۵۳۸ھ	کشاف ان کی مشہور کتاب ہے
۷مناقب النعمان	موفق الدین بن احمد المکی الخوار زمی التوفی ۵۶۸	یہ کتاب ۴۰ بابوں میں ہے۔موفق الدین علامہ زمخشری کے شاگرد ہیں، فقہ و ادب میں کامل تھے، حافظ سیوطی نے بغتیہ الوعاۃ میں ان کا ذکر کیا ہے۔
۸۔کشف الآثار	امام عبد اللہ بن محمد الحارثی	مشہور مصنف ہیں۔ ابن جوزی نے ابو سعید سے روایت کی ہے کہ حدیث میں ان کا اعتبار نہیں اس پر صاحب جواہر المضیۃ فرماتے ہیں کہ امام عبداللہ کا رتبہ ابن جوزی وابوسعید دونوں سے بڑھ کر ہے
۹۔مناقب النعمان	امام ظہیر الدین المر غینانی التوفی ۵۰۶ھ	مشہور فقیہہ ہیں۔ جواہر المضیئہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ قاضی خان انہیں کے شاگرد تھے

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۱۰۔مناقب النعمان	امام محمد الکردری المتوفی ۸۲۷ھ	گیارہ بابوں میں ہے، اس میں امام کے حالات کے ساتھ ان کے مشہور تلامذہ یعنی قاضی ابو یوسف، امام محمد، عبد اللہ بن المبارک امام زفر، داؤد الطائی، وکیع بن الجراح، حفص ابن غیاث یحییٰ بن زکریا، حسن بن زیاد کے حالات بھی جدا جدا بابوں میں لکھے ہیں۔ یہ کتاب روم میں بہت متداول ہے۔ سلطان مراد ثانی کے حکم سے محمد بن عمر نے ترکی زبان میں اس کا ترجمہ کیا۔
۱۱۔مناقب النعمان	ابوسفیان بن کاص	[illegible] الجمان میں اس کتاب کے اکثر حوالے ہیں
۱۲۔کتاب الانتہاء فے مناقب الثلاثۃ الفقہاء	قاضی ابن عبد البر المتوفی ۴۶۳ھ	امام ابوحنیفہ و امام مالک و امام شافعی کے حالات ہیں۔ علامہ ابن خلکان نے قاضی ابو یوسف کے ترجمہ میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے قاضی ابن عبد البر بہت بڑے محدث اور امام ہیں۔ ان کی کتاب الا ستیعاب صحابہ کے حالات میں ایک مشہور اور مستند کتاب ہے۔

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۱۳۔مناقب النعمان	ابو القاسم عبد اللہ بن محمد بن احمد المعروف بابن ابی العوام	
۱۴۔مناقب ابی حنیفہ	علامہ ذہبی	علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہ کے مناقب ایک جداگانہ رسالہ میں لکھے ہیں۔ علامہ ذہبی بہت بڑے محدث تھے۔ اس فن میں ان کے بعد کوئی اس رتبہ کا نہیں ہوا۔ میزان الاعتدال و کاشف وعبرودول الاسلام وتذکرہ الحفاظ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔
۱۵۔المواہب الشریف		اس کا ترجمہ ہو گیا ہے۔ جس کا نام تحفۃ السلطان فی مناقب النعمان ہے۔
بستان فے مناقب النعمان	شیخ محی الدین عبد القادر القریشی المتوفی ۷۷۵ھ	الجواہر المفئیہ فی طبقات الحنفیہ انہی کی تالیف ہے۔ حدیث میں حافظ تقی الدین سبکی کے شاگرد ہیں۔
۱۷۔تبیض الصحیفہ فے	حافظ جلال الدین سیوطی	مشہور مصنف ہیں
مناقب ابی حنیفہ		
۱۸۔عقود الجمان فے مناقب النعمان	محمد بن یوسف بن علی الدمشقی	زیادہ تفصیل آگے آئے گی
۱۹۔الخیرات الحسان فی	شہاب الدین ابن حجر مکی	مشہور مصنف ہیں

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
مناقب النعمان		
۲۰۔ قلاعد عقود التیان		مصنف کا نام معلوم نہیں دیباچہ سے معلوم ہوا کہ یمن کا کوئی عالم ہے۔
۲۱۔ مناقب النعمان	شمس الدین احمد بن محمد الستواسی	ترکی میں ہے اور نظم ہے
۲۲۔ مناقب الامام الاعظم	شیخ ابوسعید	فارسی زبان میں ہے
۲۳۔ رسالہ فی فضل ابی حنیفہ	عتیق بن داؤد الیمانی	
۲۴۔ نظم الجمان	شیخ صدم الدین ابراہیم بن محمد وقاق المتوفی ۸۰۹ھ	تین جلدوں میں ہے، امام ابوحنیفہ قاضی ابو یوسف و امام محمد ہر ایک کے حال میں الگ الگ جلد ہے
۲۵۔ مناقب الامام اعظم	مولانا محمد کامی آفندی قاضی بغداد المتوفی ۱۳۶ھ	ترکی میں ہے
۲۶۔ مناقب الامام اعظم	مستقیم زادہ سلیمان سعد الدین آفندی	ضخیم کتاب ہے ۱۱۹۸ھ میں تالیف ہوئی ترکی زبان میں ہے

افسوس کہ یہ کتابیں ہمارے ملک میں ناپید ہیں۔ میرے پاس عقود الجمان والخیرات الحسان موجود ہیں اور قلاعد العقیان کا ایک عتیق نسخہ نظر سے گزرا[1] ہے الخیرات الحسان اگرچہ اس وجہ سے کہ ابن حجر مکی کی طرف منسوب ہے زیادہ مشہور ہے لیکن وہ خود کوئی مستقل تصنیف

---

[1] روم و مصر کے سفر میں مذکورہ بالا فہرست کی اکثر کتابیں میری نظر سے گز[illegible] کے لحاظ سے کوئی کتاب ایسی نہ نکلی جس سے میر[illegible]

بلکہ تمامتر عقود الجمان کا خلاصہ ہے اور خود مصنف نے دیباچہ کتاب میں اس کا اعتراف کیا ہے۔
قلائد العقیان کے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیادہ تر قاضی ضمیری کی تصنیف سے ماخوذ ہے عقود
الجمان جو نہایت جامع اور مفصل کتاب ہے اور میری تالیف کا عام ماخذ وہی ہے۔ حافظ ابوالمحاسن
محمد بن یوسف بن علی الدمشقی الصالحی نزیل برتوقیر کی تصنیف ہے حافظ ابوالمحاسن جلال الدین
سیوطی کے شاگرد اور فن حدیث میں ممتاز ہیں یہ کتاب جیسا کہ خود مصنف نے خاتمہ میں تصریح کی
ہے ربیع الثانی ۹۳۹ھ میں تمام ہوئی۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہ کے حالات
میں بہت سی کتابیں دیکھیں جن میں سے موفق بن احمد خوارزمی کی تصنیف سب سے عمدہ تر اور
جامع ہے کتاب کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ میں نے اس مبحث میں جس قدر کتابیں دیکھیں اگر ان
سے لکھنا چاہتا تو یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں تیار ہوتی۔''

امام ابوحنیفہ کے حالات میں مستقل تصنیف تو مجھ کو ایک یہی مل سکتی لیکن رجال و تاریخ
کی مستند کتابیں جن میں امام ذکر ہے اکثر میری نظر سے گزریں جن میں تاریخ صغیر بخاری،
معارف ابن قتیبہ، مختصر تاریخ خطیب بغدادی انساب سمعانی، تہذیب الاسماء واللغات للنوی،
تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی دول الاسلام للذاہبی، عبر فی اخبار من عبر للذہبی، تہذیب التہذیب
حافظ ابن حجر عسقلانی، خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال للعلامہ صفی الدین الخزرجی خاصۃ قابل ذکر
ہیں کیونکہ یہ وہ کتابیں ہیں جن پر آج فن رجال کا مدار ہے اور حدیثوں کی تنقید کے لئے زیادہ تر
انہیں تصنیفات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

میری کتاب پر کا پہلا حصہ جن میں امام ابوحنیفہ کے حالات ہیں انہی تصنیفات سے
ماخوذ ہے لیکن دوسرا حصہ جس میں امام صاحب کی طرز اجتہاد و اصول استنباط سے بحث ہے اس
کے لئے یہ تمام دفتر بیکار تھا کیونکہ قدیم زمانہ میں سوانح عمریوں کا یہ ڈھنگ ہی نہ تھا کہ حالات
زندگی کے ساتھ اس شخص کی تصنیفا تیا مسائل سے بھی بحث کرتے، مناظرہ اور مذہبی حمایت کے پیرا
یہ میں البتہ ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ان سے مسائل اور تصنیفات پر تفصیلی ریویو لکھا جا سکتا ہے
، مثلاً:۔

ابن ابی شیبہ نے امام ابوحنیفہ کے مسائل پر جو اعتراضات کئے اور ثابت کیا کہ وہ
حدیث کے مخالف ہیں، قاسم بن قطلو بغا المتفی ۹۷۸ھ نے اس کا مفصل جواب لکھا۔

شمس الائمہ کردری نے مخول کے جواب میں ایک مستقل کتاب لکھی، اسی طرح ترجیح مذہب ابی حنیفہ کے نام سے شیخ اکمل الدین محمد بن البابرتی المتوفی ۷۸۶ھ اور شیخ ابو عبداللہ محمد بن یحییٰ البحر جانی المتوفی ۷۳۹ھ نے مستقل کتابیں لکھیں۔

مورخ سبط ابن جوزی نے ایک ضخیم کتاب دو جلدوں میں لکھی جس کا نام الانتصار لام ائمۃ الامصار ہے اسی مورخ کی ایک اور تصنیف ہے جو تین بابوں میں ہے اس میں تفصیلاً امام ابوحنیفہ کے مسائل کی عمدگی ثابتکی ہے صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ یہ کتاب اپنے باب میں بے نظیر ہے اسی مضمون پر عمر بن محمد بن سید الموصلی کی ایک تصنیف ہے جس کا نام الانتصار و الترجیح ہے سب سے مفل کتاب الابانۃ ہے جو قاضی ابو جعفر احمد ابن عبداللہ ابن القاسم کی تصنیف ہے اور چھ بابوں پر منقسم ہے پہلے باب میں ثابت کیا ہے کہ امام کا مذہب اصول سلطنت سے بہت مناسبت رکھتا تھا، دوسرا باب اس بحث میں ہے کہ ان کے مسائل حدیث و آثار سے ثابت ہیں۔ چھٹے باب میں مسائل کا ذکر ہے جن پر مخالفوں نے اعتراض کئے ہیں پھر نہایت تفصیل کے ساتھ ان کے جوابات دیے ہیں جواہر مضیہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب دیکھی ہے نہایت عمدہ کتاب ہے اور جو دعویٰ کیا ہے اس کے ثبوت میں بہت سی مثالیں دی ہیں۔"

بے شبہ اس قسم کی تصنیفات سے بہت بڑی مدد مل سکتی تھی لیکن میں مصنف کشف الظنون کی سی قسمت کہاں سے لاتا کہ ان نایاب تصنیفات پر دسترس پا سکتا بڑی تلاش سے شمس الائمہ کردری کا رسالہ بہم پہنچا کہ اس ناداری میں وہ بھی غنیمت ہے بعض بعض باتیں تو اسی رسالہ سے لیں باقی میرا تتبع اور تحقیق ہے جس کے لئے خوش قسمتی سے حدیث و فقہ کا بڑا ذخیرہ میرے پاس مہیا تھا۔

یہ بات بھی لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ امام ابوحنیفہ کی زندگی کی مختلف حیثیتیں ہیں ولادت نشوونما، طریقہ، معاشی طرز، معاشرت وغیرہ اس قسم کے حالات تاریخی پیرایہ رکھتے ہیں روایت میں ان کا ثقہ ہونا نہ ہونا محدثانہ بحث ہے ان کے مسائل و طریقہ، اجتہاد پر رائے قائم کرنی مجتہد کا کام ہے، اس لئے جو کتاب ان تمام حیثیتوں پر شامل ہوگی، ضروری ہے کہ مختلف بحثوں میں خود اس کی حیثیتیں بھی بدلتی جائیں اس کا طرز تحریر کہیں مورخانہ ہوگا کہیں محدثانہ اور کہیں دونوں پہلوؤں سے الگ مجتہدانہ روش ہوگی، اس کتاب میں میں نے ان مختلف حیثیتوں کا لحاظ

رکھا ہے۔

جو حالات تاریخ سے متعلق ہیں ان میں وہ شہادتیں کافی سمجھی ہیں جو عام مورخوں کے نزدیک مسلم جو واقعہ محدثانہ پہلو رکھتا ہے اس میں زیادہ تر تدقیق کی ہے اور تمام تر اصولوں سے کام لیا ہے جو محدثین نے اخبار و روایت کے لئے قرار دیے ہیں عام ناظرین کو شاید ان بحثوں میں مزہ نہ آئے مگر ایسے ضروری حصہ کو میں کیونکہ چھوڑ سکتا تھا۔ عام تاریخی واقعات میں گو رواۃ حدیث کی طرح بال کی کھال نہیں نکالی گئی ہے تاہم کوئی ایسا واقعہ نہیں لکھا جس کی سند موجود نہ ہو ساتھ ہی اس کا التزام کیا ہے کہ ایسی کتاب کا حوالہ نہ دیا جائے جو خود میری نظر سے نہ گذری ہو کیونکہ نقل در نقل ہو کر اکثر روایتیں اپنی حالت پر قائم نہیں رہتیں، ان احتیاطوں کے ساتھ بھی ممکن بلکہ ضرور ہے کہ مجھ سے مسامحات اور غلطیاں ہوئی ہوں لیکن میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆
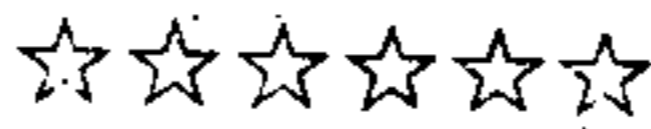
امام ابوحنیفہؒ کا نام ونسب وولادت

نعمان نام، ابوحنیفہ کنیت، امام اعظم لقب، شجرہ نسب یہ ہے، نعمان بن ثابت بن زوطی بن ماہ، یہ امر جیسا کہ خود ناموں کی ترکیب سے ظاہر ہے، عملاً مسلم ہے امام صاحب عجمی النسل تھے البتہ اس میں اختلاف ہے کہ کس نسل سے تھے اور عرب میں کیونکر آئے، خطیب مورخ بغدادی نے امام کے پوتے اسمٰعیل کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ میں اسماعیل بن حماد، بن نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان ہوں۔ ہم لوگ نسل فارس سے ہیں اور کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آئے، ہمارے دادا ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے، ثابت بچپن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے انہوں نے ان کے خاندان حق میں دعائے خیر کی تھی ہم کو امید ہے کہ وہ دعا بے اثر نہیں رہی[1]۔ اسماعیل نے امام صاحب کے دادا کے نام نعمان بتایا اور پھر دادا کا نام مرزبان حالانکہ عام طور پر زوطی اور ماہ مشہور ہیں غالباً جب زوطی ایمان لائے تو ان کا نام نعمان سے بدل دیا گیا اسماعیل نے سلسلہ نسب کے بیان میں زوطی کا وہی اسلامی نام لیا اور حمیت اسلامی

---

[1] مختصر تاریخ بغداد لابن جزلہ ترجمہ امام ابوحنیفہ ۱۲

کا مقصد بھی یہ تھا۔ زوطی کے باپ کا اصلی نام کچھ اور ہو گا اور ماہ اور مرزبان لقب ہوں گے کیونکہ اسماعیل کی روایت سے اس قدر اور بھی ثابت ہے کہ ان کا خاندان فارس کا ایک معزز اور مشہور خاندان تھا فارس میں رئیس شہر کو مرزبان کہتے ہیں اس لئے نہایت قرین قیاس ہے کہ ماہ اور مرزبان لقب ہیں نہ کہ نام، حافظ ابوالمحاسن نے قیاس لگایا ہے کہ ماہ اور مرزبان ہم معنی الفاظ ہوں گے انہوں نے قیاساً کہا، کیونکہ وہ فارسی زبان نہیں جانتے تھے لیکن میں یقیناً کہتا ہوں کہ درحقیقت ماہ اور مرزبان کے ایک معنی ہیں ماہ دراصل وہی ماہ ہے جس کے معنی بزرگ اور سردار کے ہیں۔ مشہور مصرع ہے۔

نہ کہ را منزلت ما ندنہ مہ را

عربی لہجہ نے مہ کو ماہ کر دیا۔

بعض مورخوں نے زوطی کی نسبت لکھا ہے کہ "کابل سے گرفتار ہو کر آئے اور قبیلہ بنی تیم اللہ کی ایک عورت نے خریدا، کچھ دنوں غلامی میں رہے پھر اس نے آزاد کر دیا اسی لئے امام صاحب کا خاندان مولیٰ بن تیم اللہ کہلاتا ہے" مخالفوں نے جن کو امام کی تنقیص میں مزہ آتا ہے اس روایت کو زیادہ چمکایا ہے حالانکہ اس قسم کی غلامی ثابت بھی ہو تو کسر شان کیا کیا بات ہے زمانہ نے خاندان کسریٰ پر اس لقب کا داغ لگایا ہے ہمارے علماء حضرت ہاجرہ کو کنیز تسلیم کرتے ہیں (گو توریت سے ثابت نہیں) اسلام کے قریب تر زمانے میں اکثر وہ لوگ حدیث و روایت کے امام نظر آتے ہیں جن پر اس قسم کی غلامی کا اطلاق ہو چکا تھا امام حسن بصرہ ابن سیر بن طاؤس عطا بن یسار، نافع، عکرمہ، مکحول جو اپنے زمانے کے مقتدائے عالم تھے خود یا ان کے باپ دادا غلام رہ چکے تھے۔

زوطی کا غلام ہونا بھی ثابت ہو تو کچھ عار نہیں لیکن تاریخی شہادتیں اس کے خلاف ہیں امام کے نسب میں اور بھی اختلاف ہیں۔ ابو مطیع نے ان کو نسل عرب سے شمار کیا ہے، اور سلسلۂ نسب اس طرح بیان کیا ہے۔ نعمان بن ثابت بن زوطی بن یحییٰ بن زید ابن اسد بن راشد الانصاری حافظ ابواسحٰق نے شجرۂ نسب کے متعلق یہ روایت نقل کی ہے، نعمان بن ثابت بن کاؤس بن ہرمز بن مہرام، زوطی کے مقام سکونت میں بھی اختلاف ہے اور یہ اختلاف ضرور ہونے چاہئیں تھے۔ زوطی اول اول جب عرب میں آئے ہوں گے تو برسوں تک ان کی حالت بیگانگی کی

حالت رہی ہوگی، لوگوں کو ان کے حالات کے ساتھ چنداں اعتنا نہ ہوگا اور ہوگا تو زبان کی اجنبیت کی وجہ سے صحیح حالات نہ معلوم ہو سکے ہوں گے۔ معاشرت کی ضرورتوں نے زوطی کو مجبور کیا ہوگا کہ وہاں کے رہنے والوں سے دوستانہ تعلق پیدا کریں۔ یہ طریقہ عرب میں عام طور سے جاری تھا اور اس قسم کے تعلق کو ولاء کہتے تھے جس کا مشتق مولےٰ ہے مولیٰ غلام کو بھی کہتے ہیں، اسی طرح لفظی مشارکت سے بعضوں نے زوطی کو غلام سمجھ لیا اور رفتہ رفتہ یہ خیال روایت کی شکل پکڑ کر کسی قدر عام ہو گیا، جس کی وجہ سے اسماعیل کو الزام رفع کرنا پڑا کہ واللہ ہمارا خاندان کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آیا، اسماعیل نہایت ثقہ اور معزز شخص تھے اس وجہ سے دقیقہ سنج مؤرخوں نے اس بحث میں انہی کی روایت پر اعتماد کیا ہے کہ صاحب البیت الدری بمافیھا، قاضی ضمیر جو بڑے پایہ کے مصنف ہیں صاف تصریح کی ہے کہ زوطی بنی تیم اللہ کے حلیف یعنی ہم قسم تھے [1] اس روایت کا (جس میں زوطی کی غلامی کا ذکر ہے) یہ قصہ بھی غلط ہے کہ وہ کابل سے گرفتار ہو کر آئے زوطی کے باپ دادا کے نام فارس زبان کے ہیں خود امام ابوحنیفہ کی نسبت ثابت ہے کہ وہ خاندانی حیثیت سے فارسی زبان جانتے تھے، یہ ظاہر ہے کہ کابل کی زبان فارسی نہ تھی۔

زوطی کی نسبت ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ خاص کس شہر کے رہنے والے تھے، مؤرخوں نے مختلف شہروں کے نام لیے ہیں، جن میں کسی کی نسبت ترجیحی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا البتہ یقینی طور پر جو ثابت ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اقلیم فارس اور فارسی نسل سے تھے، یہ ممالک اس زمانے میں اسلامی اثر سے معمور تھے، اور اکثر بڑے بڑے خاندان اسلام قبول کرتے جاتے تھے غالباً زوطی اسی زمانہ میں اسلام لائے اور جوشِ شوق یا خاندان والوں کی ناراضگی سے جس کا سبب تبدیل مذہب تھا عرب کا رخ کیا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا اور شہر کوفہ دارالخلافہ ہونے کا شرف رکھتا تھا۔ اس تعلق سے زوطی نے کوفہ کو پسند کیا اور وہیں سکونت اختیار کی کبھی کبھی جناب امیر کے دربار میں حاضر ہوتے اور خلوص عقیدت کے آداب بجالاتے، ایک بار نوروز کے دن جو کہ پارسیوں کی عید کا دن ہے، فالودہ نذر کے طور پر بھیجا، حضرت نے ارشاد فرمایا ''نوروز نا کل یوم'' یعنی ہمارے یہاں ہر روز نوروز ہے'' ثابت ہوا کہ امام ابوحنیفہ کے پدر بزرگوار کوفہ

---

[1] دیکھو قائد عقود العقیان باب اول، علامہ نودی نے تہذیب الاسماء واللغات کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ مولیٰ کا لفظ زیادہ تر حلیف ہی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

ہی میں پیدا ہوئے، زوطی نے نیک فال لڑکے کو حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر کیا۔ آپ نے بزرگانہ شفقت فرمائی اور ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں دعائے خیر کی۔ ثابت کے حالات زندگی بالکل نامعلوم ہیں، قرائن سے اس قدر پتہ چلتا ہے کہ تجارت کے ذریعہ زندگی بسر کرتے تھے۔ چالیس برس کی عمر ہوئی تو خدا نے فرزند عطا فرمایا جس کا نام والدین نے نعمان رکھا، لیکن زمانہ نے آگے چل کر امام اعظم کے لقب سے پکارا۔

اس وقت مالک بن مروان جو دولت مروانیہ کا دوسرا تاجدار شمار کیا جاتا ہے مسند آرائے خلافت تھا، یہ وہ عہد مبارک تھا کہ رسول اللہ صلعم کے جمال مبارک سے جن لوگوں کی آنکھیں روشن ہوئی تھیں ان میں سے چند بزرگ موجود تھے، جن میں سے بعض امام ابوحنیفہ کے آغاز شباب تک زندہ رہے، انس بن مالک نے جو رسول اللہ کے خادم خاص تھے ۹۳ھ میں وفات پائی۔ سہل بن سعد نے ۹۱ھ میں انتقال کیا اور ابوالطفیل عامر بن واثلہ تو سوہجری تک زندہ رہے لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امام ابوحنیفہ نے کسی سے بھی کوئی حدیث روایت کی، اس پر لوگوں کو نہایت تعجب ہے اور مورخوں نے اس کے مختلف اسباب خیال کیے ہیں، بعضوں کی رائے ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اس وقت تک کسی قسم کی تعلیم نہیں حاصل کی تھی، ان کے باپ دادا تجارت کرتے تھے اس لیے اُن کی نشوونما بھی ایک عام تاجر کی حیثیت سے ہوئی۔ بڑے ہونے پر امام شعبی کی ہدایت سے علم کی طرف متوجہ ہوئے اس وقت موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا، یعنی صحابہ میں سے کوئی باقی نہیں رہا تھا۔

لیکن میرے نزدیک اس کی وجہ اور ہے۔ محدثین میں باہم اختلاف ہے کہ حدیث سیکھنے کے لیے کم از کم کیا عمر مشروط ہے، اس امر میں ارباب کوفہ سب سے زیادہ احتیاط کرتے تھے یعنی ۲۰ برس سے کم عمر کا شخص حدیث کی درسگاہ میں شامل نہیں ہوسکتا تھا [1]۔ ان کے نزدیک چونکہ حدیثیں بالمعنی روایت کی گئی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ طالب علم پوری عمر کو پہنچ چکا ہو ورنہ مطالب کے سمجھنے اور اس کے ادا کرنے میں غلطی کا احتمال ہے، غالباً یہی قید تھی جس نے امام ابو حنیفہ کو ایسے بڑے شرف سے محروم رکھا، اور سچ پوچھو تو یہ مصلحت سے خالی بھی نہیں جن لوگوں نے دس بارہ برس کے سن میں صحابہ سے حدیثیں سنیں ان کی روایت اس لحاظ سے تو قابل اعتماد ہیں کہ

---

[1] مقدمہ ابن الصلاح۔ مطبوعہ لکھنو صفحہ ۲۵۸۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک صرف ایک واسطہ ہے لیکن اس بات کا قوی احتمال موجود ہے کہ کمسنی کی وجہ سے مضمون حدیث کی تمام خصوصیتیں خیال میں نہ آئی ہوں، جس کی وجہ سے ادائے مطلب میں عظیم الشان غلطیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

بہرنوع وجہ کچھ ہو واقعہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ نے کسی صحابہ سے کوئی حدیث نہیں سنی تاہم یہ شرف ان کی قسمت میں تھا کہ جن آنکھوں نے پیغمبرؐ کا جمال دیکھا تھا ان کے دیدار سے عقیدت کی آنکھیں روشن کیں یہ واقعہ ایک تاریخی واقعہ ہے لیکن چونکہ اس سے تابعیت کا رتبہ حاصل ہوتا ہے اس لیے یہ مسئلہ مذہبی پرائے میں آ گیا ہے اور اس پر بڑی بحثیں قائم ہو گئی ہیں، بے شبہ امام ابو حنیفہ کو اس شرف پر ناز تھا اور بجا تھا کہ انہوں نے حضرت انسؓ صحابی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، غیر قومیں ان باتوں کو معمولی خیال کریں گی لیکن ان واقعات سے اس محبت اور جوش عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے جو مسلمانوں کو رسول اللہ اور ان کے تعلق کی وجہ سے صحابہ کے ساتھ تھا۔ سچ ہے۔

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل بود بس ست

ہمارے زمانے کے بعض مصنفوں نے امام کی تابعیت سے انکار کیا ہے، اور یہ کوئی نئی بات نہیں، پہلے بھی لوگوں کو شبہ ہوا تھا لیکن محدثین نے جن کو اس قسم کی بحثوں کے طے کرنے کا زیادہ حق حاصل ہے امام کے موافق فیصلہ کیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی سے کہ فن حدیث کے ایک عنصر ہیں فتویٰ لیا گیا تھا، انہوں نے یہ جواب لکھا۔ ''امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں کئی صحابہ موجود تھے اس لیے کہ امام ۸۰ھ بمقام کوفہ پیدا ہوئے اور اس وقت وہاں صحابہ میں سے عبداللہ ابن ابی اوفیٰ موجود تھے۔ کیونکہ وہ ۸۲ھ میں یا اس کے بعد مرے۔ اور ابن سعد نے روایت کی ہے جس کی سند میں کچھ نقصان نہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے انسؓ بن مالک کو دیکھا تھا اور دو صحابہ کے سوا اور اصحاب بھی مختلف شہروں میں موجود تھے بعض لوگوں نے ان حدیثوں کو جمع کیا ہے جو امام نے صحابہ سے روایت کیں لیکن ان حدیثوں کی سندیں ضعف سے خالی نہیں اور صحیح یہی ہے کہ امام ان کے ہمعصر تھے اور بعض صحابہ کو دیکھا تھا جیسا کہ ابن سعد نے روایت کی ہے پس اس لحاظ سے امام ابوحنیفہ تابعین کے طبقہ میں ہیں اور یہ امر اور اماموں کی نسبت جو ان کے ہمعصر تھے مثلاً اوزاعی شام میں۔ حماد بصرہ میں ثوری کوفہ میں۔ مالک مدینہ شریف میں۔ لیث مصر میں ثابت نہیں ہوا۔ واللہ علم۔ [1]

---

[1] اس فتویٰ کو حافظ ابوالمحاسن نے عقود الجمان میں بعبارتہا نقل کیا ہے اور میں نے اس کا لفظی ترجمہ کیا ہے۔

ابن سعد کی جس روایت کا حافظ ابن حجر نے حوالہ دیا ہے وہ صرف ایک واسطہ یعنی سیف بن جابر کے ذریعہ سے امام ابوحنیفہ تک پہنچتی ہے یعنی ابن سعد نے سیف بن جابر سے سنا اور سیف نے خود امام ابوحنیفہ [1] سے۔ ابن سعد وہ شخص ہیں جن کی نسبت علامہ نووی نے تہذیب الاسماء میں لکھا ہے کہ اگر چہ ان کا شیخ واقدی ثقہ نہیں مگر وہ خود نہایت ثقہ ہیں'' سیف ابن جابر بصرہ کے قاضی اور صحیح الروایۃ تھے، اس لحاظ سے یہ روایت اس قدر صحیح اور مستند ہے کہ قوی سے قوی حدیث بھی اس سے زیادہ صحیح نہیں ہوسکتی۔ اسی بناء پر تمام بڑے بڑے محدثین مثلاً خطیب بغدادی علامہ سمعانی مصنف کتاب الانساب، علامہ نووی شارح صحیح مسلم، علامہ ذہبی حافظ ابن حجر عسقلانی، زین الدین عراقی، سخاوی، ابوالمحاسن دمشقی نے جن پر اب حدیث و روایت کا مدار ہے قطعاً فیصلہ کر دیا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے حضرت انسؓ کو دیکھا تھا [2]

ابن خلکان نے بھی خطیب بغدادی کا یہ قول نقل کیا ہے لیکن چونکہ مؤرخ مذکور نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کو کسی صحابی سے ملاقات اور روایت حاصل نہیں ہوئی، لوگوں کو دھوکا ہوا کہ ابن خلکان تابعیت کے منکر ہیں، حالانکہ ابن خاکان کو ملاقات اور روایت سے انکار ہے نہ کہ روایت سے لیکن اگر ابن خلکان کی عبارت کا وہی مطلب ہو جو بعض ظاہر بینوں نے قرار دیا ہے تاہم کون کہہ سکتا ہے کہ ایسے بڑے بڑے محدثین کے مقابلہ میں ان کی شہادت کچھ بھی اعتبار کے قابل ہوگی، اصول روایت میں یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے کہ اگر کسی واقعے کے اثبات نفی میں برابر درجے کی شہادتیں موجود ہوں تو اثبات کا اعتبار ہوگا۔ یہاں نفی کی شہادت ثبوت کے مقابلے میں بہت کم رتبہ ہے۔

بعض حنفیوں نے رویت سے بڑھ کر روایت کا دعویٰ کیا ہے اور تعجب ہے کہ علامہ عینی شارح ہدایہ بھی اس غلطی کے حامی ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ دعویٰ ہرگز پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا حالانکہ ابوالمحاسن نے عقود والجمان میں ان تمام حدیثوں کو مع سند نقل کیا ہے۔ جن کی نسبت یہ خیال ہے کہ امام نے صحابہ سے سنی تھیں، پھر اُصول حدیث سے ان کی جانچ کی ہے اور ثابت کر دیا

[1] تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی میں یہ تصریح موجود ہے۔

[2] مختصر تاریخ خطیب بغدادی و کتاب الانساب وتہذیب الاسماء واللغات وتذکرۃ الحفاظ عربی اخبار من غرلذہبی وتہذیب التہذیب میں امام ابوحنیفہ کا ترجمہ دیکھو۔

ہے کہ ہرگز ثابت نہیں، محدثانہ بحثیں تو وقت طلب ہیں صاف بات یہ ہے کہ امام نے صحابہ سے ایک روایت بھی کی ہوتی تو سب سے پہلے امام کے تلامذۂ خاص اس کی شہرت دیتے، لیکن قاضی ابو یوسف، امام محمد، حافظ عبدالرزاق ہمام عبداللہ بن المبارک، ابونعیم، فضل بن وکین، مکی بن ابراہیم ابوعاصم النبیل وغیرہ سے کہ امام کے مشہور اور با اخلاص شاگرد تھے، اور سچ پوچھئے تو زیادہ تر ان ہی لوگوں نے ان کی نام آوری کے سکے بٹھائے ہیں۔ ایک حرف بھی اس واقعہ کے متعلق منقول نہیں۔

امام کی کنیت جو نام سے زیادہ مشہور ہے حقیقی کنیت نہیں ہے امام کی کسی اولاد کا نام حنفیہ سے تھا، یہ کنیت وضعی معنی کے اعتبار سے ہے۔ یعنی ابو الملۃ الحنیفہ، قرآن مجید میں خدا نے مسلمانوں سے خطاب کر کے کہا ہے۔

فَاتَّبِعُوْا مِلَّۃَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفاً (آل عمران ۱۰)

(سو ابراہیمؑ کے طریقہ کی پیروی کرو جو ایک خدا کے ہو رہے تھے

امام ابوحنیفہ نے اسی نسبت سے اپنی کنیت ابوحنیفہ اختیار کی

سن رشد، تعلیم و تربیت، شیوخ و اساتذہ

امام کے بچپن کا زمانہ نہایت پر آشوب تھا، حجاج بن یوسف خلیفہ عبدالملک کی طرف سے عراق کا گورنر تھا اور ہر طرف ایک قیامت برپا تھی، چونکہ مذہبی گروہ کی مخالفت کی وجہ سے عرب و عراق میں اب تک مروانی حکومت کے پاؤں نہیں جمے تھے، حجاج کی سفاکیاں زیادہ تر انہیں لوگوں پر مبذول تھیں جو ائمہ مذہب اور علم و فضل کی حیثیت سے مقتدائے عالم تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سچ کہا کہ اگر اور پیغمبروں کی امتیں سب مل کر اپنے اپنے زمانے کے بدکاروں کو پیش کریں اور ہم صرف حجاج کو مقابلے میں لائیں تو واللہ ہمارا پلہ بھاری رہے گا"۔ عبدالملک نے ۸۶ھ میں وفات پائی اور اس کا بیٹا ولید تخت نشین ہوا۔ ولید کے زمانہ میں اگرچہ فتوحات نے نہایت ترقی کی، اسپین و سندھ دو بڑی ملکتیں اسلام کے قبضہ میں آ گئیں، خوارزم و سمرقند سے گذر کر کابل و فرغانہ پر علم اسلام نصب ہوا، مغرب کی طرف جزائر منورقہ و میورقہ فتح ہوئے لیکن اسلام کی روحانی برکتوں کا نشان نہ تھا، ملکی عہدہ داروں میں سے جو لوگ جس قدر زیادہ معزز

اور باوقار تھے اسی قدر ظالم اور سفاک تھے، اسی زمانہ کی نسبت حضرت عمر بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے کہ ولید شام مین، حجاج عراق میں، عثمان حجاز میں، قرہ مصر میں واللہ تمام دنیا ظلم سے بھر گئی"۔ اس عالمگیر آشوب میں بھی اگر چہ درس و تعلیم کا سلسلہ بند نہیں ہوا تھا، جا بجا حدیث و روایت کی درس گاہیں موجود تھیں اور فقہا و محدثین باوجود بے اطمینانی کے درس وتدریس میں مشغول تھے، تاہم اسلام کی حوصلہ مندیوں اور جوش کے لحاظ سے جس قدر تھا نہایت کم تھا۔

ملک کی خوش قسمتی تھی کہ حجاج ۹۵ھ میں مر گیا۔ ولید نے بھی ۹۶ھ میں وفات پائی ولید کے بعد سلیمان بن عبدالملک نے مسند خلافت کو زینت دی، جس کی نسبت مورخین کا بیان ہے کہ خلفائے بنوامیہ میں سب سے افضل تھا۔ سلیمان نے اسلامی دنیا پر سب سے بڑا یہ احسان کیا کہ عمر بن عبدالعزیز کو مشیر سلطنت بنایا اور مرتے دم تحریری وصیت کی کہ "میرے بعد عمر بن عبدالعزیز مسند خلافت پر بیٹھے، ان کی خلافت نے دفعتہً حکومت مروانی کا رنگ بدل دیا اور تمام ملک میں عدل و انصاف، علم و عمل خیر و برکت کی روح تازہ ڈال دی۔ ایک مدت سے حضرت علیؓ پر خطبوں میں جو لعن پڑھا جاتا تھا کہ ایک لخت موقوف کر دیا۔ شہزادگان بنوامیہ کے ہاتھوں سے جاگیریں چھین لیں، جہاں جہاں ظالم عمال تھے یک قلم معزول کر دیے، سب سے بڑھ کر یہ کہ علوم مذہبی کو وہ رونق دی کہ گھر گھر یہی چرچے پھیل گئے، امام زہری کو حکم دیا کہ حدیثوں کو یکجا کریں، یہ مجموعہ تیار ہوا تو ممالک اسلامیہ میں نقلیں بھجوائیں۔

غرض حجاج اور ولید کے عہد تک تو امام ابوحنیفہ کو تحصیل علم کی طرف متوجہ ہونے کی نہ رغبت ہوسکتی تھی نہ کافی موقع مل سکتا تھا۔ تجارت باپ دادا کی میراث تھی اس لیے خزبانی کا کارخانہ قائم کیا اور حسن تدبیر سے اسے بہت کچھ ترقی دی لیکن سلیمان کے عہد خلافت میں جس درس و تدریس کے چرچے عام ہوئے تو ان کے دل میں بھی ایک تحریک پیدا ہوئی حسن اتفاق یہ کہ ان ہی دنوں میں ایک اتفاقی واقعہ پیش آیا جس سے ان کے ارادے کو اور بھی استحکام ہوا۔

ایک دن بازار جا رہے تھے، امام شعبی جو کوفہ کے مشہور امام تھے ان کا مکان راہ میں تھا، سامنے سے نکلے تو انہوں نے یہ سمجھ کر کہ کوئی نوجوان طالب علم ہے، پاس بلا لیا اور پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے ایک سوداگر کا نام لیا، امام شعبی نے کہا "میرا مطلب یہ تھا تم پڑھتے کس سے ہو"۔ انہوں نے افسوس کے ساتھ جواب دیا کہ کسی سے بھی نہیں، شعبی نے کہا کہ مجھ کو تم میں

قابلیت کے جوہر نظر آتے ہیں تم علماء کی صحبت میں بیٹھا کرو! اس نصیحت نے ان کے دل میں گھر کر لیا اور نہایت اہتمام سے تحصیل علم پر متوجہ ہوئے اس وقت علم جس چیز کا نام تھا وہ ادب ،انساب، ایام العرب، فقہ، حدیث کلام تھا، کلام اگر چہ آج کل کا علم کلام نہ تھا، کیونکہ اس عہد تک مسائل اسلام پر فلسفہ کا پرتو نہیں پڑا تھا تاہم ان علوم میں وقت نظر بلندی خیال۔ زور طبع کے لیے اس سے وسیع تر میدان نہ تھا۔ اسلام جب تک عرب کی آبادی میں محدود رہا اس کے مسائل نہایت سادہ اور صاف رہے لیکن فارس اور مصر و شام پہنچ کر ان میں رنگ آمیزیاں شروع ہو گئیں۔ ان ملکوں میں اگر چہ حکمت و فلسفہ کا وہ زور باقی نہ رہا تھا، تاہم فلسفہ کے بگڑے بگڑائے مسائل عام لوگوں میں پھیل رہے تھے اور طبیعتیں عموماً باریک بینی اور احتمال آفرینی کی عادی تھیں۔

قرآن پاک میں خدا کی ذات و صفات، مبداؤ معاد وغیرہ کے متعلق جو کچھ مذکور ہے عرب نے اس کو اجمالی نگاہ سے دیکھا اور خلوص اعتقاد کے لیے وہی کافی تھا بخلاف اس کے فارس اور شام میں نہایت دقیق بحثیں پیدا ہو گئیں جو وسعت تمدن اور ترقی خیالات کے لحاظ سے ضرور پیدا ہونی چاہئیں تھیں، تنزیہہ و تشبیہہ، صفات کی عینیت و غیریت، حدوث و قدم، غرض اس قدم کے بہت سے مضامین نکل آئے جن کو بحث و تدقیق کی وسعت نے مستقل فن بنا دیا رفتہ رفتہ اعتقادی مسائل میں بھی موشگافیاں پیدا ہونے لگیں اور راویوں کے اختلافات سے مختلف فرقے بنتے گئے، جو قدری، مرجی، معتزلی، جہمی، خارجی رافضی کہلائے، یہ فتنہ یہاں تک بڑھا کر اہل حق جواب تک ان بحثوں سے الگ تھے ان کو بھی مخالفت کی ضرورت سے اس طرف متوجہ ہونا پڑا، اس طرح علم کلام کی ابتداء ہوئی جس کو تدوین و ترتیب کی وسعت نے اس رتبہ کو پہنچایا کہ بڑے بڑے ائمہ مذہب (مثلاً امام اشعری و ابو منصور ماتریدی، کا مایۂ ناز ٹھہرا۔

علمِ کلام زمانۂ مابعد میں اگر چہ مدون و مرتب ہو کر اکتسابی علوم میں داخل ہو گیا لیکن اس وقت تک اس کی تحصیل کے لیے صرف قدرتی ذہانت اور مذہبی معلومات درکار تھیں، قدرت نے امام ابوحنیفہ میں یہ تمام باتیں جمع کر دی تھیں۔ رگوں میں ایرانی خون اور طبیعت میں زور اور جدت تھی، مذہبی روایتیں اور مسائل کوفہ میں عام تھے کہ ایک معمولی شخص بھی تعلیم یافتہ لوگوں میں اٹھ بیٹھ کر حاصل کر سکتا تھا۔ امام ابوحنیفہ نے اس فن میں وہ کمال پیدا کیا کہ بڑے بڑے اساتذہ فن

---

[1] عقود الجمان باب سادس

بحث کرنے میں ان سے جی چراتے تھے۔ تجارت کی غرض سے اکثر بصرہ جانا ہوتا تھا جو ان تمام فرقوں کا دنگل اور خاص کر خارجیوں کا مرکز تھا۔ اباضیہ، صفریہ خشویہ وغیرہ سے اکثر بحثیں کیں اور ہمیشہ غالب رہے۔ آخران جھگڑوں کو چھوڑ کر وہ علم فقہ پر مائل ہوئے اور تمام عمر اس کی نذر کر دی۔ لیکن اخیر تک یہ مذاق طبیعت سے نہ گیا۔ خارجیوں وغیرہ سے ان کے مناظرے علم کلام کی جان ہیں۔ ان کی علمی زندگی کے تذکرے میں ہم بعض واقعات کی تفصیل بیان کریں گے۔

ابتداء میں تو امام صاحب اس فن کے بہت دلدادہ رہے، لیکن جس قدر عمر اور تجربہ بڑھتا جاتا تھا ان کی طبیعت رکتی جاتی تھی، خود ان کا بیان ہے کہ آغاز عمر میں اس علم کو سب سے افضل جانتا تھا۔ کیونکہ مجھ کو یقین تھا کہ عقیدہ و مذہب کی بنیاد ان ہی باتوں پر ہے، لیکن پھر خیال آیا کہ صحابۂ کبار ان بحثوں سے ہمیشہ الگ رہے، حالانکہ ان باتوں کی حقیقت ان سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا، ان کی توجہ جس قدر تھی فقہی مسائل پر تھی اور یہی مسائل وہ دوسروں کو تعلیم دیتے تھے، ساتھ ہی خیال گزرا تھا کہ جو لوگ علم کلام میں معروف ہیں ان کا طرز عمل کیا ہے؟ اس خیال سے اور بھی بے دلی پیدا ہوگئی کیونکہ ان لوگوں میں وہ اخلاقی پاکیزگی اور روحانی اوصاف نہ تھے جو اگلے بزرگوں کا تمغائے امتیاز تھا۔ [1] اسی زمانہ میں ایک دن ایک عورت نے آکر یہ مسئلہ پوچھا، کہ ایک شخص اپنی بیوی کو سنت کے طریق پر طلاق دینا چاہتا ہے کیونکر دے، خود تو بتا نہ سکا عورت کو ہدایت کی کہ "امام حماد سے جن کا حلقہ درس یہاں سے قریب ہے، جا کر پوچھئے، یہ بھی کہہ دیا کہ حماد جو کچھ بتائیں مجھ سے کہتی جانا" تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی اور کہا حماد نے یہ جواب دیا۔ "مجھ کو سخت عبرت ہوئی" اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور حماد کے حلقۂ درس میں جا بیٹھا"۔

امام کی ابتدائی تحصیل کے متعلق ایک اور روایت ہے جس کا سلسلہ سند خطیب نے امام تک پہنچایا۔ یعنی امام صاحب کا بیان ہے کہ جس سے تحصیل علم پر توجہ کی تو بہت سے علوم پیش نظر تھے اور میں متردد تھا کہ کس کو اختیار کروں۔ سب سے پہلے کلام کا خیال ساتھ ہی دل میں گزرا کہ وہ کوہ کندن وکاہ برآوردن ہے ایک مدت کی محنت و دردسری کے بعد کمال بھی پیدا کیا تو علانیہ اظہار نہیں کر سکتے کہ لوگ الحاد کی تہمت نہ لگائیں۔ ادب اور قرأت کا بجز اس کے کہ مکتب میں پڑھائیں اور کچھ فائدہ نہ تھا، شعر و شاعری میں ہجو اور جھوٹی مدح کے سوا اور کیا دھرا تھا، حدیث کے

[1] عقود الجمان باب سادس

لیے تو اولاً ایک مدت درکار تھی اور اس کے بعد کم سنوں سے واسطہ پڑتا، اور ہر وقت یہ فکر رہتی کہ لوگ جرح وتعدیل کا نشانہ نہ بنائیں، آخر فقہ پر نظر پڑی اور دنیا ودین کی حاجتیں اس سے وابستہ نظر آئیں لیکن یہ روایت محض غلط ہے۔ تمام معتمد روایتیں اسکے خلاف ہیں جو ریمارک امام صاحب کی طرف منسوب کئے ہیں ایسے جاہلانہ ریمارک ہیں کہ ایک معمولی آدمی کی طرف بھی منسوب نہیں کئے جاسکتے اس روایت کو صحیح مانیں تو ماننا پڑے گا کہ حدیث وکلام کی طرف امام ابوحنیفہ نے توجہ ہی نہیں کی، حالانکہ ان فنون میں امام ابوحنیفہ کا جو پایہ ہے اس سے کون انکار کرسکتا ہے یہ ممکن ہے کہ تحصیل علوم کے بعد امام نے خیال کیا ہو کہ کس فن کو اپنا خاص فن بنائیں اور چونکہ عام خلائق کی ضرورتیں فقہ سے وابستہ دیکھیں اس لیے اسی کو ترجیح دی، یہی بات طرز بیان کی رنگ آمیزیوں سے اس حد تک پہنچ گی جس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ یہ روایت بایں ہمہ کہ قید کتابت میں آچکی تھی، عقود الجمان کے مصنف نے نقل کی تو بہت سے اختلافات پیدا ہو گئے۔ ابن جزلہ نے تاریخ بغداد کا جو اختصار کیا ہے ہمارے پیش نظر ہے، اس میں روایت کا جہاں ذکر ہے ہر علم کے متعلق جو ریمارک ہیں دوسروں کی طرف منسوب ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کی نسبت صرف ان کا تسلیم کرنا بیان کیا ہے۔

حماد کوفہ کے مشہور امام اور استادِ وقت تھے، حضرت انس سے جو رسول اللہؐ کے خادم خاص تھے، حدیث سنی تھی اور بڑے بڑے تابعین کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے تھے اس وقت کوفہ میں انہیں کا مدرسہ مرجع عام سمجھا جاتا تھا مسعر وشعبہ نے جو آئمہ فن خیال کئے گئے ہیں انہی کے حلقۂ درس میں تعلیم پائی تھی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (صحابی) سے جو فقہ کا سلسلہ چلا تھا، اس کا مدار انہیں پر رہ گیا تھا، ان باتوں کے ساتھ زمانے نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا یعنی دولت مند اور فارغ البال تھے اور اس وجہ سے نہایت اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہتے تھے، ان وجوہ سے امام ابوحنیفہ نے علم فقہ پڑھنا چاہا تو استادی کے لیے انہی کو انتخاب کیا۔ اس وقت درس کا طریقہ یہ تھا کہ استاد کسی خاص مسئلہ پر زبانی گفتگو کرتا تھا جس کو شاگرد یاد کر لیتے اور کبھی لکھ بھی لیا کرتے تھے، امام ابوحنیفہؒ پہلے دن بائیں صف میں بیٹھے، کیونکہ مبتدیوں کے لیے یہ امتیاز عموماً قائم رکھا جاتا تھا لیکن چند روز کے بعد جب حماد کو تجربہ ہو گیا کہ تمام حلقہ میں ایک شخص بھی حافظ اور ذہانت میں ان کا ہمسر نہیں ہے تو حکم دے دیا کہ

ابوحنیفہ سب سے آگے بیٹھا کریں[1]

امام نے اگر چہ اسی زمانہ میں حدیث پڑھنی شروع کر دی تھی جس کا تفصیلی بیان آگے آتا ہے، تاہم حماد کے حلقۂ درس میں ہمیشہ حاضر ہوتے رہتے، خود ان کا بیان ہے کہ میں دو برس تک حماد کے حلقہ درس میں حاضر ہوتا رہا۔ پھر خیال ہوا کہ اب خود درس و تعلیم کا سلسلہ قائم کروں لیکن استاد کا ادب مانع ہوتا تھا، اتفاق سے انہی دنوں حماد کا ایک رشتہ دار جو بصرہ میں رہا کرتا تھا مر گیا، حماد کے سوا اور کوئی اس کا وارث نہ تھا۔ اس ضرورت سے ان کو بصرہ جانا پڑا چونکہ مجھ کو اپنا جانشین کر گئے تھے، تلامذہ اور ارباب حاجت نے میری طرف رجوع کیا، بہت سے ایسے مسئلے پیش آئے جن میں استاد سے میں نے کوئی روایت نہیں سنی تھی، اس لیے اپنے اجتہاد سے جواب دیے اور احتیاط کے لیے ایک یادداشت لکھتا گیا، دو مہینے کے بعد حماد بصرہ سے واپس آئے تو میں نے وہ یادداشت پیش کی۔ کل ساٹھ مسئلے تھے ان میں سے بیس میں سے غلطیاں نکالیں، باقی کی نسبت فرمایا کہ تمھارے جواب صحیح ہیں، میں نے عہد کیا کہ حماد جب تک زندہ ہیں ان کی شاگردگی کا تعلق کبھی نہ چھوڑوں گا۔

حماد نے ۱۲۰ھ میں انتقال کیا، امام ابوحنیفہ نے اگرچہ حماد کے سوا اور بزرگوں کی خدمت میں بھی فقہ کی تحصیل کی، لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اس فن خاص میں وہ حماد ہی کے تربیت یافتہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ حد سے زیادہ ان کی تعظیم کرتے تھے۔

حماد کے زمانہ میں ہی امام نے حدیث کی طرف توجہ کی، کیونکہ مسائل فقہ کی مجتہدانہ تحقیق جو امام کو مطلوب تھی حدیث کی تکمیل کے بغیر ممکن نہ تھی۔

اس وقت تمام ممالک اسلامیہ میں بڑے زور وشور سے حدیثوں کا درس جاری تھا اور ہر جگہ سند و روایت کے دفتر کھلے ہوئے تھے، صحابہ جن کی تعداد کم از کم دس ہزار ہے تمام ممالک میں پہنچ گئے تھے اور ان کی وجہ سے اسناد و روایت کا ایک عظیم الشان سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ لوگ جہاں کسی صحابی کا نام سن پاتے تھے کہ ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے تھے کہ چل کر رسول اللہ کے حالات سنیں یا مسائل شرعیہ کی تحقیق کریں۔ اس طرح تابعین کا جو صحابہ کے شاگرد کہلاتے تھے بیشمار گروہ پیدا ہو گیا تھا جن کے سلسلے تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گئے تھے جن شہروں میں صحابہ یا تابعین کا

[1] عقود الجمان باب سادس

زیادہ مجمع تھا وہ دارالعلم کے لقب سے ممتاز تھے، ان میں مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، یمن، بصرہ، کوفہ کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ کیونکہ اسلامی آثار کے لحاظ سے کوئی شہر ان مقامات کا ہمسر نہ تھا۔

کوفہ امام ابوحنیفہ کا مولد و مسکن تھا، اسلام کی وسعت و تمدن کا گویا دیباچہ تھا اہل عرب کی روز افزوں ترقی کے لیے عرب کی مختصر آبادی کافی نہ تھی، اسی ضرورت سے حضرت عمرؓ نے سعد بن ابی وقاص کو جو اس وقت حکومت کسریٰ کا خاتمہ کر کے مدائن میں اقامت گزین تھے ، لکھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک شہر بساؤ۔ جو ان کا دارالہجرت اور قرارگاہ ہو سعد نے کوفہ کی زمین پسند کی ۱۷ھ میں اسکی بنیاد کا پتھر رکھا گیا اور معمولی سادہ وضع کی عمارتیں تیار ہوئیں اسی وقت عرب کے قبائل ہر طرف سے آ آ کر آباد ہونا شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ تھوڑے دنوں میں وہ عرب کا ایک خطہ بن گیا۔ حضرت عمرؓ نے یمن کے بارہ ہزار اور نزار کے آٹھ ہزار آدمیوں کے لیے جو وہاں جا کر آباد ہوئے تھے روزینے مقرر کر دیے۔ چند روز میں جمعیت کے اعتبار سے کوفہ نے وہ حالت پیدا کی کہ جناب فاروقؓ کوفہ کو "رمح اللہ" کنز الایمان۔ جمجمۃ العرب، یعنی خدا کا علم، ایمان کا خزانہ، عرب کا سر فرمایا کرتے تھے اور خط لکھتے تو اس عنوان سے لکھتے تھے"۔ الی راس الاسلام، الی راس العرب" حضرت علی نے اس شہر کو دارالخلافہ قرار دیا صحابہ میں سے ایک ہزار پچاس شخص جن میں چوبیس وہ بزرگ تھے جو غزوہ بدر میں رسول اللہ کے ہمرکاب رہے تھے. وہاں گئے اور بہتوں نے سکونت اختیار کر لی۔

ان بزرگوں کی بدولت ہر جگہ حدیث و روایت کے چرچے پھیل گئے تھے اور کوفہ کا ایک ایک گھر حدیث و روایات کی درسگاہ بن گیا تھا[1]۔

بصرہ بھی اس مقدس خلیفہ کے حکم سے آباد ہوا تھا اور وسعت علم اور اشاعت حدیث کے اعتبار سے کوفہ کا ہمسر تھا۔ یہ دونوں شہر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی طرح علوم اسلامی کے دارالعلم خیال کیے جاتے تھے، علامہ ذہبی نے اسلام کے دوسرے تیسرے دور میں جن لوگوں کو حاملین حدیث کا لقب دیا ہے اور اس کے مستقل ترجمے لکھے ہیں، ان میں اکثر مثلاً مسروق بن الاجدع، عبیدہ بن عمر، اسود بن یزید، ابوعمر النخعی، ذر بن جیش، ربیع بن خیثم، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، ابوعبدالرحمٰن السلمی، شریح بن الحرث، شریح بن ہانی، ابووائل شقیق ابن سلمہ، قیس بن حازم، محمد بن

---

[1] یہ تمام تفصیل فتوح البلدان بلاذری ذکر آثار کوفہ و معجم البلدان و فتح المغیث صفحہ ۳۸۲ میں مذکور ہے

سیرین، حسن بصری شعبہ بن حجاج، قتادہ بن دعامہ انہیں دونوں شہروں کے رہنے والے یا خوش باش تھے [1]۔ سفیان بن عینیہ جو ائمہ حدیث شمار کیے جاتے ہیں اکثر فرماتے تھے کہ مناسک کے لیے مکہ قرآت کے لیے مدینہ اور حلال و حرام یعنی فقہ کے لیے کوفہ ہے۔ [2] فقہ میں امام نے زیادہ تر حماد کا حلقۂ درس کافی سمجھا تھا لیکن حدیث میں یہ قناعت ممکن نہ تھی، یہاں صرف ذہانت اور اجتہاد سے کام نہیں چل سکتا تھا، بلکہ روایت کے ساتھ روایت کی بھی ضرورت تھی، حدیثیں اس وقت نہایت پریشان اور غیر مرتب تھیں یہاں تک کہ بڑے بڑے اساتذہ دو چار سو حدیثوں سے زیادہ یاد نہیں رکھتے تھے، یہ تعداد ضروری مسائل کے لیے بھی کافی نہ تھی۔ اس کے علاوہ طرق روایت میں اس قدر اختلافات پیدا ہو گئے تھے کہ ایک حدیث جب تک متعدد طریقوں سے نہ معلوم ہو اس کے مفہوم و تعبیر کا ٹھیک ٹھیک متعین ہونا دشوار تھا۔ امام ابو حنیفہ کو حماد کی صحبت اور پختگی عمر نے ان ضرورتوں سے اچھی طرح واقف کر دیا تھا اس لیے نہایت سعی و اہتمام سے حدیثوں کے بہم پہنچانے پر توجہ کی۔ تقریباً کوفہ میں کوئی ایسا محدث باقی نہ تھا جس کے سامنے امام صاحب نے زانوئے شاگردی تہہ نہ کیا ہو اور حدیثیں نہ سیکھی ہوں، ابو المحاسن شافعی نے جہاں ان کے شیوخ حدیث کے نام گنائے ہیں۔ ترانوے شخصوں کی نسبت لکھا ہے کہ کوفہ کے رہنے والے یا نزیل تھے، تہذیب التہذیب و تہذیب الاسماء و تذکرۃ الحفاظ وغیرہ میں اگرچہ جیسا کہ ان کتابوں کا عام طریقہ ہے امام کے شیوخ کا استقصاء نہیں کیا ہے تاہم انہیں کتابوں کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک گروہ کثیر سے روایت کی جن میں انتیس شخص خاص کوفہ کے رہنے والے تھے اور ان میں اکثر تابعی تھے۔ شیوخ کوفہ میں خاص کر امام شعبی، سلمہ بن کہیل، محارب بن دثار، ابو اسحٰق سبیعی، عون بن عبداللہ، سماک بن حرب، عمرو بن مرہ، منصور بن المعتمر، اعمش، ابراہیم بن محمد، عدی بن ثابت الانصاری، عطا بن السائب موسیٰ بن ابی عائشہ، علقمہ بن مرثد، بہت بڑے محدث اور سند و روایت کے مرجع عام تھے، سفیان ثوری اور امام حنبلؒ وغیرہ کا سلسلہ سند اکثر انہی بزرگوں تک پہنچتا ہے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی

[2] معجم البلدان ذکر کوفہ

امام شعبی[1] وہی بزرگ ہیں جنہوں نے اوّل اوّل امام ابو حنیفہ کو تحصیل علم کی رغبت دلائی تھی۔ بہت سے صحابہ سے حدیثیں روایت کی تھیں۔ مشہور ہے کہ پانچ سو صحابہ کو دیکھا تھا عراق، عرب، شام میں چار شخص جو استادِ کاملِ تسلیم کیے جاتے تھے ان میں ایک یہ تھے امام زہری کہا کرتے تھے کہ عالم صرف چار ہیں۔ مدینہ میں ابن المسیب، بصرہ میں حسن شام میں مکحول کوفہ میں شعبی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان کو ایک بار مغازی کا درس دیتے دیکھا تو فرمایا کہ واللہ یہ شخص اس فن کو مجھ سے اچھا جانتا ہے" ایک مدت تک منصب قضا پر مامور رہے خلفاء اور اعیان دولت ان کا نہایت احترام کرتے تھے۔ ۱۰۴ھ یا ۱۰۶ھ میں وفات پائی۔

سلمہ بن کہیل مشہور محدث اور تابعی تھے، جندب بن عبداللہ، ابنؓ ابی ادنی ابوالطفیلؒ اور ان کے علاوہ اور بہت سے صحابہ سے حدیثیں روایت کیں۔ ابن سعد نے ان کو کثیر الحدیث لکھا ہے۔ سفیان بن عینیہ (امام شافعی کے استاد) فرماتے ہیں کہ سلمہ بن کہیل ایک رکن ہیں ارکان میں سے، ابن مہدی کا قول تھا کہ کوفہ میں چار شخص سب سے زیادہ صحیح الروایۃ تھے منصور، سلمہ، عمرو بن مرہ ابوحصین۔

ابو اسحٰق سبعی، کبار تابعین میں سے تھے، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، ابن زبیر نعمان بن بشیر، زید بن ارقم اور بہت سے صحابہ سے جن کے نام علامہ نووی نے تہذیب الاسماء میں بہ تفصیل لکھے ہیں حدیثیں سنی تھیں۔ عجلی نے کہا ہے کہ اٹھائیس صحابہ سے ان کو بالمشافہ روایت ہے، علی بن المدینی جو امام بخاری کے استاد تھے ان کا قول ہے کہ ابو اسحٰق کے شیوخ حدیث میں نے شمار کیے تو کم و بیش تین سو ٹھہرے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں ان کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔

سماک بن حرب، بہت بڑے تابعی اور محدث تھے، امام سفیان ثوری نے کہا کہ سماک نے کبھی حدیث میں غلطی نہیں کی خود سماک کا بیان ہے کہ میں اسی صحابہ سے ملا ہوں۔

محارب بن دثار نے عبداللہ بن عمر اور جابر وغیرہ سے روایت کی امام سفیان ثوری کہا کرتے تھے کہ میں نے کسی زاہد کو نہیں دیکھا جس کو محارب پر ترجیح دوں، علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ محارب عموماً حجۃ ہیں: امام احمد بن معین ابوزرعہ، دارقطنی، ابوحاتم، یعقوب ابن سفیان، نسائی نے

---

[1] امام کے شیوخ حدیث کا حال میں نے زیادہ تر تہذیب التہذیب و معارف ابن قتیبہ مراۃ الجنان یافعی سے لکھا ہے

ان کو ثقہ تسلیم کیا ہے۔کوفہ میں منصب قضا پر مامور تھے۔۱۲۱ھ میں وفات پائی۔

عون بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود نے حضرت ابو ہریرہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ سے حدیثیں روایت کیں۔نہایت ثقہ اور پرہیزگار تھے۔

ہشام بن عروہ معزز و مشہور تابعی تھے، بہت سے صحابہ سے حدیثیں روایت کیں بڑے بڑے ائمہ حدیث، مثلاً سفیان ثوری، امام مالک، سفیان ابن عینیہ ان کے شاگرد تھے ابو جعفر منصور کے زمانہ میں ان سے حدیثیں روایت کیں، خلیفہ منصور ان کا نہایت احترام کرتا تھا۔ایک بار لاکھ درہم ان کو عطا کیے، ان کے جنازہ کی نماز بھی خلیفہ منصور ہی نے پڑھائی تھی۔ابن سعد نے لکھا ہے کہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ابو حاتم نے ان کو امام حدیث کہا ہے۔

سلیمان بن مہران معروف بہ اعمش، کوفہ کے مشہور امام تھے، صحابہ میں سے انس بن مالک سے ملے تھے اور عبداللہ بن ابی ادنیٰ سے حدیث سنی تھی سفیان ثوری وشعبہ ان کے شاگرد ہیں امام کی تحصیل حدیث کا دوسرا مدرسہ بصرہ تھا جو امام حسن بصری، شعبہ وقتادہ کے فیض تعلیم سے مالا مال تھا۔تعجب ہے کہ حسن بصری باوجودیکہ ۱۱۲ھ تک زندہ رہے لیکن امام ابو حنیفہؒ کا ان کے درس سے مستفید ہونا ثابت نہیں ہوتا۔البتہ قتادہ کی شاگردی کا ذکر عام محدثین نے کیا ہے اور عقود الجمان کے مختلف مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نے شعبہ سے حدیث روایت کی اور انہوں نے اپنے سامنے ہی فتویٰ اور روایت کی اجازت بھی دے دی تھی۔

قتادہ بہت بڑے محدث اور مشہور تابعی تھی، حضرت انسؓ بن مالک وعبداللہ بن سرجس وابو الطفیلؓ اور دیگر صحابہ سے حدیثیں روایت کیں، حضرت انس کے دو شاگرد جو نہایت نامور ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہیں۔اس خصوصیت میں ان کو نہایت شہرت تھی کہ حدیث کو بعینہٖ ادا کرتے تھے یعنی الفاظ و معنی میں بالکل فرق نہیں ہوتا تھا۔ان کی قوت حافظہ کی ایک عجیب مثال لکھی ہے ،عمرو بن عبداللہ کا بیان ہے کہ یہ مدینے میں سعید بن المسیب سے فقہ و حدیث پڑھتے تھے، ایک دن انہوں نے فرمایا کہ تم ہر روز بہت سی باتیں پوچھتے ہو تم کو ان میں سے کچھ یاد بھی ہیں" انہوں نے کہا "ایک ایک حرف محفوظ ہے" چنانچہ جس قدر ان سے سنا تھا بقید تاریخ اور دن کے بیان کرنا شروع کیا۔وہ نہایت متعجب ہوئے اور کہا " خدا نے دنیا میں تم جیسے لوگ بھی پیداء کیے ہیں"۔اسی بناء پر لوگ ان کو احفظ الناس کہا کرتے تھے امام احمد بن حنبل نے ان کے فقہ وواقفیت اختلاف

وتفسیر دانی کی نہایت مدح کی ہے اور کہا ہے کہ کوئی شخص ان باتوں میں ان کے برابر ہو تو ہو مگر ان سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا''۔ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ان کا حال تفصیل سے لکھا ہے جس سے ان کی عظمت وشان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

شعبہ بھی بڑے رتبہ کے محدث تھے دو ہزار حدیثیں یاد تھیں، سفیان ثوری نے فن حدیث میں ان کو امیر المومنین مانا ہے، عراق میں یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے جرح وتعدیل کے مراتب مقرر کیے۔ امام شافعی فرمایا کرتے تھے کہ شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں حدیث کا رواج نہ ہوتا۔ ۱۶۰ھ میں انتقال کیا، سفیان ثوری کو ان کے مرنے کی خبر پہنچی تو کہا آج فن حدیث بھی مر گیا۔'' شعبہ کو امام ابو حنیفہ کے ساتھ ایک خاص ربط تھا۔ غیبت میں اکثر ان کی ذہانت اور خوبی فہم کی تعریف کرتے، ایک بار ان کا ذکر آیا تو کہا کہ ''جس طرح میں جانتا ہوں کہ آفتاب روشن ہے اسی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علم اور ابو حنیفہؒ ہم نشیں ہیں''۔ یحییٰ بن معین سے جو امام بخاری کے استاد تھے کسی نے پوچھا کہ آپ ابو حنیفہ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں۔ فرمایا اس قدر کافی ہے کہ شعبہ نے ان کو حدیث وروایت کی اجازت دی اور شعبہ آخر شعبہ [1] ہی ہیں۔'' بصرہ کے اور شیوخ جن سے امام ابو حنیفہؒ نے حدیثیں روایت کیں ان میں عبد الکریم بن امیہ اور عاصم بن سلیمان الاحول زیادہ ممتاز ہیں۔

امام ابو حنیفہ کو اگرچہ ان درسگاہوں سے حدیث کا بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا تاہم تکمیل کی سند حاصل کرنے کے لیے حرمین جانا ضروری تھا جو علوم مذہبی کے اصلی مرکز تھے تاریخوں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ امام کا پہلا سفر کس سنہ میں واقع ہوا۔ تاہم ظن غالب ہے کہ جب انہوں نے حرمین کا سفر کیا تو تحصیل کا آغاز تھا، مؤرخ ابن خلکان نے لکھا ہے۔ [2] کہ وکیع نے خود امام ابو حنیفہ سے روایت کی ہے کہ حج میں ایک حجام نے جس سے میں نے بال منڈوائے تھے کئی باتوں پر مجھ پر گرفت کی، میں نے اُجرت پوچھی تو بولا مناسک چکائے نہیں جاتے میں جھپ ہو کر اصلاح بنوانے لگا اس نے پھر ٹوکا کہ ''حج میں چپکا نہیں رہنا چاہئے تکبیر کہے جاؤ''۔ حجامت سے فارغ ہو کر چلا تو اس نے کہا کہ پہلے دو رکعت نماز پڑھ لو، پھر کہیں جانا''۔ میں نے متعجب ہو کر پوچھا یہ

---

[1] عقود الجمان باب دہم

[2] تاریخ ابن خلکان ترجمہ عطا بن ابی رباح

مسائل تو نے کہاں سے سیکھے، بولا عطا بن ابی رباح کا فیض ہے۔'' اس واقعہ سے زیادہ تر یہی قیاس ہوسکتا ہے کہ ابتدائی زمانہ تھا۔

جس زمانہ میں امام ابو حنیفہ مکہ معظمہ پہنچے، درس و تدریس کا نہایت زور تھا۔ متعدد اساتذہ کی جو فنِ حدیث میں کمال رکھتے تھے اور اکثر صحابہ کی خدمت سے مستفید ہوئے تھے الگ الگ درسگاہ قائم تھی۔ ان میں عطاؒ بن ابی رباح کا حلقہ درس سب سے زیادہ وسیع اور مستند تھا، عطاء مشہور تابعی تھے، اکثر صحابہ کی خدمت میں رہے تھے اور ان کے فیض صحبت سے اجتہاد کا رتبہ حاصل کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس، ابن عمر، ابن زبیر اسامہ بن زید، جابر ابن عبداللہ، زید بن ارقم، عبداللہ بن سائب عقیلؓ، رافعؓ، ابو درداءؓ، ابو ہریرہ اور بہت سے صحابہ سے حدیثیں سنی تھیں، خود ان کا بیان ہے کہ میں دو سو بزرگوں سے ملا ہوں جن کو رسولؐ اللہ کی صحبت کا شرف حاصل تھا''۔ مجتہدین صحابہ ان کے علم و فضل کے معترف تھے، عبداللہ بن عمرؓ جو حضرت فاروق کے فرزند رشید اور صاحب افتاء تھے۔ اکثر فرماتے تھے کہ عطا بن ابی رباح کے ہوتے ہوئے لوگ میرے پاس کیوں آتے ہیں''۔ حج کے زمانہ میں ہمیشہ سلطنت کی طرف سے ایک منادی مقرر ہوتا تھا کہ عطاء کے سوا کوئی شخص فتوی دینے کا مجاز نہیں ہے۔ [1] بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً امام اوزاعی زہری، عمرو بن دینار انہیں کے حلقہ درس میں سے نکل کر استاد کہلائے۔

امام ابو حنیفہ استفادہ کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے احتیاط سے عقیدہ پوچھا تو امام نے کہا میں اسلاف کو برا نہیں کہتا۔ گنہگار کو کافر نہیں سمجھتا، قضاء و قدر کا قائل ہوں''۔ عطاء نے اجازت دی کہ حلقہ درس میں شریک ہوا کریں [2] روز بروز ان کی ذہانت وطباعی کے جوہر ظاہر ہوتے گئے اور ان کے ساتھ استاد کی نظر میں ان کا وقار بھی بڑھتا گیا، یہاں تک کہ جب یہ حلقہ درس میں جاتے تو عطاء اوروں کو ہٹا کر ان کو اپنے پہلو میں جگہ دیتے۔ [3]

عطاء ۱۱۵ھ تک زندہ رہے اس مدت میں جب امام ابو حنیفہ کو مکہ معظمہ جانے کا اتفاق ہوتا تو ان کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے اور مستفید ہوتے۔

---

[1] ابن خلکان اور کتب رجال میں ان کے حالات پڑھو

[2] مختصر تاریخ بغداد لابن جزلہ۔

[3] عقود الجمان باب عاشر

عطاء کے سوا مکہ معظمہ کے اور محدثین جن سے امام نے حدیث کی سند لی ان میں عکرمہ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ عکرمہ حضرت عبداللہؓ بن عباس کے غلام اور شاگرد تھے، انہوں نے نہایت توجہ اور کوشش سے ان کی تعلیم و تربیت کی تھی، یہاں تک کہ اپنی زندگی ہی میں اجتہاد و فتوے کا مجاز کر دیا تھا، عکرمہ نے اور بہت سے صحابہ مثلاً حضرت علیؓ، ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عقبہ بن عمرؓ، صفوانؓ، جابرؓ، ابو قتادہؓ سے حدیثیں سیکھی تھیں اور فقہی مسائل تحقیق کیے تھے، کم و بیش ستر مشہور تابعین حدیث و تفسیر میں ان کے شاگرد ہیں، امام شعبی کہا کرتے تھے کہ قرآن کا جاننے والا عکرمہ سے بڑھ کر نہیں رہا۔ سعید بن جبیر کہ تابعین کے سردار تھے ان سے ایک شخص نے پوچھا کہ دنیا میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی عالم ہے؟ فرمایا ہاں عکرمہ۔

اسی زمانہ میں یعنی ۱۰۲ھ سے پہلے امام ابو حنیفہؒ نے مدینہ کا قصد کیا کہ حدیث کا مخزن اور نبوت کا آخری قرار گاہ تھا۔ صحابہ کے بعد تابعین کے گروہ میں سے سات شخص علم فقہ و حدیث کے مرجع بن گئے تھے اور مسائل شرعیہ میں عموماً ان کی طرف رجوع کیا جاتا تھا، ان لوگوں نے بڑے بڑے صحابہ کے دامن فیض میں تعلیم پائی تھی اور یہ مرتبہ حاصل کیا تھا کہ تمام ممالک اسلامی میں واسطہ در واسطہ ان کے درس کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ لوگ ہمعصر تھے اور ایک مشترکہ مجلس افتاء کے ذریعہ سے تمام شرعی مسائل کا فیصلہ کرتے تھے۔ اہل مدینہ کی فقہ جس کی تدوین امام مالک نے کی اس کی بنیاد زیادہ تر انہی کے فتووں پر ہے۔

امام ابو حنیفہؒ جب مدینہ پہنچے تو ان بزرگوں میں سے صرف دو شخص زندہ تھے سلیمان و سالم بن عبداللہ، سلیمان حضرت میمونہؓ کے جو رسول اللہؐ کی ازواج مطہرات میں سے تھیں، غلام تھے اور فقہائے سبعہ میں فضل و کمال کے لحاظ سے ان کا دوسرا نمبر تھا، سالم حضرت فاروقؓ کے پوتے تھے اور اپنے والد بزرگوار سے تعلیم پائی تھی، امام ابو حنیفہ دونوں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے حدیثیں روایت کیں۔

امام ابو حنیفہ کی طالب العلمی کی مسافت اگرچہ مدینہ تک محدود ہے تاہم تعلیم کا سلسلہ اخیر زندگی تک قائم رہا، اکثر حرمین جاتے اور مہینوں قیام کرتے، حج کی تقریب میں ممالک اسلامی کے ہر گوشے سے بڑے بڑے اہل کمال مکہ آکر جمع ہو جاتے تھے جن کا مقصد حج کے

فتح المغیث صفحہ ۳۹۹

ساتھ افادہ واستفادہ بھی ہوتا تھا۔امام صاحب اکثر ان لوگوں سے ملتے اور مستفید ہوتے۔

امام اوزاعی اور مکحول شامی جو کہ شام کے امام المذہب کہلاتے تھے، امام ابوحنیفہؒ نے مکہ ہی میں ان لوگوں سے تعارف حاصل کیا اور حدیث کی سند لی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ امام صاحب کی ذہانت اور اجتہاد کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی، یہاں تک کہ ظاہر بینوں نے ان کو قیاسی مشہور کر دیا تھا، انہی دنوں میں عبداللہ بن مبارک نے جو امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگرد ہیں، بیروت کا سفر کیا کہ امام اوزاعی سے فن حدیث کی تکمیل کریں، پہلی ہی ملاقات میں اوزاعی نے ان سے پوچھا کہ کوفہ میں ابوحنیفہ کون شخص پیدا ہوا ہے جو دین میں نئی باتیں نکالتا ہے"۔انہوں نے کچھ جواب نہ دیا اور گھر چلے آئے۔ دو تین دن کے بعد پھر گئے تو کچھ اجزاء ساتھ لیتے گئے اوزاعی نے ان کے ہاتھ سے وہ اجزاء لے لیے۔سرنامہ پر لکھا تھا۔"قال نعمان بن ثابت" دیر تک غور سے دیکھا کیے، پھر عبداللہ سے پوچھا نعمان کون بزرگ ہیں؟ انہوں نے کہا "عراق کے ایک شخص ہیں۔جن کی صحبت میں رہا ہوں" فرمایا بڑے پایا کا شخص ہے۔عبداللہ نے عرض کیا یہ وہی ابوحنیفہ ہیں جن کو آپ مبتدع بتاتے تھے [1] اوزاعی کو اپنی غلطی پر افسوس ہوا حج کی تقریب سے جب اوزاعی مکہ گئے تو امام ابوحنیفہؒ سے ملاقات ہوئی اور انہیں مسائل کا ذکر آیا، اتفاق سے عبداللہ بن المبارک بھی موجود تھے ان کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اس خوبی سے تقریر کی کہ اوزاعی حیران رہ گئے امام ابوحنیفہ کے جانے کے بعد مجھ سے کہا کہ اس شخص کے کمال نے اس کو لوگوں کا محسود بنا دیا تھا، بے شبہ میری بدگمانی غلط تھی جس کا میں افسوس کرتا ہوں۔

تاریخوں سے ثابت ہے کہ امام ابوحنیفہ نے فنِ حدیث میں امام اوزاعی کی شاگردی کی ہے غالباً یہی زمانہ ہوگا۔

حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا، امام ابوحنیفہ دوسری بار مدینہ گئے تو امام موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے ایک ساتھی نے تعارف کرایا کہ یہی امام ابوحنیفہ ہیں انہوں نے ابوحنیفہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ہاں تم ہی قیاس کی بناء پر ہمارے دادا کی حدیثوں سے مخالفت کرتے ہو"۔انہوں نے نہایت ادب سے کہا۔"معاذ اللہ حدیث کی کون مخالفت کرسکتا ہے، آپ تشریف رکھیں تو کچھ عرض کروں"۔ پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

---

[1] مختصر تاریخ بغداد

ابوحنیفہؒ:۔

مرد ضعیف ہے یا عورت؟

امام باقرؑ:۔

عورت

ابوحنیفہؒ:۔

وراثت میں مرد کا حصہ زیادہ ہے یا عورت کا؟

امام باقرؑ:۔

مرد کا،

ابوحنیفہؒ:۔

میں قیاس لگاتا تو کہتا کہ عورت کو زیادہ حصہ دیا جائے کیونکہ ضعیف کو ظاہر قیاس کی بناء پر زیادہ حصہ ملنا چاہیے، پھر پوچھا نماز افضل ہے یا روزہ؟

امام باقرؒ:۔

نماز

ابوحنیفہؒ:۔

اس اعتبار سے حائضہ عورت پر نماز کی قضا واجب ہونی چاہیے نہ کہ روزہ کی حالانکہ میں روزہ ہی کی قضاء کا فتویٰ دیتا ہوں، امام باقرؒ، اس قدر خوش ہوئے کہ اٹھ کر پیشانی چوم لی۔

ابوحنیفہ ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر رہے اور فقہ و حدیث کے متعلق بہت سی نادر باتیں حاصل کیں۔ شعیہ وسنی دونوں مانا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی معلومات کا بڑا ذخیرہ حضرت ممدوح کا فیض صحبت تھا۔ امام صاحب نے ان کے فرزند رشید حضرت جعفر صادقؒ کے فیض صحبت سے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا جس کا ذکر عموماً تاریخوں میں پایا

جاتا ہے ابن تیمیہ نے اس سے انکار کیا ہے اور اس کی وجہ یہ خیال کی ہے امام ابوحنیفہؒ، حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ، کے معاصر اور ہمسر تھے اس لیے ان کی شاگردی کیونکر اختیار کرتے۔ لیکن یہ ابن تیمیہ کی گستاخی اور خیرہ چشمی ہے۔ امام ابوحنیفہ لاکھ مجتہد اور فقیہ ہوں لیکن فضل و کمال میں ان کو حضرت جعفر صادق سے کیا نسبت؟ حدیث وفقہ بلکہ تمام مذہبی علوم اہلبیت کے گھر سے نکلے **وصاحب البیت ادریٰ بما فیھا۔**

یا تو وہ زمانہ تھا کہ امام ابوحنیفہ نے ایک طالب علم کی حیثیت سے حرمین کا سفر کیا تھا، یا اب یہ نوبت پہنچی کہ سفر کا قصد کرتے تو تمام اطراف میں شہرہ ہو جاتا کہ فقیہ عراق عرب کو جارہا ہے، جس شہر یا گاؤں میں گزر ہوتا تو ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہو جاتا۔ ایک دفعہ مکہ معظمہ گئے تو لوگوں کی یہ کثرت ہوئی کہ مجلس میں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی ارباب حدیث وفقہ دونوں فرقہ کے لوگ تھے اور شوق کا یہ عالم تھا کہ ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔ آخر امام صاحب نے تنگ آ کر کہا ”کاش ہمارے میزبان سے کوئی جا کر کہتا کہ اس ہجوم کا انتظام کریں۔ ابوعاصم نبیل حاضر تھے، عرض کی کہ میں جاتا ہوں لیکن چند مسئلے دریافت کرنے رہ گئے ہیں، امام نے پاس بلایا اور زیادہ توجہ کے ساتھ ان کی باتیں سنیں اس میں میزبان کا خیال جاتا رہا۔ ابوعاصم سے فارغ ہو کر ایک اور طالب علم کی طرف متوجہ ہوئے اور پھر وہی سلسلہ قائم ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد خیال آیا تو فرمایا کسی شخص نے میزبان کے پاس جانے کا اقرار کیا تھا۔ وہ کہاں گیا؟ ابوعاصم بولے میں نے عرض کیا تھا فرمایا پھر تم گئے نہیں؟ ابوعاصم نے مناظرانہ شوخی سے کہا، میں نے تو یہ نہیں کہا تھا، کہ ابھی جاتا ہوں۔ جب فرصت ہوگی جاؤں گا“ امام نے فرمایا کہ عام بول چال میں ان احتمالات کا موقع نہیں، ان لفظوں کے معنی وہی لیے جائیں گے جو عوام کی غرض ہوتی ہے [1]۔“ ایک اعتبار سے یہ بھی ایک فقہی مسئلہ تھا جس کو امام صاحب نے باتوں باتوں میں حل کر دیا۔

امام صاحب کے اساتذہ ان کا اس قدر ادب واحترام کرتے تھے کہ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا محمد بن فضل کا بیان ہے کہ ایک دفعہ امام حنیفہ ایک حدیث کی تحقیق کے لیے خصیب کے پاس گئے، میں بھی ساتھ تھا، خصیب نے ان کو آتے دیکھا تو اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت تعظیم کے ساتھ لا کر اپنے برابر بٹھایا۔ امام صاحب نے پوچھا بیضہ نعام کے بارے میں کیا حدیث آئی

[1] الجواہر المضیہ باب الکنی ترجمہ ابوعاصم النبیل۔

ہے" نضیب نے کہا اَخبَرَنِی اَبُو عُبَیدَہ عَن عَبدِ اللّٰہِ ابنِ مَسعُودٍ فِی بَیضَہِ النَّعَامِ یُصِیبُھَا المُحرِمُ اَنَّ فِیہِ قِیمَتَہُ۔" عمرو ابن دینار جو مکہ کے مشہور محدث تھے ابوحنیفہ کی موجودگی میں حلقۂ درس میں اور کسی سے خطاب نہیں کرتے تھے۔

اس عظمت کے ساتھ امام صاحب کو طلب علم میں کسی سے عار نہ تھی امام مالک عمر میں ان سے تیرہ برس کم تھے، ان کے حلقۂ درس میں بھی اکثر حاضر ہوئے اور حدیثیں سنیں، علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ امام مالک کے سامنے ابوحنیفہ اس طرح مؤدب بیٹھتے تھے جس طرح شاگرد استاد کے سامنے بیٹھتا ہے۔ اس کو بعض کوتاہ بینوں نے امام کی کسر شان پر محمول کیا ہے لیکن ہم اس کو علم کی قدر شناسی اور شرافت کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں، امام مالک بھی ان کا نہایت احترام کرتے تھے، عبداللہ بن المبارک کی زبانی منقول ہے کہ میں امام مالک کی خدمت میں حاضر تھا، ایک بزرگ آئے جن کی انہوں نے تعظیم کی اور اپنے برابر بٹھایا۔ ان کے جانے کے بعد فرمایا جانتے ہو یہ کون شخص تھا" یہ ابوحنیفہ عراقی تھے، جو اس ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہیں۔ تو کر سکتے ہیں" ۔ ذرا دیر کے بعد ایک بزرگ آئے، امام مالک نے ان کی بھی تعظیم کی نہ اس قدر جتنی ابوحنیفہ کی کی تھی۔ وہ اٹھ گئے تو لوگوں سے کہا کہ یہ سفیان ثوری تھے۔

حجاز و عراق کے ائمہ فن روایت کے متعلق جدا جدا اصول رکھتے تھے طرز تعلیم بھی مختلف تھا، بعضوں کے نزدیک لکھنے کا زیادہ اعتبار تھا، بعض مثلاً ابراہیم و شعبی صرف حافظہ کو سند سمجھتے تھے اور اکثر لوگوں میں اس بات کو جائز رکھا تھا کہ مطلب میں فرق نہ آئے تو روایت میں حدیث کا ٹکڑا چھوڑ دیا جا سکتا ہے، بعض اس کے بالکل خلاف تھے، ایک فریق کہتا تھا کہ راوی جب تک سامنے نہ ہو اس سے روایت نہیں کی جا سکتی، شعبہ جو امام صاحب کے استاد تھے ان کا یہی مذہب تھا۔ دوسرا گروہ پردہ کی اوٹ سے تحریر کی بناء پر روایت کرنے کو جائز سمجھتا تھا، امام زہری کی عادت تھی کہ روایت کے ساتھ الفاظ و مطالب کی تفسیر بھی کرتے جاتے تھے لیکن بعض لوگ اس کے سخت مخالف تھے، یہاں تک کہ ایک شخص نے خود زہری کو ٹوکا کہ "حدیث نبویؐ میں آپ اپنے الفاظ نہ ملائیں امام مالک کو یہ طریقہ زیادہ پسند تھا کہ شاگرد پڑھیں اور وہ سنتے جائیں۔ بعض اس کے مخالف تھے۔ یحییٰ بن سلام اتنی بات پر کہ ان کے حلقۂ درس سے ناراض ہو کر اٹھ آئے کہ خود نہیں

---

[1] عقود الجمان باب عاشر۔

پڑھتے شاگردوں سے پڑھواتے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے اختلافات تھے جن کو فتح المغیث میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ کی کثرت شیوخ اور ریزہ چینیوں کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ ان مختلف اصول سے آگاہ ہوں تا کہ سب کے مقابلے سے خود ایک مستقل اور جچی ہوئی رائے قائم کرسکیں۔ امام موصوف نے اُصول فن میں جو اصلاحتیں کیں ان کا بیان آگے آئے گا۔

امام کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کے آغازِ تحصیل ہی میں حدیث کی تعلیم کا طریقہ مرتب اور باقاعدہ ہو چلا تھا، اس سے پہلے عموماً زبانی روایت کا رواج تھا۔ بعض ائمہ حدیث کتابت کو تقریباً ناجائز سمجھتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تقریباً ۱۰۱ھ میں اہل مدینہ کو خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے **انظر وابما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبوہ فانی خشیت دروس العلم و ذھاب العلماء**۔ یعنی رسولؐ اللہ کی جس قدر حدیثیں ہیں قلم بند کر لی جائیں ورنہ ضائع ہونے کا ڈر ہے اور شہروں میں بھی اسی مضمون کے فرامین بھیجے چنانچہ مدینہ میں امام زہری نے ایک مجموعہ مرتب کیا جس کی نقلیں سلطنت کی طرف سے تمام ممالک اسلامی میں شائع کی گئیں [1] اس وقت سے تدوین کا عام رواج ہوگیا اور جہاں جہاں اہل حدیث تھے اسی طریقہ کو برتنے لگے۔ شعبی (امام ابوحنیفہؒ کے استاد) کو اگرچہ زبانی روایت پر اصرار تھا تاہم کتاب ساتھ رکھتے تھے۔

طرزِ تعلیم نے بھی نہایت ترقی کی۔ شیخ مجمع عام میں ایک بلند مقام پر بیٹھتا، اور حدیث کا مجموعہ ہاتھ میں ہوتا۔ شاگرد قلم دوات لے کر بیٹھتے اور استاد جو کچھ روایت کرتا اسی کے الفاظ میں لکھتے جاتے۔ شائقین کی زیادہ کثرت ہوئی تو ایک مستملی کھڑا ہوا کر وہ الفاظ دور کے بیٹھنے والوں تک پہنچاتا مگر یہ التزام تھا کہ مطلب بلکہ جہاں تک ممکن ہوا الفاظ میں فرق نہ آئے اس ضرورت سے مستملی ہمیشہ ایسا شخص مقرر ہوتا جس کا حافظہ قوی اور معلومات وسیع ہوں اور ساتھ ہی خوش لہجہ اور بلند آواز ہو۔ چنانچہ امام شعبہ کی مجلس درس میں آدم بن ابی ایاس اور امام مالک کے حلقہ میں ابن علیہ اس خدمت پر مامور تھے۔

امام ابوحنیفہ اس خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں کہ ان کے شیوخ حدیث بے شمار تھے، ابو حفص کبیر نے دعویٰ کیا ہے کہ امام نے کم از کم چار ہزار شخصوں سے حدیثیں روایت کی

---

[1] فتح المغیث صفحہ ۲۳۹ و مقدمہ قسطلانی شرح بخاری مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۱۳۶

ہیں۔ اگرچہ تاریخ اسلام میں یہ کوئی عجیب بات نہیں مسلمانوں نے حدیثوں کے جمع کرنے میں جو محنتیں اور جانفشانیاں کی ہیں دنیا کی اور قومیں اس کا اندازہ بھی نہیں کرسکتیں۔ ہم متعدد شخصوں کے نام بتا سکتے جن کے شیوخ حدیث چار ہزار سے کم نہ تھے اور ایسے تو بہت گزرے ہیں جن کے اساتذہ ہزار سے تھے۔ علامہ سخاوی نے فتح المغیث میں ان لوگوں کے نام بھی گنائے ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ ابوحنیفہ کی نسبت یہ دعویٰ محدثانہ اصول پر پر ثابت نہیں ہوسکتا۔ البتہ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ امام نے ایک گروہ کثیر سے روایت کی ہے اور اس کا خود محدثین کو اعتراف ہے، علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں جہاں ان کے شیوخ حدیث کے نام گنائے ہیں۔ اخیر میں لکھ دیا ہے "خلق کثیر" حافظ ابوالمحاسن شافعی نے عقود الجمان میں تین سو انیس شخصوں کے نام بقید نسب لکھے ہیں اور اخیر میں لکھا ہے کہ میں نے ایک دوسری کتاب میں جس کا نام تحصیل السبیل الیٰ معرفت الثقات والمجاہیل ہے ان لوگوں کے حالات بھی تفصیل سے لکھے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی فہرست زیادہ تر فقہائے حنفیہ سے ماخوذ ہے ممکن ہے کہ محدثین کو کلیۃً اس سے اتفاق نہ ہو۔

افسوس ہے کہ محدثین نے امام کے حالات میں جو کتابیں لکھی ہیں اور جن میں ان کے شیوخ کا پورا پورا استقصا کیا ہے ہماری نظر سے نہیں گزریں فنِ رجال کی مستند کتابیں جن میں امام کا ذکر ہے ہمارے سامنے ہیں لیکن ان میں سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کے حالات ہیں اس وجہ سے کسی خاص شخص کے متعلق پوری تفصیل نہیں مل سکتی۔ مختصر تاریخ بغداد تہذیب الکمال، تہذیب الاسماء واللغات، تذکرۃ الحفاظ، ملخص طبقات الحفاظ، تہذیب التہذیب، انساب سمعانی، موطا امام محمد، کتاب الآثار، امام محمد کے تتبع [1] سے جس قدر ان کے شیوخ انتخاب ہوسکتے ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں، ان میں سے اکثر کے اجمالی حالات ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔

عطاء بن ابی رباح مکی، عاصم ابن ابی النجود کوفی، علقمہ بن مرثد کوفی، حکم بن عتبہ کوفی سلمہ بن کہیل کوفی، حضرت امام باقرؓ مدنی علی بن الاقمر الکوفی، زیاد بن علاقہ کوفی، سعید بن مسروق کوفی، عدی بن ثابت انصاری کوفی، عطیہ بن سعید کوفی، ابوسفیان سعدی، عبدالکریم بن امیہ بصری، یحییٰ بن سعید مدنی ہشام بن عروہ مدنی (از تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر عسقلانی)۔

---

[1] ان کتابوں میں تہذیب الکمال میری نظر سے گذری مولوی عبدالحیٔ صاحب مرحوم نے التعلیق المجد میں امام ابوحنیفہ کے شیوخ تہذیب الکمال کے حوالے سے لکھے ہیں میں نے اسی کے حوالہ سے لکھا ہے۔

ابو اسحٰق السبیعی کوفی، نافع بن عمر مدنی، عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج مدنی، قتادہ بصری عمرو بن دینار مکی، محارب بن دثار کوفی، ہشیم بن حبیب الصراف کوفی، قیس بن مسلم کوفی، محمد بن المنکدر المدنی، یزید الفقیر کوفی، سماک بن حرب کوفی، عبدالعزیز بن رفیع مکی، مکحول شامی، عمرو بن مرۃ الکوفی، ابوالزبیر محمد بن مسلم مکی، عبدالملک بن عمر کوفی، منصور بن زادان، منصور المعتمر، عطاء بن السائب الثقفی، عطاء بن ابی مسلم الخراسانی، عاصم بن سلیمان الاحول بصری، اعمش کوفی، عبداللہ بن عمر بن حفص المدنی، امام اوزاعی (طبقات الحفاظ ذہبی از مقامات مختلفہ)

ابراہیم بن محمد کوفی، اسماعیل بن عبدالملک مکی، حارث بن عبدالرحمٰن مکی، خالد بن علقمہ، لوداعی، ربیعۃ الرائے، شداد بن عبدالرحمٰن بصری۔ شیبان بن عبدالرحمٰن بصری طاؤس بن کیسان یمنی، عبداللہ بن دینار المدنی، عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ مکی عون بن عبداللہ کوفی، قابوس بن ابی ظبیان کوفی، محمد بن السائب الکلبی کوفی محمد بن مسلم بن شہاب الزہری ابو سعید مولیٰ ابن عباسؓ (تہذیب الکمال)

موسیٰ بن ابی عائشہ کوفی، صلت بن بہرام۔ عثمان بن عبداللہ بن حوشب بلال ہشیم بن ابی الہشیم، حصین بن عبدالرحمٰن، معن، میمون بن سیاہ حواب التیمی سالم الافطس، یحیٰ بن عمرو بن سلمہ، عمرو بن جبیر، عبیداللہ بن عمر، محمد بن مالک ہمدانی، ابوالسوار، خارجہ ابن عبداللہ، عبداللہ بن ابی زیاد، کثیر الاصم، حمید الاعرج، ابوالعطوف، عبداللہ بن الحسن سلیمان الشیبانی، سعید المروبان عثمان بن عبداللہ، ابوحجیہ (کتاب الاثار امام محمد)

ہم نے اس قدر نام سرسری طور سے انتخاب کیے ہیں، زیادہ چھان بین کرتے تو شاید عقود الجمان کی فہرست کے برابر اترتے، لیکن سچ یہ ہے کہ ابوحنیفہ کے لیے کثرت شیوخ اس قدر فخر کا باعث نہیں جتنا کہ ان کی احتیاط اور تحقیق ہے وہ اس نکتہ سے خوب واقف تھے کہ روایت میں جس قدر رواسطے زیادہ ہوتے ہیں اسی قدر تغیر وتبدل کا احتمال بڑھتا جاتا ہے، یہی بات ہے کہ ان کے اساتذہ اکثر تابعین ہیں جن کو رسول اللہ (صلعم) تک صرف ایک واسطہ ہے یا وہ لوگ ہیں جو مدت تک بڑے بڑے تابعین کی صحبت میں رہے تھے اور علم وفضل دیانت وپرہیز گاری کے نمونے خیال کیے جاتے تھے، ان دو قسموں کے سوا اگر ہیں تو شاذ ہیں، ان کی تعلیم کا طریقہ بھی عام طالب علموں سے الگ تھا بحث واجتہاد کی شروع سے عادت تھی اور اس بات میں وہ استادوں کی مخالفت

کی کچھ بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ایک دفعہ حماد کے ساتھ امام اعمش کی مشایعت کو نکلے۔ چلتے چلتے مغرب کا وقت آ گیا۔وضو کے لیے پانی کی تلاش ہوئی مگر کہیں نہ مل سکا،حماد نے تیمم کا فتویٰ دیا، امام نے مخالفت کی کہ اخیر وقت تک پانی کا انتظار کرنا چاہیے اتفاق یہ کہ کچھ دور چل کر پانی مل گیا اور سب نے وضو سے نماز ادا کی، کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ استاد سے مخالفت کی اور یہ نا بالغ زمانہ تحصیل کا آغاز تھا۔

امام شعبی ان کے استاد قائل تھے کہ معصیت مین کفارہ نہیں،ایک دفعہ استاد و شاگرد میں سوار جارہے تھے،اس مسئلہ کا ذکر آیا،انہوں نے کہا ''ضرور معصیت میں کفارہ ہے کیونکہ خدا نے ظہار میں کفارہ مقررہ کیا ہے اور اس آیت ''وَاِنَّہُم لَیَقُولُونَ مُنکَراً مِنَ القَولِ وَزُوراً''. میں تصریح کر دی ہے کہ ظہار معصیت ہے'' امام شعبی کچھ جواب نہ دے سکے اور خفا ہو کر فرمایا اَنْتَ قَیَّاسٌ۔[1]

عطاء بن ابی رباح سے کسی نے اس آیت کے معنی پوچھے ''وَاٰتَینٰہُ اَھلَہٗ وَمِثلَھُم مَعَھُم'' عطاء نے کہا۔''خدا نے حضرت ایوب کی آل و اولاد جو مر گئی تھی زندہ کر دی اور ان کے ساتھ اور نئی پیدا کر دی، امام ابوحنیفہ نے کہا جو شخص کسی صلب سے نہ پیدا ہو وہ اس کی اولاد کیونکر ہو سکتا ہے [2]۔

امام کی علمی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ان کو بڑے بڑے اہل کمال کی صحبتیں میسر آئیں، جن شہروں میں ان کو رہنے کا اتفاق ہوا یعنی کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یہ وہ مقامات تھے مذہبی روایات وہاں کی ہوا میں سرایت کر گئی تھیں، علماء سے ملنے اور علمی جلسوں میں شریک ہونے کا شوق امام کے خمیر میں داخل تھا ساتھ ہی ان کے ان کی شہرت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ جہاں جاتے استفادہ، ملاقات، مناظرہ کی غرض سے خود ان کے پاس ہزاروں آدمیوں کا مجمع رہتا تھا۔

درس و افتاء و بقیہ زندگی

اگرچہ حماد کی زندگی میں امام صاحب نے اجتہاد کا درجہ حاصل کر لیا تھا عمر بھی کچھ کم نہ تھی

---

[1] عقود الجمان باب ثامن

[2] مختصر تاریخ بغداد ترجمہ امام ابوحنیفہ

یعنی حماد کی وفات کے وقت کم وبیش ۴۰ برس کا سن تھا تاہم شاگردانہ خلوص نے یہ گوارانہ کیا کہ استاد کے ہوتے اپنا دربار الگ جمائیں اگلے زمانہ میں استاد کے ساتھ جو محبت اورادب آمیز تعلق ہوتا تھا آج اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے خود امام صاحب سے منقول ہے کہ حماد جب تک زندہ رہے میں نے ان کے مکان کی طرف کبھی پاؤں نہیں پھیلائے حماد نے ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔ چونکہ ابراہیم نخعی کے بعد فقہ کا دارومدار انہی پر رہ گیا تھا، ان کی موت نے کوفہ کو تیرہ وتار کر دیا۔ حماد نے ایک لائق بیٹا چھوڑ دیا تھا لوگوں نے انہیں کو مسند درس پر بٹھادیا لیکن وہ لغت وادب کی طرف زیادہ مائل تھے۔ آخر موسیٰ بن کثیر نے کہ حماد کے شاگردوں میں تجربہ کار اور سن کے لحاظ سے سب سے ممتاز تھے ان کی جگہ لی، وہ اگر چہ فقہ کے پورماہر نہ تھے لیکن اکثر بزرگوں کی صحبتیں اٹھائی تھیں اوراس وجہ سے لوگوں پران کا ایک خاص اثر تھا۔ چندروز تک حلقۂ درس ان کی وجہ سے قائم رہا۔ وہ حج کو چلے گئے تو تمام بزرگوں نے متفقاً امام ابو حنیفہ سے درخواست کی کہ مسند درس کو مشرف فرمائیں۔

مختلف حالتوں کا اقتضا دیکھو! یا تو وہ زمانہ تھا کہ جوانی ہی میں استادی کی مسند پر بیٹھنے کی آرزو تھی یا اب اور لوگ درخواست کرتے ہیں اوران کو اس کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے انکار ہے، تاہم لوگوں کا اصرار غالب آیا اور چاروناچار قبول کرنا پڑا پھر بھی دل مطمئن نہ تھا، حافظ ابو المحاسن نے لکھا ہے کہ انہی دنوں میں خواب دیکھا کہ پیغمبرِ خدا کی قبر کھودرہے ہیں ڈر کر چونک پڑے اور سمجھے کہ میری ناقابلیت کی طرف اشارہ ہے، امام ابن سیرین علم تعبیر کے استاد مانے جاتے تھے انہوں نے تعبیر بتائی کہ اس سے ایک مردہ علم کو زندہ کرنا مقصود ہے، امام صاحب کو تسکین ہوگئی اوراطمینان کے ساتھ درس میں مشغول ہوئے، خواب کا ذکر تمام مؤرخوں اور محدثوں نے بھی کیا ہے اس لحاظ سے گمان غالب ہے کہ اصل واقعہ صحیح ہو۔ لیکن یہ زمانہ اور ابن سیرین کی تعبیر گوئی محض غلط ہے کیونکہ ابن سیرین اس سے بہت پہلے ۱۱۰ھ میں وفات پاچکے تھے۔ بہرحال امام صاحب نے استقلال کے ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا تو اوّل اوّل حماد کے پرانے شاگرد درس میں شریک ہوتے تھے لیکن چندروز میں وہ شہرت ہوئی کہ کوفہ کی اکثر درسگاہیں ٹوٹ کران کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئیں نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود ان کے اساتذہ مثلاً مسعر بن کدام، امام اعمش وغیرہ ان سے استفادہ کرتے تھے اوردوسروں کو ترغیب دلاتے تھے۔

اسپین کے سوا اسلامی دنیا کا کوئی حصہ نہ تھا جو ان کی شاگردی کے تعلق سے آزاد رہا ہو ان جن جن مقامات کے رہنے والے ان کی خدمت میں پہنچے ان سب کا شمار نہیں ہو سکتا لیکن جن اضلاع یا ممالک کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا گیا ہے وہ یہ ہیں مکہ، مدینہ، دمشق، بصرہ، واسطہ، موصل، جزیرہ رقہ، نصیبین، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، کرمان، اصفہان، حلوان، استرآباد، ہمدان، نہاوند، رے، قومس، دامغان، طبرستان، جرجان، نیشاپور، سرخس، نسا، بخارا، سمرقند کس صنعان، ترمذ، ہرات نہتار، الزام خوارزم، سیستان، مدائن، مصیصۃ، حمص [1] مختصر یہ کہ ان کی استادی کے حدود خلیفۂ وقت کے حدود مملکت کے برابر تھے۔

رفتہ رفتہ عراق میں ان کا ملکی اثر قائم ہو گیا۔ یہاں تک کہ ملک میں جو انقلابات ہوتے تھے لوگوں کو ان کی شرکت کا عموماً گمان ہوتا تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب نے تحفہ میں لکھا ہے کہ ''زید بن علی نے بنو امیہ کے عہد میں جو بغاوت کی تھی امام صاحب بھی اس میں شریک تھے'' نامہ دانش وراں کے مولفوں نے بھی ایسا ہی گمان گیا ہے لیکن ہم اس پر یقین نہیں کر سکتے جس قدر تاریخیں اور رجال کی کتابیں ہمارے سامنے ہیں ان میں کہیں ان کا ذکر نہیں حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو ایک قابل ذکر واقعہ تھا۔

زید بن علی نے ۱۲۱ھ میں بغاوت کی تھی اس وقت ہشام بن عبدالملک تخت خلافت پر متمکن تھا۔ ہشام اگرچہ کفایت شعار اور بعض امور میں نہایت جزرس تھا لیکن اس کی سلطنت نہایت امن و امان کی سلطنت تھی ملک میں ہر طرف امن و امان کا سکہ بیٹھا ہوا تھا، رعایا عموماً رضامند تھی، بیت المال میں ناجائز آمدنیاں داخل نہیں ہو سکتی تھیں، اس حالت میں امام ابوحنیفہ کو مخالفت کی کوئی وجہ نہ تھی۔ زید بن علی سادات میں ایک اوحا نامی شخص تھے ان کے لیے بغاوت کرنا اس لیے ضروری تھا کہ ان کے خیال کے مطابق خلافت ان کا مخصوص حق تھا، غالباً اس غلط فہمی کا منشاء یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کا خاندان اہل بیت کے ساتھ ایک خاص ارادیت رکھتا تھا۔ امام صاحب نے ایک مدت تک امام باقرؒ کے دامن فیض میں تربیت پائی تھی، ان اتفاقی واقعات نے امام ابوحنیفہ کی نسبت یہ گمان پیدا کر دیا تھا ورنہ تاریخی شہادتیں بالکل اس کے خلاف ہیں۔

ہشام نے ۱۲۵ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد ولید بن یزید، یزید الناقص، ابراہین

---

[1] عقود الجمان باب خامس

بن الولید، مروان الحمار یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے عباسی خلافت کی سلسلہ جنبانی جو ایک مدت سے ہو رہی تھی۔ مروان کے عہد میں نہایت قوت پکڑ گئی۔

ابو مسلم خراسانی نے تمام ملک میں سازشوں کا جال پھیلا دیا اور مروانی حکومت کی جڑ ہلا دی۔ چونکہ زیادہ تر فساد کا مرکز عراق اور عراق میں بھی خاص کوفہ تھا، مروان نے یزید بن عمر بن ہبیرہ کو وہاں کا گورنر مقرر کیا جو نہایت مدبر، دلیر، فیاض خاندانی اور صاحب اثر شخص تھا، یزید نے حکومت مروان کی ترکیب کو غور سے دیکھا، وہ سمجھ چکا تھا کہ اس مشینری میں اور سب کچھ ہے لیکن مذہبی پرزے نہیں ہیں۔ اسی بناء پر اس نے چاہا کہ ایوان حکومت مذہبی ستونوں پر قائم کیا جائے، عراق کے تمام فقہا کو جن میں قاضی ابن ابی لیلیٰ، ابن شبرمہ یا داؤد بن ہند بھی شامل تھے بلا کر بڑی بڑی ملکی خدمتیں دیں امام صاحب کو میر منشی اور افسر خزانہ مقرر کرنا چاہا لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا، یزید نے قسم کھا کر کہا کہ جبراً منظور کرنا ہوگا۔ ان کے ہم صاحبت بزرگوں نے بھی سمجھایا مگر یہ اپنے انکار پر قائم رہے اور کہا کہ اگر یزید کہے کہ مسجدوں کے دروازے گن دو تو بھی مجھ کو گوارا نہیں نہ کہ وہ کسی مسلمان کے قتل کا فرمان لکھے اور میں اس پر مہر کروں [1]۔ یزید نے غصہ میں آ کر حکم دیا کہ ہر روز ان کو دس درے لگائے جائیں۔ اس ظالمانہ حکم کی تعمیل ہوئی تاہم وہ اپنی ضد سے باز نہ آئے، آخر مجبور ہو کر یزید نے چھوڑ دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ اسی وقت مکہ معظمہ روانہ ہوئے اور ۱۳۶ھ کے آخر تک وہیں رہے۔ ابن قتیبہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ جھگڑا عہدۂ قضاء کے قبول کرنے پر تھا۔ ممکن ہے کہ یہ عہدہ بھی ان کے لیے تجویز ہوا ہو اور انہوں نے اس سے بھی انکار کیا ہو۔

۱۳۲ھ میں سلطنت نے دوسرا پہلو بدلا، یعنی بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا اور آل عباس تاج و تخت کے مالک ہوئے۔ اس خاندان کا پہلا فرمان روا ابو العباس سفاح تھا، اس نے چار برس کی حکومت کے بعد ۱۳۶ھ میں وفات پائی، سفاح کے بعد اس کا بھائی منصور تخت نشین ہوا، عباسیوں نے گو اموی خاندان کو بالکل تباہ کر دیا تھا، یہاں تک کہ خلفائے بنی امیہ کی قبریں اکھڑوا کر ان کی ہڈیاں تک جلا دیں، تاہم چونکہ نئی سلطنت تھی اور انتظامی امور پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچے تھے، جا بجا بغاوتیں برپا تھیں، ان فتنوں کے فرو کرنے میں سفاح و منصور اعتدال کی حد سے بہت دور نکل گئے

[1] عقود الجمان باب بست دکیم

اور وہ زیادتیاں کیں کہ مروانی حکومت کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا، تمام ملک کی آنکھیں ان نئے جانشینوں پر لگی تھیں لیکن ان خونریزیوں نے سب کے دل افسردہ کر دیے۔ چنانچہ ایک موقع پر منصور نے عبدالرحمٰن سے جو اس کا بچپن کا یار تھا پوچھا کہ سلطنت کو مروان کی حکومت سے کیا نسبت ہے؟'' اس نے کہا کہ ''میرے نزدیک تو کوئی فرق نہیں'' منصور نے کہا کیا کروں کام کے آدمی نہیں ملتے۔ عبدالرحمٰن نے کہا ''بازار میں جس جنس کی زیادہ مانگ ہوتی ہے کثرت بھی اسی کی ہوتی ہے''۔

جبر و ظلم کا بازار تو گرم ہی تھا لیکن منصور نے مزید ستم یہ کیا کہ سادات کی خانہ بربادی شروع کر دی، اس میں شبہ نہیں کہ سادات ایک مدت سے خلافت کا منصوبہ تیار کر رہے تھے اور ایک لحاظ سے ان کا حق بھی تھا تاہم سفاح کی وفات تک ان کی کوئی سازش ظاہر نہ ہوئی تھی بصرف بدگمانی پر منصور نے سادات و علویین کی بیخ کنی شروع کی۔ لوگ ان میں ممتاز تھے ان کے ساتھ زیادہ مظالم کیے۔ محمد بن ابراہیم کہ حسن و جمال میں یگانۂ روزگار تھے اور اس وجہ سے دیباج کہلاتے تھے ان کو زندہ دیوار میں چنوا دیا ان مظالم کی ایک بڑی داستان ہے جس کے بیان کرنے کو بڑا سخت دل چاہیے آخر تنگ آ کر ۱۴۵ھ میں انہی مظلوم سادات میں سے محمد نفس ذکیہ نے تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ مدینہ منورہ میں خروج کیا اور چند روز میں ایک بڑی جمعیت پیدا کر لی۔ بڑے بڑے پیشوایان مذہب حتیٰ کہ امام مالک نے فتویٰ دے دیا کہ منصور نے جبراً بیعت لی خلافت نفس ذکیہ کا حق ہے۔

نفس ذکیہ اگرچہ نہایت دلیر قوی بازو، فن جنگ سے واقف تھے لیکن تقدیر پر کس کا زور چل سکتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ رمضان ۱۴۵ھ میں نہایت بہادری سے لڑ کر میدان جنگ میں مارے گئے ان کے بعد ابراہیم ان کے بھائی نے علم خلافت بلند کیا اور ایسی تیاریوں سے مقابلہ کو اٹھے کہ منصور کے حواس جاتے رہے۔ کہتے ہیں کہ اس اضطراب میں منصور نے دو مہینے تک کپڑے نہیں بدلے۔ سرہانے سے تکیہ اٹھا لیتا تھا اور کہتا تھا کہ میں نہیں جانتا کہ ''یہ تکیہ میرا ہے یا ابراہیم کا'' انہیں دنوں میں دو کنیزیں حرم میں آئیں ان سے بات تک نہ کی۔ ایک شخص نے سبب پوچھا تو کہا ''یہ فرصت کے کام ہیں''۔ اس وقت تو دھن یہ ہے کہ ابراہیم کا سر میرے آگے یا میرا سر ابراہیم کے آگے رکھا جائے۔

ابراہیم چونکہ شجاعت اور دلیری کے علاوہ بہت بڑے عالم اور مقتدائے عالم تھے، اس لیے ان کے دعویٰ خلافت پر ہر طرف سے لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں خاص کوفہ میں کم وبیس بیس لاکھ آدمی ان کے ساتھ جان دینے کو تیار ہو گئے، مذہبی گروہ خاص کر علماء وفقہا نے عموماً ان کا ساتھ دیا۔ امام ابوحنیفہ شروع سے عباسیوں کی بے اعتدالیاں دیکھتے آئے تھے اور سفاح ہی کے زمانہ میں ان کی رائے قائم ہو چکی تھی کہ یہ لوگ منصب خلافت کے شایاں نہیں ابراہیم بن میمون جو ایک نہایت دیندار عالم تھے امام صاحب کے خالص دوستوں میں سے تھے وہ اکثر کہتے تھے کہ ان مظالم پر کیا ہم کو چپ رہنا چاہیے؟ امام صاحب فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف بے شبہ فرض ہے مگر اس کے لیے سامان شرط ہے''۔ لیکن وہ مذہبی جوش میں صبر کی تاب نہ لا سکے۔ ابومسلم خراسانی جو کہ ان مظالم کا بانی تھا، اس کے پاس گئے اور نہایت بے باکی کے ساتھ اس امر کے متعلق گفتگو کی۔ اس نے ان کی گستاخی یا فساد پیدا کرنے کے احتمال سے ان کو قتل کرا دیا۔ امام ابوحنیفہ سن کر بہت [1] روئے مگر کیا کر سکتے تھے، یہ ۱۳۱ھ کا واقعہ ہے ۱۴۵ھ میں ابراہیم نے جب علم خلافت بلند کیا تو چند پیشوایان مذہب کے ساتھ امام صاحب نے بھی ان کی تائید کی۔ خود شریک جنگ ہونا چاہتے تھے لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے نہ ہو سکے جس کا ان کو ہمیشہ افسوس رہا۔

نامہ دانشوران میں امام صاحب کا ایک خط نقل کیا ہے جو انہوں نے ابراہیم کو لکھا تھا، اس کے لیے یہ الفاظ ہیں **اما بعد فانی قد جهزت اليک اربعة الاف درهم ولم يكن عندی غيرها ولولا امانات عندی للحت بک فاذا لقيت القوم وظفرت بهم فافعل كما فعل ابوک فی اهل صفين، اقتل مدبر هم واجهز علی جريهم ولا تفعل كما فعل ابوک فی اهل الجمل فان القوم لهم فئهة** ۔یعنی میں آپ کے پاس چار ہزار درہم بھیجتا ہوں کہ میرے پاس اس وقت اسی قدر موجود تھے اگر لوگوں کی امانتیں میرے پاس نہ رکھی ہوتیں تو میں ضرور آپ سے آملتا، جب آپ دشمنوں پر فتح پائیں تو وہ برتاؤ کریں جو آپ کے باپ (حضرت علیؓ) نے صفین والوں کے ساتھ کیا تھا، زخمی اور بھاگ جانے والے سب قتل کیے جائیں وہ طریقہ اختیار نہ کیجئے گا جو آپ کے والد نے جنگ جمل میں جائز رکھا تھا کیونکہ مخالفین کی اکثریت تھی۔ نامۂ دانش داراں میں خط کی نسبت لکھا ہے کہ معتبر کتابوں میں

[1] الجواہر المضیہ ترجمہ ابراہیم بن میمون

منقول ہے لیکن خاص کسی کتاب کا نام نہیں بتایا اس لیے اسکی صحت پر یقین نہیں کر سکتے۔

یہ خط صحیح ہو یا غلط مگر اس میں شبہ نہیں کہ امام صاحب ابراہیم کے علانیہ طرفدار تھے اور بجز اس کے کہ خود شریک جنگ نہ ہو سکے لیکن ہر طرح پر ان کی مدد کی، مگر ابراہیم نے اپنے عدم تدبر کی وجہ سے شکست کھائی اور بصرہ میں نہایت دلیری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔

اس مہم سے فارغ ہو کر منصور ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جنہوں نے ابراہیم کا ساتھ دیا تھا ان میں امام صاحب بھی تھے اس وقت منصور کا پایۂ تخت ہاشمیہ کے مقام پر تھا جو کوفہ سے چند میل ہے لیکن چونکہ کوفہ والے سادات کے سوا اور کسی خاندان کو خلافت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اس لیے منصور نے ایک دوسرے دارالخلافہ کی تجویز کی اور بغداد کا انتخاب کیا۔ ۱۴۶ھ میں بغداد پہنچ کر امام ابو حنیفہ کے نام فرمان بھیجا کر فوراً پایۂ تخت میں حاضر ہوں وہ بنوامیہ کی تباہی کے بعد مکہ معظمہ سے چلے آئے تھے اور کوفہ میں مقیم تھے، منصور نے گو پہلے ہی ان کے قتل کا ارادہ کر لیا تھا لیکن بہانہ ڈھونڈھتا تھا۔ دربار میں حاضر ہوئے تو ربیع نے کہ حجاب کا عہدہ رکھتا تھا ان لفظوں سے ان کو دربار میں پیش کیا کہ ''یہ دنیا میں آج سب سے زیادہ بڑا عالم تھا''۔ منصور نے پوچھا تم نے کس سے علم کی تحصیل کی امام نے استادوں کے نام بنائے جن کا سلسلہ، شاگردی بڑے بڑے صحابہ تک پہنچتا تھا، منصور نے ان کے لیے قضا کا عہدہ تجویز کیا امام صاحب نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس کی قابلیت نہیں رکھتا۔ منصور نے غصہ میں آ کر کہا تم جھوٹے ہو، امام صاحب نے کہا کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ دعویٰ ضرور سچا ہے کہ میں عہدۂ قضا کے قابل نہیں کیونکہ جھوٹا شخص قاضی نہیں مقرر ہو سکتا''۔

یہ تو ایک منطقی لطیفہ تھا لیکن دراصل وہ قضا کی ذمہ داریاں نہیں اٹھا سکتے تھے انہوں نے منصور کے سامنے اپنی ناقابلیت کی جو وجوہ بیان کیں وہ بالکل بجا تھیں یعنی یہ کہ مجھ کو اپنی طبیعت پر اطمینان نہیں، میں عربی النسل نہیں ہوں اس لیے اہل عرب کو میری حکومت ناگوار ہوگی، درباریوں کو تنظیم کرنی پڑے گی اور یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا'' پھر بھی منصور نے نہ مانا اور قسم کھا کر کہا تم کو قبول کرنا ہوگا۔ امام صاحب نے بھی قسم کھائی کہ ہرگز قبول نہیں کروں گا اس جرأت اور بے باکی پر تمام دربار حیرت زدہ تھا۔ ربیع نے غصہ میں آ کر کہا، ابو حنیفہ! تم امیر المومنین کے مقابلے میں قسم کھاتے ہو امام صاحب نے فرمایا ہاں! کیونکہ امیر المومنین کو قسم کا کفارہ ادا کرنا میری نسبت زیادہ آسان ہے۔

خطیب کی ایک اور روایت ہے کہ منصور نے زیادہ جبر کیا تو مجبوراً دارالقضاء میں جا کر بیٹھے، ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں قرضے کا دعویٰ تھا لیکن ثبوت کے گواہ نہ تھے مدعا علیہ کو سرے سے انکار تھا۔ امام صاحب نے حسب قاعدہ مدعا علیہ سے کہا کہ تم قسم کھاؤ کہ مدعی کا تم پر کچھ دینا نہیں آتا وہ تیار ہو گیا۔ واللہ کا لفظ کہا تھا کہ امام صاحب نے گھبرا کر روک دیا اور آستین سے کچھ روپے نکال کر مدعی کے حوالے کیے کہ تم اپنا قرض لو ایک مسلمان کو قسم کیوں کھلواتے ہو، بالآخر تنگ آ کر منصور سے کہہ دیا کہ مجھ سے کسی طرح یہ کام نہیں چل سکتا، اس پر حکم ہوا کہ قید خانہ بھیج جائیں۔ اور قید حیات کے ساتھ قید خانہ سے چھٹکارا نصیب ہوا۔ اس مدت میں منصور اکثر ان کو قید خانہ سے بلا لیتا اور علمی بحثیں کیا کرتا۔

وفات (رجب ۱۵۰ھ)

منصور نے امام کو ۱۴۶ھ میں قید کیا لیکن اس حالت میں بھی اس کو ان کی طرف سے اطمینان نہ تھا، بغداد دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے علوم وفنون کا مرکز بن گیا تھا طالبان کمال ممالک اسلامی کے ہر گوشہ سے اٹھ کر بغداد ہی کا رخ کرتے تھے، امام صاحب کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی، قید کی حالت نے ان کے اثر اور قبول عام کو بجائے کم کرنے کے اور زیادہ کر دیا تھا۔ بغداد کی علمی جماعت جس کا شہر میں بہت کچھ اثر تھا، ان کے ساتھ نہایت خلوص رکھتی تھی ان باتوں کا یہ اثر تھا کہ منصور نے ان کو گو نظر بند کر رکھا تھا لیکن کوئی امر ان کے ادب اور تعظیم کے خلاف نہ کر سکتا تھا، قید خانہ میں ان کا سلسلۂ تعلیم بھی برابر قائم رہا۔ امام محمد نے جو فقہِ حنفی کے دست و بازو ہیں قید خانہ ہی میں ان سے تعلیم پائی ان وجوہ سے منصور کو امام صاحب کی طرف سے جو اندیشہ تھا وہ قید خانہ کی حالت میں بھی باقی رہا جس کی آخری تدبیر یہ تھی کہ بے خبری میں ان کو زہر دلوا دیا۔ جب ان کو زہر کا اثر محسوس ہوا تو سجدہ کیا اور اسی حالت میں وفات پائی۔

ان کے مرنے کی خبر انتہائی سرعت کے ساتھ تمام شہر میں پھیل گئی۔ اور سارا بغداد اُمنڈ آیا۔ حسن بن عمارہ نے جو کہ قاضی شہر تھے غسل دیا، نہلاتے تھے اور کہتے جاتے تھے ''واللہ تم سب سے بڑے فقیہ، بڑے عابد، بڑے زاہد تھے، تم میں تمام خوبیاں جمع تھیں، تم نے اپنے جانشینوں کو مایوس کر دیا کہ وہ تمہارے مرتبہ کو پہنچ سکیں''، غسل سے فارغ ہوتے ہوتے لوگوں کی یہ کثرت ہوئی

کہ پہلی بار نماز جنازہ میں کم و بیش پچاس ہزار کا مجمع تھا اس پر بھی آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ چھ بار نماز جنازہ پڑھی گئی اور عصر کے قریب جا کر لاش دفن ہو سکی۔

امام نے وصیت کی تھی کہ خیزان کے مقبرے میں دفن کئے جائیں کیونکہ یہ جگہ ان کے خیال میں مغصوب نہ تھی۔ اس وصیت کے موافق خیزران کے شرقی جانب ان کا مقبرہ تیار ہوا۔ مؤرخ خطیب نے لکھا ہے کہ دفن کے بعد بھی بیس دن تک لوگ ان کے جنازہ کی نماز پڑھتے رہے۔ مقبولیت کی اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہو سکتی ہے''۔

اس وقت ان ممالک میں بڑے بڑے ائمہ مذہب موجود تھے، جن میں بعض خود امام صاحب کے استاد تھے، سب نے ان کے مرنے کا رنج کیا اور نہایت تاسف آمیز کلمات کہے ابن جریج مکہ میں تھے سن کر کہا اناللہ بہت بڑا عالم تھا جاتا رہا'' شعبہ بن الحجاج نے جو کہ امام ابوحنیفہ کوفہ کے شیخ اور بصرہ کے امام تھے نہایت افسوس کیا اور کہا ''کوفہ میں اندھیرا ہو گیا''۔ اس واقعہ کے چند روز بعد عبد اللہ بن المبارک کو بغداد جانے کا اتفاق ہوا تو امام کی قبر پر گئے اور رو کر کہا ''ابوحنیفہ خدا تم پر رحم کرے'' ابراہیم مرے تو اپنا جانشین چھوڑ گئے افسوس تم نے تمام دنیا میں کسی کو اپنا جانشین نہ چھوڑا[1]۔

امام کا مزار ایک مدت تک مرجع خلائق رہا اور آج بھی ہے۔ سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے کہ بڑی عظمت وشان کا فرمان روا اور نہایت عادل و فیاض تھا ۴۵۹ھ میں ان کی قبر پر ایک قبہ اور اس کے قریب ایک مدرسہ تعمیر کرایا غالباً بغداد میں یہ پہلا مدرسہ تھا، کیونکہ نظامیہ جو تمام اسلامی مدرسوں کا باوا آدم خیال کیا جاتا ہے وہ اسی سنہ ھ میں لیکن اس کے بعد تعمیر ہوا، رفعت اور خوبی عمارت کے لحاظ سے بھی لاجواب تھا، ابوسعید شرف الملک جو الپ ارسلان کا مستوفی تھا اس کے اہتمام سے عمارت تیار ہوئی، افتتاح کی رسم میں بغداد کے تمام علماء اور عمائد شریک تھے، اتفاق سے اسی وقت ابوجعفر مسعود جو ایک مشہور شاعر تھا آنکلا اور برجستہ یہ اشعار پڑھے۔

الم تر ان العلم کان مبددا	فجمعه هذا المغیب فی اللحد
کذالک کانت هذه الارض میتة	فانشرها فعل الحمید ابی سعد

یعنی تم دیکھتے نہیں! علم کس طرح ابتر ہو رہا تھا، پھر اس شخص نے اس کو ترتیب دیا جو اس

---

[1] عقود الجمان میں یہ تمام تفصیل مذکور ہے۔

لحد میں مدفون ہے، اسی طرح یہ زمین مردہ پڑی تھی ابوسعد کی کوشش نے اس کو دوبارہ زندہ کر دیا۔

یہ مدرسہ جو مشہد ابوحنیفہ کے نام سے مشہور ہے مدت تک قائم رہا اور بڑے بڑے نامور علماء اس کے پروفیسر مقرر ہوئے جن کے نام اور اجمالی حالات الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ میں اکثر پائے جاتے ہیں۔ ۴۹۳ھ میں حکیم ابن جزلہ نے جو کہ خلیفہ مقتدر باللہ کے دربار کا ایک مشہور حکیم تھا اپنی تمام کتابیں اس مدرسے کے لیے وقف کیں [1]۔ اس مدرسے سے متعلق ایک مسافر خانہ بھی تھا۔ شائقین علم جو اطراف ملک سے آکر بغداد میں عارضی قیام کرتے تھے ان کو وہاں سے کھانا ملتا تھا، ایشیا کا مشہور سیاح ابن بطوطہ جس وقت بغداد میں پہنچا ہے تو عباسی حکومت کا آخری دور تھا وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ اس وقت تمام بغداد میں مشہد ابی حنیفہؒ کے سوا کوئی زاویہ موجود نہیں ہے۔ جہاں سے مسافروں کو کھانا ملتا ہو۔'' آج بھی ان کا مقبرہ بغداد کے مشہور اور متبرک مقامات میں سے ہے، حال کے شاہ ایران، سلطان ناصر الدین قاچار ملکہ، نے اپنے حالات سفر میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہ کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور نذر چڑھائی علم کی شان دیکھو جس کی بدولت کوفہ کے ایک بزاز نے یہ رتبہ حاصل کیا کہ بارہ سو برس کے بعد آج اس کے مزار پر بڑے بڑے شاہنشاہوں کے سر جھکتے ہیں۔

امام کی اولاد

امام صاحب کی اولاد کا فصل حال معلوم نہیں، مگر اس قدر یقینی ہے کہ وفات کے وقت حماد کے سوا ان کے کوئی اولاد موجود نہ تھی حماد بڑے رتبہ کے فاضل تھے بچپن میں ان کی تعلیم نہایت اہتمام سے ہوئی چنانچہ جب الحمد ختم کی تو ان کے پدر بزرگوار نے اس تقریب میں معلم کو پانچ سو درہم نذر کیے بڑے ہوئے تو خود امام صاحب سے مراتب علمی کی تکمیل کی۔ علم و فضل کے ساتھ بے نیازی و پرہیزگاری میں بھی باپ کے خلف الرشید تھے امام صاحب نے جب انتقال کیا تو ان کے گھر میں لوگوں کا بہت سا مال و اسباب امانت رکھا ہوا تھا انہوں نے قاضی شہر کے پاس حاضر کیا کہ جن کی امانتیں ہیں ان کو پہنچا دی جائیں قاضی صاحب نے کہا کہ ابھی اپنے پاس ہی رہنے دو کہ زیادہ حفاظت سے رہے گا۔ انہوں نے کہا کہ آپ ان کی جانچ کر لیں تا کہ میرے والد

---

[1] ابن خلکان ترجمہ یحییٰ بن عیسیٰ بن جزلۃ الطبیب۔

بری الذمہ ہو جائیں، غرض تمام مال واسباب قاضی صاحب کو سپرد کر کے خود روپوش ہو گئے اور اس وقت ظاہر ہوئے جب کہ وہ چیزیں کسی اور کے اہتمام میں دے دی گئیں۔ تمام عمر کسی کی ملازمت نہیں کی اور نہ شاہی دربار سے کچھ تعلق پیدا کیا۔ ذیقعدہ ۱۷۶ھ میں وفات پائی۔ چار بیٹے چھوڑے۔ عمر، اسماعیل، ابوحیان، عثمان۔

اسماعیل نے علم وفضل میں نہایت شہرت حاصل کی چنانچہ مامون الرشید نے ان کو عہدہ قضا پر مامور کیا جس کو انہوں نے اس دیانت داری اور انصاف سے انجام دیا کہ جب بصرہ سے چلے تو سارا شہر ان کی مشایعت کو نکلا اور سب لوگ ان کی جان و مال کو دعائیں دیتے تھے۔[1] مساور نے ان کی مدح میں کہا ہے۔

اذا ما لناس یوما قایسونا	بابلدة من الفتیا طریفه
اتیناهم بمقیاس صحیح	تلادمن طراز ابی حنیفه
اذا سمع الفقیه بها وعاها	واثبتها لبجر فی صحیفه[2]

اخلاق و عادات

ہمارے تذکرہ نویسوں نے امام کے اخلاق و عادات کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں خوش اعتقادی اور مبالغہ کا اس قدر رنگ بھرا ہے کہ امام صاحب کی اصلی صورت پہچانی نہیں جاتی چالیس برس تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی۔ تیس سال تک متصل روزے رکھے۔ جہاں وفات کی اس جگہ سات ہزار بار قرآن ختم کیا۔ نہر کوفہ میں مشتبہ گوشت کا ٹکڑا پڑ لیا تو اس خیال سے کہ مچھلیوں نے کھایا ہوگا اور مچھلیاں بہت دنوں تک زندہ رہتی ہیں ایک مدت تک مچھلی نہیں کھائی۔ اسی طرح ایک شبہ پر بکری کا گوشت کھانا چھوڑ دیا ان کا ذاتی صرف۔ صرف دس آنہ ماہوار تھا۔ یہ اس قسم کے بہت سے افسانے ان کی نسبت مشہور ہیں اور لطف یہ کہ ہمارے مورخین ان ہی دوراز کار قصوں کو امام کے کمالات کا جوہر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ واقعات نہ تاریخی اصول سے ثابت ہیں نہ ان سے کسی کے شرف پر استدلال ہو سکتا ہے یہ سچ ہے کہ امام صاحب کے جن فضائل یا عام

---

[1] ابن خلکان ترجمہ حماد۔

[2] معارف ابن قتیبہ۔ ترجمہ امام ابوحنیفہ،

حالات کو ہم صحیح تسلیم کرتے ہیں وہ بھی ان ہی کتابوں سے ماخوذ ہیں جن میں یہ فضول قصے مذکور ہیں۔ لیکن ہر واقعہ کی حیثیت جداگانہ ہوتی ہے اور سی اعتبار سے شہادت کی حیثیت بھی بدل جاتی ہے، معمولی واقعہ میں عام شہادتیں کافی ہیں لیکن اس قسم کے واقعات کے لیے ایسی سند درکار ہے جس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہ ہو، یعنی حدیث صحیح مرفوع متصل کے لیے جو قیدیں ضروری ہیں ان سے بھی کچھ بڑھ کر ساتھ ہی روایت کے اصول پر بھی منطبق ہو امام صاحب کی دانش مندی، دقیقہ سنجی، نکتہ شناسی پر نگاہ پڑتی ہے جن کا ثبوت کانوں سے سنا ہوا، نہیں بلکہ چشم دید موجود ہے تو ان واقعات پر مشکل سے یقین آسکتا ہے جو رہبانیت اور بے اعتدالی کی حد سے بھی متجاوز ہیں۔

امام صاحب کے محاسن اخلاق کی صحیح مگر اجمالی تصویر دیکھنی ہو تو قاضی ابو یوسف کی تقریر سنو جو انہوں نے ہارون الرشید کے سامنے بیان کی تھی۔ ہارون نے ایک موقع پر قاضی صاحب موصوف سے کہا کہ ابو حنیفہ کے اوصاب بیان کیجیے، انہوں نے کہا جہاں تک میں جانتا ہوں ابو حنیفہ کے اخلاق و عادات یہ تھے کہ نہایت پرہیز گار تھے منہیات سے بچتے تھے اکثر چپ رہتے تھے اور سوچا کرتے تھے، کوئی شخص مسئلہ پوچھتا اور ان کو معلوم ہوتا تو جواب دیتے ورنہ خاموش رہتے نہایت سخی اور فیاض تھے کسی سے حاجت کا اظہار نہ کرتے، اہل دنیا سے احتراز تھا۔ دینوی جاہ و عزت کو حقیر سمجھتے تھے، غیبت سے بہت بچتے تھے جب کسی کا ذکر کرتے تو بھلائی کے ساتھ کرتے، بہت بڑے عالم تھے اور مال کی طرح علم کے صرف کرنے میں بھی فیاض تھے۔" ہارون الرشید نے یہ سن کر کہا "صالحین کے یہی اخلاق ہوتے ہیں"۔ عوام کی نگاہوں میں یہ باتیں چنداں وقعت نہیں رکھتیں، لیکن روحانی اوصاف کے نکتہ شناس سمجھتے ہیں کہ طرز زندگی ظاہر میں جس قدر سادہ اور آسان ہے دراصل اسی قدر مشکل اور قدر کے قابل ہے۔

امام صاحب کو خدا نے حسن سیرت کے ساتھ جمال صوت بھی دیا تھا۔ میانہ قد، خوشرو اور موزوں اندام تھے، گفتگو نہایت شیریں اور آواز بلند اور صاب تھی، کیسا ہی پیچیدہ مضمون ہو نہایت صفائی اور فصاحت سے ادا کر سکتے تھے۔

مزاج میں تکلف تھا اور اکثر خوش لباس رہتے تھے کبھی کبھی سنجاب اور قاقم کے جبے بھی استعمال کرتے تھے، ابو مطیع بلخی ان کے شاگرد کا بیان ہے کہ "میں نے ایک دن ان کو نہایت قیمتی

چادر اور قمیض پہنے دیکھا۔ جن کی قیمت چار سو درہم ہوگی۔

ایک دن نصر بن محمد ان سے ملنے گئے تو امام صاحب کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے ان سے کہا کہ ذرا دیر کے لیے اپنی چادر مجھے دے دو واپس آئے تو شکایت کی کہ ناحق تمھاری چادر لے کر مجھے شرمندہ ہونا پڑا انہوں نے کہا کیوں؟ فرمایا بہت گندہ ہے، نصر کہتے ہیں کہ میں نے وہ چادر پانچ دینار کو خریدی تھی اور مجھ کو اس پر ناز تھا اس لیے امام صاحب کی شکایت سے تعجب ہوا۔ لیکن دوسرے موقع پر جب میں نے ان کو ایک چادر اوڑھے دیکھا جو ۳۰ دینار سے کم قیمت کی نہ تھی تو وہ تعجب جاتا رہا۔

خلیفہ منصور نے درباریوں کے لیے خاص قسم کی ٹوپیاں ایجاد کی تھیں جو نرکل وغیرہ سے بنتی ہیں اور ان پر سیاہ کپڑا منڈھا ہوتا تھا۔ چونکہ نہایت لمبی ہوتی تھیں، ابو ولامۃ شاعر نے ظرافتہً کہا۔

وکنا نرجی من امام زیادۃ   فزادالامام المرتضی فی القلانس

یعنی ہم کو خلیفہ سے اضافہ کی امید تھی سو حضرت نے اضافہ کیا تو ٹوپیوں میں کیا۔

امام صاحب اگرچہ دربار سے کوسوں بھاگتے تھے لیکن اس قسم کی ٹوپیاں جو اہل دربار اور امراء کے ساتھ مخصوص تھی کبھی کبھی استعمال کرتے تھے، دنیاوی دولتمندوں کے لیے تو ایک معمولی بات ہے لیکن علماء کے دائرے میں یہ امر تعجب کی نگاہ سے دیکھا گیا کہ امام صاحب کے توشہ خانہ میں اکثر سات آٹھ ٹوپیاں موجود رہتی تھیں۔

اور باتوں میں بھی امام صاحب کا طرز معاشرت ان حیثیتوں میں اور علماء سے بالکل جدا تھا، ان کے ہمعصر عموماً شاہی دربار یا وزراء اور امراء کے وظیفہ خوار تھے اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے، قاضی ابن عبد البر پر کسی نے اعتراض کیا تھا کہ آپ امراء کے وظیفہ خوار ہیں انہوں نے اس کے جواب میں بعض صحابہ اور بہت سے تابعین اور تبع تابعین کی نظیریں پیش کی جو امراء کے روپئے اور انعامات سے زندگی بسر کرتے تھے۔

اگر ہم اس کو جدید خیال لوگوں کی طرح کاہلی اور مفت خوری تصور نہیں کرتے کیونکہ اس زمانے تک تعلیم کا سلسلہ معاوضہ کی بنیاد پر نہیں قائم ہوا تھا۔ علماء بطور خود اپنے گھروں پر یا مسجدوں میں لوگوں کو مفت تعلیم دیتے تھے اور یہ سلسلہ اس قدر وسیع اور مفید تھا کہ آج تک اس غضب بڑھ کر نہ

ہو سکا۔ امراء کے ہاں سے ان لوگوں کے لیے جو وظیفے مقرر تھے یا کبھی کبھی کوئی صلہ نذر کے طور پر مل جاتا ہے تو اس کو ان آنریری پروفیسر کی تنخواہ سمجھ لینا چاہیے لیکن اس سے انکار نہیں ہونا چاہیے کہ رفتہ رفتہ انہی مثالوں سے پیرزادگی اور مفت خوری کی بنیاد قائم ہو گئی جس نے قوم کے ایک بڑے حصے کو بالکل نکما اور اپاہج بنا دیا، بے شبہ امام ابو حنیفہ اس اصول کے سرے سے مخالف تھے اور اس لحاظ سے ان کی مخالفت بجا تھی اس بے تعلقی سے ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ امر حق کے اظہار میں امام صاحب کو کسی سے باک نہیں ہوتا تھا، انسان کتنا ہی آزاد مزاج اور صاف گو ہو لیکن احسان وہ چھپا ہوا جادو ہے کہ اس سے بچنا ممکن نہیں تو قریباً ناممکن ہے۔ امام صاحب تمام عمر کسی کے احسان مند نہ ہوئے اور اسی وجہ سے ان کی آزادی کو کوئی چیز دبا نہ سکتی تھی، اکثر موقعوں پر وہ اس بات کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے۔

ابن ہبیرہ نے جو کہ کوفہ کا گورنر اور نہایت نامور شخص تھا، ان سے بہ لجاجت کہا کہ " آپ کبھی کبھی قدم رنجہ فرماتے تو مجھ پر احسان ہوتا"۔ فرمایا "میں تم سے مل کر کیا کروں گا۔ مہربانی سے پیش آؤ گے تو خوف ہے کہ تمھارے دام میں آ جاؤں گا، عتاب کرو گے تو میری ذلت ہے۔ تمھارے پاس جو زر و مال ہے مجھ کو اس کی حاجت نہیں۔ میرے پاس جو دولت ہے اس کو کوئی شخص چھین نہیں سکتا، عیسیٰ بن موسیٰ کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ گزرا۔ خلیفہ منصور اور حرہ خاتون (منصور کی بیوی میں کچھ شکر رنجی ہو گئی تھی اور خاتون کو یہ شکایت تھی کہ خلیفہ عدل نہیں کرتا۔ خلیفہ نے کہا کسی کو منصف قرار دو۔ اس نے امام صاحب کا نام لیا۔ اسی وقت طلبی کا فرمان گیا۔ خاتون پردہ کے قریب بیٹھی کہ امام صاحب جو فیصلہ کریں خود اپنے کانوں سے سنے۔ منصور نے پوچھا شروع کے رو سے مرد کتنے نکاح کر سکتا ہے؟ امام صاحب نے کہا چار۔ منصور خاتون کی طرف مخاطب ہوا کہ سنتی ہو۔ پردہ سے آواز آئی "ہاں سنا" امام صاحب نے منصور کی طرف خطاب کر کے کہا مگر یہ اجازت اس شخص کے لیے مخصوص ہے جو عدل پر قادر ہو ورنہ ایک سے زیادہ نکاح اچھا نہیں۔ خدا خود فرماتا ہے فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً منصور چپ ہو گیا۔ امام صاحب گھر آئے تو ایک خادم پچاس ہزار درہم کے توڑے لیے ہوئے حاضر ہوا کہ خاتون نے نذر بھیجی ہے اور کہا ہے کہ آپ کی کنیز آپ کو سلام کہتی ہے اور آپ کی حق گوئی کی نہایت مشکور ہے"۔ امام صاحب نے روپے واپس کر دیے اور خادم سے فرمایا جا کر خاتون سے کہنا کہ میں نے جو کچھ کہا

ہے کسی غرض سے نہیں کہا بلکہ میرا فرض منصبی تھا"۔

امام صاحب کی تجارت بہت وسیع تھی، لاکھوں کا لین دین تھا۔ اکثر شہروں میں گماشتے مقرر تھے۔ بڑے بڑے سوداگروں سے معاملہ رہتا تھا ایسے بڑے کارخانہ کے ساتھ دیانت اور احتیاط کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ ناجائز طور پر ایک حبہ بھی انکے خزانے میں نہیں داخل ہوسکتا تھا مگر انکو کچھ پروانہیں ہوتی تھی۔ ایک دفعہ حفص بن عبدالرحمٰن کے پاس خز کے تھان بھیجے اور کہلا بھیجا کہ فلاں فلاں تھان میں عیب ہے، خریدار کو جتنا دینا۔ حفص کو اس ہدایت کا خیال نہ رہا، تھان بیچ ڈالے اور خریداروں کو اس عیب کی اطلاع نہ دی۔ امام صاحب کو معلوم ہوا تو نہایت افسوس کیا اور تھانوں کی قیمت جو تیس ہزار درہم تھی سب خیرات کردی۔

ایک دن ایک عورت خز کا تھان لے کر آئی کہ فروخت کرادیجیے۔ امام صاحب نے دام پوچھے اس نے سو روپیہ بتائے۔ فرمایا کم ہیں۔ اس نے کہا تو دو سو روپے، فرمایا یہ تھان پانچ سو روپے سے کم قیمت کا نہیں۔ اس نے متعجب ہوکر کہا کہ آپ شاید مذاق کرتے ہیں۔ امام صاحب نے پانچ سو روپے اپنے پاس سے دے دیے اور تھان رکھ لیے۔ اس احتیاط اور دیانت نے ان کے کارخانے کو بجائے نقصان پہنچانے کے اور بھی چمکا دیا۔

تجارت اور اکتساب دولت سے ان کا مقصود زیادہ تر عوام کو فائدہ پہنچانا تھا جتنے احباب اور ملنے والے تھے سب کے روزینے مقرر کر رکھے تھے، شیوخ اور محدثین کے لیے تجارت کا ایک حصہ مخصوص کر دیا تھا کہ اس سے جو نفع ہوتا تھا سال کے سال ان لوگوں کو پہنچا جاتا تھا [1]۔ عام معمول تھا کہ گھر والوں کے لیے کوئی چیز خریدتے تو اسی قدر محدثین اور علماء کے پاس بھجواتے اتفاقیہ کوئی شخص ملنے آتا تو اس کا حال پوچھتے اور حاجت مند ہوتا تو حاجت روائی کرتے، شاگردوں میں جس کو تنگ حال دیکھتے اسکی ضروریات خانگی کی کفالت کرتے تاکہ اطمینان سے علم کی تکمیل کرسکے، بہت سے لوگ جن کو مفلسی کی وجہ سے تحصیل علم کا موقع نہیں ملتا تھا۔ امام صاحب ہی کی دستگیری کی بدولت بڑے بڑے رتبوں پر پہنچے۔ انہی میں قاضی ابو یوسف صاحب بھی ہیں جن کا مفصل تذکرہ آگے آرہا ہے۔

ایک دفعہ کچھ لوگ ملنے آئے، ان میں سے ایک شخص ظاہری صورت سے شکستہ حال

---

[1] علامہ نووی نے تہذیب الاسماء میں ان واقعات کو بسند بیان کیا ہے۔

معلوم ہوتا تھا۔ جب لوگ رخصت ہو کر چلے تو امام صاحب نے اس سے فرمایا ذرا ٹھہر جاؤ جانماز کی طرف اشارہ کیا کہ اس کو اٹھانا، اس نے دیکھا کہ ہزار درہم کی تھیلی تھی، عرض کیا کہ میں دولتمند ہوں، مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ فرمایا تو صورت ایسی بنانی چاہیے کہ دوسروں کو شبہ نہ ہو۔

ایک دفعہ کسی بیمار کی عیادت کو جارہے تھے، راہ میں ایک شخص ملا جو ان کا مقروض تھا، اس نے دور سے ان کو دیکھ لیا اور کترا کر دوسری طرف چلا انہوں نے پکارا کہ "کہاں جاتے ہو" وہ کھڑا ہو گیا۔ قریب پہنچے تو پوچھا کہ مجھ کو دیکھ کر تم نے راستہ کیوں کاٹا؟ اس نے کہا کہ آپ کے دس ہزار درہم مجھ پر آتے ہیں جو مجھ سے اب تک ادا نہ ہو سکے اس شرم سے آنکھ نہیں ملا سکتا امام صاحب اس کی غیرت سے متعجب ہوئے اور فرمایا کہ جاؤ میں نے سب معاف کر دیا۔"

ایک بار سفر حج میں عبداللہ سہمی کا ساتھ ہوا۔ کسی منزل میں ایک بدوی نے ان کو پکڑا اور امام صاحب کے سامنے لایا کہ اس پر میرے روپے قرض ہیں اور یہ ادا نہیں کرتا، امام صاحب نے عبداللہ سے اس کی حقیقت پوچھی تو انھوں نے سرے سے انکار کیا۔ امام صاحب نے بدوی سے پوچھا، آخر کتنے درہموں پر جھگڑا ہے، اس نے کہا کہ چالیس درہم۔ متعجب ہو کر فرمایا کہ زمانے سے حمیت اٹھ گئی اتنے سے معاملے پر جھگڑے! پھر کل درہم اپنے پاس سے ادا کر دیے۔

ابراہیم بن عتبہ چار ہزار درہم کے قروض تھے اور اس ندامت کی وجہ سے لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا تھا تو ان کے ایک دوست نے چندہ کر کے ان کا قرض ادا کرنا چاہا اور لوگوں نے بقدر حیثیت اعانت کی۔ امام صاحب کے پاس گئے تو فرمایا کل کس قدر قرضہ ہے انہوں نے کہا چار ہزار درہم۔ فرمایا اتنی سی رقم کے لیے لوگوں کو کیوں تکلیف دیتے ہو۔ یہ کہہ کر پورے چار ہزار درہم خود دے دیے، تاریخوں میں اس قسم کے اور بہت سے واقعات [illegible] منقول ہیں۔ ہم نے اختصار کے لحاظ سے قلم انداز کیے۔

اس دولت مندی اور عظمت و شان کے ساتھ نہایت متواضع، حلیم اور خلیق تھے ایک دفعہ مسجد خیف میں تشریف رکھتے تھے، شاگردوں اور ارادتمندوں کا حلقہ تھا۔ ایک اجنبی شخص نے مسئلہ پوچھا، امام صاحب نے جواب مناسب دیا۔ اس نے کہا "مگر حسن بصری نے اس کے خلاف بتایا ہے" امام صاحب نے فرمایا، حسن نے غلطی کی، حاضرین میں سے ایک شخص جو [illegible] کا معتقد تھا طیش میں آگیا اور جھلا کر کہا "ابن الفاحشہ تو حسن کو خاطی کہتا ہے اس گستا[illegible] بے ہودہ لوں نے

تمام مجلس کو برہم کر دیا اور لوگوں نے چاہا کہ پکڑ کر سزا دیں۔ امام صاحب نے روکا۔ ان کے لحاظ سے لوگ مجبور ہو گئے، مگر مجلس میں سناٹا رہا۔ لوگوں کا جوش کم ہوا تو امام صاحب نے اس شخص کی طرف خطاب کیا اور فرمایا کہ ہاں حسن نے غلطی کی، عبداللہ بن مسعودؓ نے اس باب میں جو روایت کی ہے وہ صحیح ہے"۔

یزید بن کمیت کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر تھا تو ایک شخص نے ان سے گستاخانہ گفتگو شروع کی۔ امام صاحب تحمل سے جواب دیتے تھے لیکن وہ اور شوخ ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے امام کو زندیق کہہ دیا، اس پر فرمایا کہ "خدا تم کو بخشے وہ خوب جانتا ہے کہ میری نسبت تم نے جو لفظ کہا وہ صحیح نہیں ہے"۔ امام صاحب خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کسی پر لعنت نہیں کی، کسی سے انتقال نہیں لیا۔ کسی مسلمان یا ذمی کو نہیں ستایا، کسی سے فریب اور بد عہدی نہیں کی"۔

امام سفیان ثوری اور امام صاحب میں کچھ شکر رنجی تھی۔ ایک شخص نے امام صاحب سے آ کر کہا کہ سفیان آپ کو برا کہہ رہے تھے۔ امام نے فرمایا کہ خدا میری اور سفیان دونوں کی مغفرت کرے۔ سچ یہ ہے کہ ابراہیم نخعی کے موجود ہوتے بھی اگر سفیان دنیا سے اٹھ جاتے تو مسلمانوں کو سفیان کے مرنے کا ماتم کرنا پڑتا"

ایک دن مسجد میں درس دے رہے تھے، ایک شخص نے جس کو ان سے کچھ عداوت تھی تمام مجلس میں ان کی نسبت ناروا الفاظ کہے، انہوں نے کچھ التفات نہ کی اور اسی طرح درس میں مشغول رہے، شاگردوں کو بھی منع کر دیا کہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ درس سے اٹھے تو وہ شخص ساتھ ہوا اور جو کچھ منہ میں آتا تھا بکتا جاتا تھا۔ امام صاحب اپنے گھر کے قریب پہنچے تو کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ بھائی یہ میرا گھر ہے کچھ باقی رہ گیا ہو تو اٹھا نہ رکھو کہ اب میں اندر جاتا ہوں اور تم کو موقع نہ ملے گا"۔

ایک اور دن حلقہ درس قائم تھا تو ایک نوعمر نے مسئلہ پوچھا۔ امام صاحب نے جواب دیا، اس نے کہا ابوحنیفہ تم نے جواب میں غلطی کی، ابوالخطاب جرجانی بھی حلقہ میں شریک تھے ان کو نہایت غصہ آیا اور حاضرین کی ملامت کی کہ تم لوگ بڑے بے حمیت ہو امام کی شان میں ایک لونڈا جو جی میں آتا ہے کہہ جاتا ہے تم کو ذرا جوش نہیں آتا۔ امام صاحب نے ابوالخطاب کی طرف

خطاب کیا اور فرمایا کہ ان لوگوں پر کچھ الزام نہیں۔ میں اسی جگہ بیٹھا ہوں تو اسی لیے بیٹھا ہوں کہ لوگ آزادانہ میری رائے کی غلطیاں ثابت کریں اور میں تحمل کے ساتھ سنوں"

محلہ میں ایک موچی رہتا تھا جو نہایت رنگین طبع اور خوش مزاج تھا اس کا معمول تھا کہ دن بھر مزدوری کرتا، شام کو بازار جا کر گوشت اور شراب مول لاتا۔ کچھ رات گئے دوست احباب جمع ہوتے، خود سیخ پر کباب لگاتا اور یاروں کو کھلاتا۔ ساتھ ہی شراب کا دور چلتا اور مزے میں آ کر یہ شعر گاتا۔

اضاعونی وای فتی اضاعوا   لیوم کریھۃ وسداد ثغر

"یعنی لوگوں نے مجھ کو ہاتھ سے کھودیا۔ اور کیسے بڑے شخص کو کھویا جو لڑائی اور رخنہ بندی کے دن کام آتا۔" امام صاحب ذکر وشغل کی وجہ سے رات کو سوتے کم تھے اس کی نغمہ سنجیاں سنتے۔ اور فرط اخلاق کی وجہ سے کچھ تعارض نہ کرتے ایک رات کوتوال شہر ادھر آنکلا اور اس غریب کو گرفتار کر کے قید خانہ میں بھیج دیا صبح کو امام صاحب نے دوستوں سے تذکرہ کیا کہ رات ہمارے ہمسایہ کی آواز نہیں آئی، لوگوں نے رات کا ماجرا بیان کیا۔ اسی وقت سواری طلب کی، دربار کے کپڑے پہنے اور دارالامارۃ کا قصد کیا، یہ عباسیہ کا عہد حکومت تھا اور عیسیٰ بن موسیٰ کا خلیفہ منصور کا برادرزادہ اور تمام خاندان میں عقل وتدبیر شجاعت اور دلیری کے لحاظ سے ممتاز تھا، کوفہ کا گورنر تھا، لوگوں نے اطلاع کی کہ امام ابوحنیفہ آپ سے ملنے آرہے ہیں۔ اس نے درباریوں کو استقبال کے لیے بھیجا اور حکم دیا کہ دارالامارۃ کے صحن تک امام صاحب کو سواری پر لائیں۔ سواری قریب آئی تو تعظیم کو اٹھا اور نہایت ادب سے لاکر بٹھایا پھر عرض کیا کہ آپ نے کیوں تکلیف کی مجھ کو بلا بھیجتے میں خود حاضر ہوتا۔ تو امام صاحب نے فرمایا ہمارے محلے میں ایک موچی رہتا ہے کوتوال نے اس کو گرفتار کر لیا ہے میں چاہتا ہوں کہ وہ رہا کر دیا جائے۔ عیسیٰ نے اسی وقت داروغہ جیل کو حکم بھیجا اور وہ رہا کر دیا گیا۔ امام صاحب عیسیٰ سے رخصت ہو کر چلے تو موچی بھی ہمرکاب ہوا، امام اس کی طرف مخاطب ہوئے کہ "کیوں ہم نے تم کو ضائع تو نہیں کیا"۔ یہ اس شعر کی طرف اشارہ تھا جس کو وہ ہمیشہ پڑھا کرتا تھا "**اضاعونی وای فتی اضاعوا !**" اس نے عرض کیا "نہیں آپ نے ہمسائیگی کا حق ادا کیا [1] ہے اس کے بعد اس نے

---

[1] یہ واقعہ بہت سی کتابوں میں مختلف طریقہ سے مذکور ہے۔ میں نے کتاب الاغانی وابن خلکان وعقود الجمان کی روایت اختیار کی ہے۔

عیش پرستی سے توبہ کی اور امام صاحب کے حلقۂ درس میں بیٹھنے لگا، رفتہ رفتہ علم فقہ میں مہارت حاصل کی اور فقیہ کے لقب سے ممتاز ہوا

امام صاحب کے والد نے سِن رشد سے پہلے وفات پائی لیکن والدہ مدت تک زندہ رہیں اور امام کو ان کی خدمت گزاری کا کافی موقع ہاتھ آیا۔ وہ مزاج کی شکی تھیں اور جیسا عورتوں کا قاعدہ ہے، واعظوں اور قصہ گویوں کے ساتھ نہایت عقیدت رکھتی تھیں۔ کوفہ میں عمر بن ذر ایک مشہور واعظ تھے ان کے ساتھ خاص عقیدت تھی کوئی مسئلہ پیش آتا تو امام صاحب کو حکم دیتیں کہ عمرو بن ذر سے پوچھ آؤ۔ امام تعمیل ارشاد کے لیے ان کے پاس جا کر مسئلہ پوچھتے وہ عذر کرتے کہ آپ کے سامنے کیا زبان کھول سکتا ہوں۔ فرماتے کہ "والدہ کا یہی حکم ہے اکثر ایسا ہوتا کہ عمرو کا مسئلہ کا جواب نہ آتا تو امام صاحب سے درخواست کرتے "آپ مجھ کو بتا دیں میں اسی کو آپ کے سامنے دہرا دوں"۔

کبھی کبھی اصرار کرتیں کہ میں خود چل کر پوچھوں گی، خچر پر سوار ہوتیں، امام صاحب پا پیادہ ساتھ ہوتے، خود مسئلہ کی صورت بیان کرتیں اور اپنے کانوں سے جواب سن لیتیں تب تسکین ہوتی ایک دفعہ امام صاحب سے پوچھا، یہ صورت پیش آئی ہے مجھ کو کیا کرنا چاہیے۔ امام صاحب نے جواب دیا بولیں تمھاری سند نہیں، زرقہ تصدیق کریں تو مجھ کو اعتبار آئے۔ امام صاحب ان زرقہ کے پاس لے آئے اور مسئلہ کی صورت بیان کی، زرقہ نے کہا کہ آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں آپ کیوں نہیں بتا دیتے۔ امام صاحب نے فرمایا میں نے یہ فتویٰ دیا تھا، زرقہ نے کہا بالکل صحیح ہے، سن کر ان کو تسکین ہوئی اور گھر واپس آئیں، ابن ہبیرہ نے جب امام صاحب کو بلا کر میر منشی مقرر کرنا چاہا اور انکار کے جرم پر درے لگوائے تو اس وقت امام صاحب کی والدہ زندہ تھیں ان کو نہایت صدمہ ہوا! امام صاحب فرمایا کرتے تھے کہ "مجھ کو اپنی تکلیف کا چنداں خیال نہ تھا۔ البتہ یہ رنج ہوتا تھا کہ میری تکلیف کی وجہ سے والدہ کے دل کو صدمہ پہنچتا ہے"

امام صاحب نہایت رقیق القلب تھے اور کسی کو تکلیف اور رنج کی حالت میں دیکھ کر بے تاب ہو جاتے۔

ایک دفعہ مسجد میں بیٹھے تھے کسی نے آ کر کہا کہ فلاں شخص کو ٹھے پر سے گر پڑا۔ زور سے چیخ اٹھے کہ مسجد میں تہلکہ پڑ گیا۔ حلقہ درس چھوڑ کر برہنہ پا دوڑے ہوئے اور اس شخص کے

پر جا کر بہت کچھ غمخواری اور ہمدردی کی، جب تک وہ اچھا نہ ہوا روزانہ صبح کو جاتے اور اس کی تیمارداری کرتے، تاہم اپنے اوپر کوئی مصیبت آن پڑتی تو اس استقلال سے برداشت کرتے کہ لوگوں کو تعجب ہوتا، عمال اور اہل دربار کے ہاتھ سے اکثر ان کو تکلیفیں پہنچیں مگر کبھی ان کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی۔ نہایت مضبوط دل رکھتے تھے اور ضبط و استقلال گویا مایہ خمیر تھا۔

ایک دن جامع مسجد میں درس دے رہے تھے، مستفیدوں اور ارادت مندوں کا مجمع تھا، اتفاقاً چھت سے ایک سانپ گرا، امام کی گود میں آیا، تمام لوگ گھبرا کر بھاگ گئے مگر وہ اسی اطمینان سے بیٹھے رہے، امام مالک کو بھی ایک بار ایسا ہی اتفاق پیش آیا اور وہ ان کی زندگی کا مشہور تاریخی اور دلچسپ واقعہ ہے۔

بات نہایت کم کرتے اور غیر ضروری باتوں میں کبھی دخل نہ دیتے، درس میں بھی معمول تھا کہ شاگرد آپس میں نہایت آزادی سے بحثیں کرتے۔ آپ چپ بیٹھے سنا کرتے۔ جب بحث زیادہ بڑھ جاتی اور کسی بات کا تصفیہ نہ ہوتا تو قول فیصل بیان کر دیتے کہ سب کو تشفی ہو جاتی۔

غیبت سے پرہیز رکھتے، اس نعمت کا شکر ادا کرتے کہ خدا نے میری زبان کو اس آلودگی سے پاک رکھا۔ کسی نے کہا، حضرت لوگ آپ کی شان میں کیا کچھ نہیں کہتے، مگر آپ سے میں نے برائی نہیں سنی۔ فرمایا ذالِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ۔ امام سفیان ثوری سے کسی نے کہا ابو حنیفہ کو میں نے کسی غیبت کرتے نہیں سنا، انہوں نے کہا کہ ابو حنیفہ ایسے بے وقوف نہیں کہ اپنے اعمال صالحہ کو آپ برباد کر دیں۔

قسم کھانی برا جانتے تھے اور اس سے بہت پرہیز کرتے تھے، عہد کر لیا تھا کہ اتفاقاً بھی اس خطا کا مرتکب ہوں گا تو ایک درہم کفارہ دوں گا۔ اتفاق سے بھول کر کسی موقع پر قسم کھالی۔ اس کے بعد عہد کیا کہ اب بجائے درہم کے دینار دوں گا۔

نہایت صاحب ریاضت اور زاہد تھے، ذکر و عبادت میں ان کو مزہ آتا تھا۔ اور بڑے ذوق و خلوص سے ادا کرتے تھے، اس باب میں ان کی شہرت ضرب المثل ہو گئی تھی، علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ ان کی پرہیز گاری اور عبادت کے واقعات تواتر کی حد تک پہنچ گئے ہیں اکثر نماز میں یا قرآن پڑھنے میں رقعت طاری ہوتی اور گھنٹوں رویا کرتے، امام بصری کا بیان ہے کہ ایک دفعہ نماز فجر میں امام ابو حنیفہ کے ساتھ شریک تھا امام نے نماز میں یہ آیت پڑھی۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ

غَافِلاً عَمَّا یَعمَلُ الظّٰلِمُونَ ''یعنی خدا کو ظالموں کے کردار سے بے خبر نہ سمجھنا امام ابوحنیفہ پر ایسی حالت طاری ہوئی کہ سارا بدن کانپنے لگا، زائدہ کہتے ہیں کہ مجھ کو ایک ضروری مسئلہ دریافت کرنا تھا۔ امام ابوحنیفہ کے ساتھ نمازِ عشاء میں شریک ہوا اور منتظر رہا کہ نوافل سے فارغ ہوں تو دریافت کروں وہ قرآن پڑھتے پڑھتے جب اس آیت پر پہنچے وَوَقٰنا عَذَابَ السَّمُوْمِ۔ تو بار بار اس آیت کو پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور وہ یہی پڑھتے رہے۔ ایک بار نماز میں یہ آیت پڑھی۔ ''بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ'' یعنی قیامت گنہگاروں کا وعدہ گاہ ہے اور قیامت سخت مصیبت کی چیز اور ناگوار چیز ہے''۔ اسی آیت میں رات ختم ہوگئی، بار بار پڑھتے تھے اور روتے جاتے تھے۔

یزید بن کمیت ایک مشہور عابد اور امام صاحب کے ہمعصر تھے ان کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ نمازِ عشاء میں امام ابوحنیفہ کے ساتھ شریک تھا۔ امام نماز نے اِذَا زُلْزِلَتْ۔ پڑھی لوگ نماز پڑھ کر چلے گئے، میں ٹھہرا رہا۔ امام ابوحنیفہ کو دیکھا کہ ٹھنڈی سانسیں بھر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں اٹھ آیا کہ ان کے اوقات میں خلل نہ ہو۔ صبح کو مسجد میں گیا تو دیکھا کہ غمزدہ بیٹھے ہیں ڈاڑھی ہاتھ میں ہے اور بڑی رقت سے کہہ رہے ہیں اے وہ جو ذرہ بھر نیکی اور ذرہ بھر بدی دونوں کا بدلہ دے گا اپنے غلام نعمان کو آگ سے بچانا۔

ایک دن بازار میں چلے جا رہے تھے کہ ایک لڑکے کے پاؤں پر پاؤں پڑ گیا، وہ چیخ اٹھا اور کہا کہ تو خدا سے نہیں ڈرتا۔ امام کو غش آ گیا، مسعر بن کدام ساتھ تھے انہوں نے سنبھالا ہوش میں آئے تو پوچھا کہ ایک لڑکے کی بات پر اس قدر بے قرار ہو جانا کیا تھا۔ ''فرمایا کیا عجب ہے کہ اس کی آواز غیبی ہدایت ہو۔

ایک دفعہ حسب معمول دکان پر گئے تو نوکر نے کپڑوں کے تھان نکال کر رکھے اور تفاؤل کے طور پر کہا ''خدا ہم کو جنت دے'' امام صاحب پر رقت طاری ہوئی اور اس قدر روئے کہ شانے تر ہوگئے، نوکر سے کہا کہ دوکان بند کر دو آپ چہرے پر رومال ڈال کر کسی طرف نکل گئے۔ دوسرے دن دکان پر گئے تو نوکر سے کہا کہ بھائی! ہم اس قابل کہاں ہیں کہ جنت کی آرزو کریں یہی بہت ہے کہ عذاب الٰہی میں گرفتار نہ ہوں۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن اگر مجھ سے مواخذہ نہ ہو نہ انعام ملے تو میں بالکل راضی ہوں۔''

ایک دفعہ کسی کو مسئلہ بتا رہے تھے، ایک شخص نے کہا کہ ابوحنیفہ! خدا سے ڈر کر فتویٰ دیا کرو، امام صاحب پر اس کا اس قدر اثر ہوا کہ چہرہ کی رنگت زرد پڑ گئی۔ اس شخص کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا ''بھائی خدا تم کو جزائے خیر دے، اگر مجھ کو یہ یقین نہ ہوتا کہ خدا مجھ سے مواخذہ کرے گا کہ تو جان کر علم کو کیوں چھپایا تو میں ہرگز فتویٰ نہ دیتا۔'' کوئی مسئلہ مشکل آجاتا اور جواب معلوم ہوتا تو متردد ہوتے کہ غالباً میں کسی گناہ کا مرتکب ہوا، یہ اسی کی شامت ہے، پھر وضو کر کے نماز پڑھتے اور استغفار کرتے۔ فضیل بن عیاض جو کہ مشہور صوفی گزرے ہیں، ان سے کسی نے یہ حکایت بیان کی بہت روئے اور کہا کہ ''ابوحنیفہ کے گناہ بہت کم تھے اس لیے ان کا یہ خیال ہوتا تھا، جو لوگ گناہوں میں غرق ہیں اُن پر ہزار آفتیں آتی ہیں اور مطلق خبر نہیں ہوتی کہ غیبی تنبیہ ہے۔''

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد مسجد میں درس دیتے دور دور سے استفتے آئے ہوئے ہوتے ان کے جواب لکھتے، پھر تدوین فقہ کی مجلس منعقد ہوتی بڑے بڑے نامور شاگردوں کا مجمع ہوتا، جو مسائل اتفاق رائے سے طے ہوتے قلمبند کر لیے جاتے، نماز ظہر پڑھ کر گھر آتے گرمیوں میں ہمیشہ ظہر کے بعد سو رہتے، نماز عصر کے بعد کچھ دیر تک درس و تعلیم کا مشغلہ رہتا باقی وقت دوستوں کے ملنے ملانے۔ بیماروں کی عیادت، ماتم پرسی، غریبوں کی خبر گیری میں صرف ہوتا، مغرب کے بعد پھر درس کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور عشاء تک رہتا۔ نماز عشاء پڑھ کر عبادت میں مشغول ہوتے اور اکثر رات بھر نہ سوتے۔ جاڑوں میں مغرب کے بعد مسجد ہی میں سو رہتے اور قریباً ۱۰ بجے اُٹھ کر نمازِ عشا پڑھتے، پھر تمام رات تہجد اور وظائف میں گزرتی، کبھی کبھی دکان پر بیٹھتے اور وہیں یہ تمام مشاغل انجام پاتے۔

ذہانت اور طباعی، فتوی اور مناظرات، نصائح اور دلپذیر باتیں

جو چیز امام صاحب کی قوت ایجاد، جدت طبع، دقت نظر، وسعت معلومات، غرض ان کے تمام کمالات علمی کا آئینہ ہے جس کی ترتیب و تدوین میں ان کو وہ پایہ حاصل ہے جو ارسطو کو منطق اور اقلیدس کو ہندسہ میں تھا، لیکن اس پر تفصیلی بحث کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب درکار

ہے، اسی ضرورت سے ہم نے اپنی کتاب کا دوسرا حصہ اس بحث کے لیے خاص کر دیا ہے اس موقع پر صرف وہ واقعات لکھتے ہیں جو امام صاحب کی علمی تاریخ کے عام واقعات ہیں لیکن غور سے دیکھو تو وہ بھی بجائے خود اصول ہیں جن پر سینکڑوں مسائل کی بنیاد قائم ہے۔

اس مقام پر یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مناظرات اور نکتہ آفرینیوں کے متعلق بہت بے سروپا افسانے شہرت پکڑ گئے اور طرہ یہ کہ بعض مشہور مصنفوں نے بغیر تحقیق وتنقید کے ان کو اپنی تالیفات میں نقل کر دیا۔ جس سے عوام کو اپنے خیالات کے لیے ایک دستاویز ہاتھ آ گئی یہ ایک عام قاعدہ ہے جو شخص کسی فن میں کمال کے ساتھ شہرت عامہ حاصل کرتا ہے اس کی نسبت اچھی یا بری سینکڑوں روایتیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں اور بعض حالتوں میں اس قدر عام زبانوں پر قبضہ کر لیتی ہیں کہ خواص تک کو ان پر تواتر کا دھوکا ہوتا ہے لطف یہ کہ معتقدین جوش اعتقاد میں ایسی باتیں کر جاتے ہیں جن کو وہ مدح سمجھتے ہیں اور دراصل وہ مذموم ہوتی ہیں۔ اسی طرح مخالف عیب ومنقصت کی مثالیں پیش کرتا ہے حالانکہ غور سے دیکھیے تو ان واقعات سے بجائے اس کے کہ اس شخص کی برائی ثابت ہو، مدح کا پہلو نکلتا ہے امام ابوحنیفہ بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ بعض مصنفوں نے ان کی ذہانت اور طباعی کے ذیل میں بہت سے ایسے قصے لکھ دیے ہیں جن کو خوانخواستہ ہم سچ تسلیم کر لیں تو عیاذاً باللہ امام صاحب کو حیلہ جو چالاک اور متفنی سخن ساز ماننا پڑے گا لیکن وہ روایتیں تاریخی اصول سے ثابت نہیں اور اسی وجہ سے اہل تحقیق خصوصاً محدثین نے ان کے لکھنے سے ہمیشہ پرہیز کیا ہے ہم بھی ان کو قلم انداز کرتے ہیں اور ان ہی روایتوں پر اکتفا کرتے ہیں جو بظن غالب ثابت اور صحیح ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ امام صاحب کو اور ائمہ کی نسبت مناظرہ اور مباحثہ کے مواقع زیادہ پیش آئے۔ انہوں نے علوم شرعیہ کے متعلق بہت سے ایسے نکتے ایجاد کیے تھے جو عام طبیعتوں کی دسترس سے باہر تھے اس لیے ظاہر بینوں کا ایک بڑا گروہ جن میں بعض مقدس اور سادہ دل بھی شامل تھے ان کا مخالف ہو گیا تھا اور ہمیشہ ان سے بحث ومناظرہ کے لیے تیار رہتا تھا امام صاحب کو بھی مجبوراً ان کے شبہات رفع کرنے پڑتے تھے اس اتفاقی سبب نے مناظرہ اور مباحثہ کا ایک وسیع سلسلہ قائم کر دیا تھا لیکن امام صاحب کے مناظرات اسی پر محدود نہیں۔ مناظرہ اس وقت درس کا ایک خاص طریقہ تھا اور امام صاحب نے اکثر اساتذہ سے اسی طریقہ پر تعلیم پائی تھی۔

عیون الحدائق کے مصنف نے اس کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے شعبی طاؤس، عطا سے مناظرات کئے، یہ لوگ امام صاحب کے اساتذہ خاص ہیں اور وہ ان لوگوں کا نہایت ادب کرتے تھے، اس مناظرہ سے مقصود ہی درس کا مخصوص طریقہ ہے جو اس عہد میں عموماً مروج تھا[1]۔

امام اوزاعی جو کہ اقلیم شام کے امام اور فقہ میں مذہب مستقل کے بانی تھے مکہ معظمہ میں امام ابوحنیفہ سے ملے اور کہا کہ ''عراق والوں پر نہایت تعجب ہے کہ رکوع میں اور رکوع سے سر اٹھانے کے وقت رفع یدین نہیں کرتے، حالانکہ میں نے زہری سے، انہوں نے سالم بن عبداللہ سے انہوں نے عبداللہ بن عمر سے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان موقعوں پر رفع یدین کرتے تھے۔'' امام ابوحنیفہ نے اس کے مقابلے میں حماد، ابراہیم نخعی، علقمہ، عبداللہ بن مسعودؓ کے سلسلے سے حدیث روایت کی کہ آنحضرت صلعم ان موقعوں پر رفع یدین نہیں فرماتے تھے'' امام اوزاعی نے کہا ''سبحان اللہ میں تو زہری، سالم عبداللہؓ کے ذریعہ سے حدیث بیان کرتا ہوں، آپ اس کے مقابلے میں حماد نخعی، علقمہ کا نام لیتے ہیں، ابوحنیفہ نے کہا ''میرے رواۃ آپ کے رواۃ سے زیادہ فقیہ ہیں اور عبداللہ بن مسعود کا رتبہ تو معلوم ہی ہے اس لئے ان کی روایت کو ترجیح ہے۔

امام رازی نے اس مناظرہ کو مناقب الشافعی میں نقل کیا ہے اور گو واقعہ کی صحت سے انکار نہیں کر سکتے تاہم یہ نکتہ چینی کی ہے کہ حسی واقعات میں تفقہ کو کیا دخل ہے۔

اس اصول پر مفصل بحث کتاب کے دوسرے حصے میں ہوگی، یہاں امام رازی کے حوالہ سے یہ مقصود ہے کہ اصل واقعہ صحیح ہے جس سے شافعیوں کو بھی انکار نہیں [2]۔ اس مسئلہ کے متعلق امام محمد نے کتاب الحج میں ایک لطیف بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہماری روایت عبداللہ بن مسعودؓ تک منتہی ہوتی ہے اور فریق مخالف کی عبداللہ بن عمرؓ تک، اس لئے بحث کا تمام تر مدار اس پر آجاتا ہے کہ ان دونوں میں کسی کی روایت ترجیح کے قابل ہے۔ عبداللہ بن مسعود آنحضرتؐ کے

---

[1] امام صاحب کے بعض مناظرات مؤرخ خطیب نے تاریخ بغداد میں اور امام رازی نے اس آیت وعلم ادم الاسماء کلھا کی تفسیر میں لکھا ہے اور عقود الجمان میں زیادہ استقصاء کیا ہے۔ ان کے علاوہ اور کتابوں میں بھی جستہ جستہ مذکور ہیں

[2] علامہ ابن الہمام نے اس مناظرہ کو فتح القدیر میں ذکر کیا ہے اور حجۃ اللہ البالغہ کے مختلف مقامات سے اس کے اشارے پائے جاتے ہیں۔

زمانے میں پوری عمر کو پہنچ چکے تھے اور جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے۔ جماعت کی صف اول میں جگہ پاتے تھے برخلاف اس کے عبداللہ بن عمر کا محض آغاز تھا اور ان کو دوسری تیسری صف میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ اس لیے آنحضرت صلعم کے حرکات وسکنات سے واقف ہونے کے جو مواقع عبداللہ بن مسعودؓ کو مل سکے، عبداللہ ابن عمر کو کیسے حاصل ہو سکتے تھے۔ امام محمدؒ کا یہ طرز استدلال حقیقت میں اصول درایت پر مبنی ہے، امام ابوحنیفہ صاحب نے اپنی تقریر میں عبداللہ بن مسعود کی عظمت وشان کا جو ذکر کیا اس میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

ایک دن بہت سے لوگ جمع ہو کر آئے کہ قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں امام سے گفتگو کریں۔ امام صاحب نے کہا اتنے آدمیوں میں تنہا میں کیوں کر بحث کر سکتا ہوں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اس مجمع میں سے کسی کو انتخاب کرلیں۔ جو سب کی طرف سے اس خدمت کا کفیل ہو اور اس کی تقریر پورے مجمع کی تقریر سمجھی جائے''۔ لوگوں نے منظور کیا۔ امام صاحب نے کہا، آپ نے یہ تسلیم کیا تو بحث کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ آپ نے جس طرح ایک شخص کو سب کی طرف سے بحث کا مختار کر دیا اسی طرح امام نماز بھی تمام مقتدیوں کی طرف سے قرأت کا کفیل ہے۔''

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ امام نے ایک شرعی مسئلہ کو صرف عقلی طور پر طے کر دیا بلکہ حقیقت میں یہ اس حدیث کی تشریح ہے جس کو خود امام صاحب نے بسند صحیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا ہے، **من صلی خلف الامام فقرأۃ الامام قرأۃ لہٗ**۔ یعنی جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرأت بھی اس کی قرأت ہے۔''

یہ امام صاحب کے پیچھے مختصات میں ہے وہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو ایسے عام فہم طریقہ سے سمجھا دیتے تھے کہ مخاطب کے ذہن نشین ہو جاتا تھا اور بحث نہایت جلد اور آسانی سے طے ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ ضحاک خارجی جو خارجیوں کا ایک مشہور سردار تھا اور بنوامیہ کے زمانہ میں کوفہ پر قابض ہو گیا تھا امام صاحب کے پاس آیا اور تلوار دکھا کر کہا کہ توبہ کرو۔ انہوں نے پوچھا کہ کس بات سے۔ ضحاک نے کہا کہ تمہارا عقیدہ ہے کہ علی (رضی اللہ عنہ نے) معاویہؓ کے جھگڑے میں ثالث کو تسلیم کر لیا تھا۔ حالانکہ جب وہ حق پر تھے تو ثالث ماننے کے کیا معنے'' امام صاحب نے فرمایا کہ اگر میرا قتل مقصود ہے تو اور بات ہے ورنہ اگر تحقیق حق منظور ہے تو مجھ کو تقریر کی اجازت دو۔ ضحاک نے کہا کہ میں بھی مناظرہ ہی چاہتا ہوں امام صاحب نے فرمایا کہ اگر بحث آپس میں

طے نہ ہوتو کیا علاج ؟ ضحاک نے کہا ہم دونوں ایک شخص کو منصف قرار دیں چنانچہ ضحاک ہی کے ساتھیوں میں سے ایک شخص انتخاب کیا گیا کہ دونوں فریق کی صحت و غلطی کا تصفیہ کرے، امام صاحب نے فرمایا ''یہی تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی کیا تھا پھران پر کیا الزام ہے'' ضحاک دم بخود ہو گیا اور چپکا اٹھ کر چلا گیا۔

اسی ضحاک نے ایک بار کوفہ پہنچ کر قتل عام کا حکم دے دیا، امام صاحب کو خبر ہوئی دوڑے گئے اور پوچھا کہ آخر ان لوگوں نے کیا جرم کیا ہے'' اس نے کہا ''یہ سب مرتد ہو گئے ہیں'' امام صاحب نے فرمایا۔ ''پہلے ان لوگوں کا کچھ اور مذہب تھا یا ہمیشہ سے یہی مذہب رکھتے تھے جواب رکھتے ہیں۔'' ضحاک نے کہا، کیا کہا پھر کہنا۔ امام صاحب نے زیادہ وضاحت سے بیان کیا۔ ضحاک نے کہا کہ بے شبہ میری خطا تھی۔ اسی وقت حکم دیا کہ ''تلواریں نیام میں کر لی جائیں۔''

قتادہ بصری جن کا مختصر حال امام صاحب کے اساتذہ کے ذکر میں ہم لکھ آئے ہیں کوفہ میں آئے اور اشتہار دے دیا کہ مسائل فقہ میں جس کو جو پوچھنا ہو پوچھے میں ہر مسئلہ کا جواب دوں گا۔ چونکہ وہ مشہور محدث اور امام تھے بڑا مجمع ہوا، جوق جوق لوگ آتے تھے اور مسئلے دریافت کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ بھی موجود تھے، کھڑے ہو کر پوچھا کہ ''ایک شخص سفر میں گیا، برس دو برس کے بعد اس کے مرنے کی خبر آئی، اس کی بیوی نے دوسرا نکاح کر لیا اور اس سے اولاد ہوئی چند روز کے بعد وہ شخص واپس آیا۔ اولاد کی نسبت اس کو انکار ہے کہ میری صلب سے نہیں ہے، زوج ثانی دعویٰ کرتا ہے کہ میری ہے تو آیا دونوں شخص اس عورت پر زنا کا الزام لگاتے ہیں یا صرف وہ شخص جو ولدیت سے انکار کرتا ہے۔''؟ قتادہ نے کہا ''یہ صورت پیش بھی آئی ہے؟ امام نے کہا کہ نہیں۔ لیکن علماء کو پہلے سے تیار رہنا چاہیے کہ وقت پر تردد نہ ہو، قتادہ کو فقہ سے زیادہ تفسیر میں دعویٰ تھا بولے کہ ان مسائل کو رہنے دو۔ تفسیر کے متعلق جو پوچھنا ہو پوچھو۔ امام ابو حنیفہ نے کہا اس آیت کے کیا معنی **قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتَابِ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ** ۔ یہ وہ قصہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے درباریوں سے بلقیس کا تخت لانے کی فرمائش کی اور ایک شخص نے جو غالباً آصف بن برخیا حضرت سلیمانؑ کے وزیر تھے دعویٰ کیا کہ میں چشم زدن میں لا دوں گا۔ اہل کتاب کی روایت ہے کہ آصف بن برخیا اسم اعظم جانتے تھے جس

کی تاثیر سے ایک دم میں شام سے یمن پہنچ کر تخت اٹھالائے، یہی روایت عام مسلمانوں میں پھیل گئی تھی اور اسی کے مطابق اس آیت کا مطلب لگایا جاتا تھا، قتادہ نے بھی یہی معنی بیان کئے، امام ابو حنیفہؒ نے کہا حضرت سلیمان خود بھی اسم اعظم جانتے تھے یا نہیں؟ قتادہ نے کہا نہیں، امام صاحب نے کہا کیا آپ اس بات کو جائز رکھتے ہیں کہ نبی کے زمانے میں ایسا شخص موجود ہو جو خود نبی نہ ہو اور نبی سے زیادہ علم رکھتا ہو، قتادہ کچھ جواب نہ دے سکے۔ اور کہا کہ عقائد کے متعلق پوچھو! امام صاحب نے کہا'' آپ مومن ہیں۔ اکثر محدثین اپنے آپ کو مومن کہتے ہوئے ڈرتے تھے اور اس کو احتیاط میں داخل سمجھتے تھے، حسن بصری سے ایک شخص نے یہی سوال کیا۔ جس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ انشاء اللہ'' پوچھنے والے نے کہا'' انشاء اللہ کا کیا محل ہے فرمایا میں اپنے تئیں مومن تو کہہ دوں مگر ڈرتا ہوں وہ خدا یہ نہ کہہ دے کہ تو جھوٹ کہتا ہے''۔ قتادہ نے بھی امام ابوحنیفہ کے سوال کا یہی جواب دیا۔

لیکن حقیقت میں یہ ایک قسم کی وہم پرستی ہے، ایمان اعتقاد کا نام ہے جو شخص خدا اور رسول پر اعتقاد رکھتا ہے وہ قطعاً مومن ہے اور اس کو سمجھنا چاہیے کہ میں مومن ہوں البتہ اگر اس میں شک ہے تو قطعی کافر ہے اور پھر انشاء اللہ کہنا بھی بیکار ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اس عام غلطی کو مٹانا چاہا قتادہ سے پوچھا کہ آپ نے یہ قید کیوں لگائی؟ انھوں نے کہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا کہ ''مجھ کو امید ہے کہ خدا قیامت کے دن میرے گناہوں کو معاف کر دے گا'' امام ابوحنیفہ نے کہا خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے جب یہ سوال کیا کہ **اولم تو من** تو انہوں نے جواب میں بلیٰ کہا تھا۔ یعنی ہاں میں مومن ہوں، آپ نے حضرت ابراہیمؑ کے اس قول کی تقلید کیوں نہ کی، قتادہ ناراض ہو کر اٹھے اور گھر میں چلے گئے۔[1]

یحییٰ بن سعید انصاری کوفہ کے قاضی تھے اور منصور عباسی کے دربار میں بڑا جاہ واعتبار رکھتے تھے تاہم کوفہ میں ان کا وہ اثر قائم نہ ہو سکتا تھا جو امام ابوحنیفہ صاحب کا تھا، اس پر ان کو تعجب ہوتا تھا اور لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ کوفہ والے بھی عجیب سادہ دل ہیں تمام شہر ایک شخص کے اشاروں پر حرکت کرتا ہے۔'' امام ابوحنیفہ نے ابو یوسف و زفر اور چند ممتاز شاگردوں کو بھیجا کہ

---

[1] اس مناظرہ کو خطیب نے تاریخ بغداد میں اور حافظ ابوالمحاسن نے عقود الجمان میں کسی قدر اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے

قاضی یحییٰ سے مناظرہ کریں۔ امام ابو یوسف نے تقریر شروع کی، مسئلہ یہ تھا کہ اگر ایک غلام دو شخصوں میں مشترک ہو اور صرف ایک شخص آزاد کرنا چاہے تو کرسکتا ہے یا نہیں۔ قاضی یحییٰ نے کہا "نہیں کرسکتا، کیوں کہ حدیث میں آیا ہے **لاضرر و لا ضرار** "یعنی وہ کام جس سے کسی شخص کو ضرر پہنچے جائز نہیں"۔ صورتِ بحث میں چونکہ دوسرے شریک کا ضرر ہے۔ اس لیے شریک اول ایسے فعل کا مجاز نہیں ہوسکتا" امام یوسف نے کہا کہ اگر دوسرا شریک آزاد کردے قاضی یحییٰ بولے تب جائز ہے اور غلام آزاد ہو جائے گا"۔ امام یوسف نے کہا کہ "آپ نے خود اپنے قول کی مخالفت کی۔ کیونکہ آپ کے نزدیک ایک شریک کے آزاد کرنے سے غلام آزاد نہیں ہوتا۔ یعنی اس طرح غلام کا غلام رہتا ہے، صورت مذکور میں جب ایک شریک نے آزاد کیا تو آپ کے نزدیک اس کا یہ فعل بالکل بے اثر ہے، یعنی وہ اسی طرح غلام باقی رہا جیسا پہلے تھا۔ اب صرف دوسرے شریک کے آزاد کرنے سے کیوں کر آزاد ہوسکتا ہے۔

محمد بن عبدالرحمٰن جو زیادہ تر ابن ابی لیلیٰ کے لقب سے مشہور ہیں بڑے مشہور فقیہ اور صاحب الرائے تھے ۳۳ برس کوفہ میں منصب قضا پر مامور رہے امام ابو حنیفہ اور ان میں کسی قدر شکر رنجی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ فیصلوں میں وہ غلطی کرتے تھے تو امام صاحب اس کی اصلاح کرنی چاہتے تھے، یہ ان کو ناگوار معلوم ہوتا تھا لیکن امام صاحب اظہار حق پر مجبور تھے، قاضیصاحب مسجد میں بیٹھ کر مقدمات فیصل کیا کرتے تھے۔ ایک دن کام سے فارغ ہو کر مجلس قضا سے اٹھے راہ میں ایک عورت کو دیکھا کہ کسی سے جھگڑ رہی ہے، کھڑے ہوگئے اثنائے گفتگو میں عورت نے اس شخص کو یا ابن الزانیتین کہہ دیا یعنی "اے زانی اور زانیہ کے بیٹے"! قاضی صاحب نے حکم دیا کہ عورت گرفتار کر لی جائے پھر مجلس قضا میں واپس آئے اور حکم دیا کہ عورت کو کھڑا کر کے درے لگائیں اور دو حد ماریں، امام ابو حنیفہ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی فرمایا کہ قاضی صاحب نے اس فیصلہ میں چند غلطیاں کیں۔ مجلس قضا سے اٹھ کر واپس آئے اور دوبارہ اجلاس کیا۔ یہ آئین عدالت کے خلاف ہے، مسجد[2] میں حد مارنے کا حکم دیا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے۔ عورت[3] کو بٹھا کر حد مارنی چاہیے قاضی صاحب نے اس کے خلاف کیا۔ ایک[4] لفظ سے ایک ہی حد لازم آتی ہے اور دو حدیں لازم بھی آئیں تو ایک ساتھ دونوں کا نفاذ نہیں ہوسکتا۔ ایک حد کے بعد مجرم کو چھوڑ دینا چاہیے کہ زخم بالکل بھر جائیں پھر دوسری حد کی تعمیل

ہو سکتی ہے جس کو گالی دی گئی اس نے جب دعویٰ نہیں کیا تو قاضی صاحب کو مقدمہ قائم کرنے کا کیا اختیار تھا''۔ قاضی ابن ابی لیلیٰ نہایت برہم ہوئے اور گورنر کوفہ سے جا کر شکایت کی کہ ابوحنیفہ نے مجھ کو تنگ کر رکھا ہے۔ گورنر نے حکم بھیج دیا کہ ابوحنیفہ فتوے نہ دینے پائیں۔ امام صاحب اگرچہ حق کے خلاف کسی حاکم یا امیر کے حکم کی پرواہ نہیں کرتے تھے تاہم چونکہ فتوے دینا فرض کفایہ ہے اور کوفہ میں بہت سے علماء موجود تھے اس لیے حاکم وقت کی اطاعت کو مقدم رکھا اور بغیر کسی عذر کے حکم کی تعمیل کی۔

ایک دن گھر میں بیٹھے تھے۔ ان کی لڑکی نے مسئلہ پوچھا کہ میں آج روزے سے ہوں دانتوں سے خون نکلا اور تھوک کے ساتھ گلے سے اتر گیا روزہ جاتا رہا یا باقی ہے؟ امام صاحب نے فرمایا کہ جانِ پدر اپنے بھائی حماد سے پوچھ، میں تو فتویٰ دینے سے منع کر دیا گیا ہوں''۔ مؤرخ ابن خلکان نے اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ''اطاعت حکم اور امانت کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے[1]۔ چند روز کے بعد گورنر کو اتفاق سے فقہی مسائل میں مشکلات پیش آئیں اور امام ابوحنیفہ کی طرف رجوع کرنا پڑا جس کی وجہ سے امام صاحب کو پھر فتوے دینے کی عام اجازت مل گئی۔

امام صاحب کے مناظرات میں کہیں کہیں ہم اس ادعا اور جوش مقابلہ کا اثر پاتے ہیں جو بظاہر ان کی تواضع اور بے نفسی کے خلاف ہے لیکن یہ انسانی جذبات ہیں جن سے کوئی شخص بری نہیں ہو سکتا۔ ہم نے امام شافعی، امام مالک، امام بخاری، امام مسلم اور بڑے بڑے ائمہ کے مناظرات کتابوں میں پڑھے ہیں ان سے اس سے زیادہ ادعا اور حوصلہ مندی کا زور پایا جاتا ہے اور سچ یہ ہے کہ اگر اس قسم کی باتیں بزرگوں کے حالات میں مذکور نہ ہوتیں تو ہم کو شبہ ہوتا کہ تذکرہ نویسوں نے ان بزرگوں کی اصلی تصویر نہیں دکھائی ہے بلکہ اپنی خوش اعتقادیوں کا خاکہ کھینچا ہے۔ ایک حکیم نے نہایت سچ کہا ہے، کہ کسی نامور یا مقتدا کے حالات لکھو تو اس کے خصائل بھی ضرور دکھاؤ جن میں انسانی فطرت کی جھلک نظر آتی ہو۔ اس سے لوگوں کو اچھے کاموں میں ان کی تقلید کی خواہش پیدا ہو گی بخلاف اس کے اگر بالکل فرشتہ بنا کر پیش کرو گے تو لوگ شاید ان کی پرستش کرنے پر آمادہ ہو جائیں لیکن ان کی حرص کرنے کا خیال ہرگز نہ پیدا ہو گا۔ وہ سمجھیں گے کہ یہ شخص دائرہ انسانی سے باہر تھا ہم انسان ہو کر کیوں کر اس کی تقلید کر سکتے ہیں۔

---

[1] ابن خلکان۔ ترجمہ محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ ۱۲

ایک دن حسن اتفاق سے امام سفیان ثوری، قاضی ابن ابی لیلیٰ، شریک، امام ابوحنیفہ ایک مجلس میں جمع تھے، شائقین علم کو اس سے عمدہ کیا موقع مل سکتا تھا۔ ایک شخص نے آ کر مسئلہ پوچھا کہ چند آدمی ایک جگہ مجتمع تھے دفعتہً ایک سانپ نکلا اور ایک شخص کے بدن پر چڑھنے لگا، اس نے گھبرا کر پھینک دیا۔ وہ دوسرے شخص پر جا گرا اس نے بھی اضطراب میں ایسا ہی کیا، یوں ہی ایک دوسرے پر پھینکتے رہے یہاں تک کہ اخیر شخص کو اس نے کاٹا اور وہ مر گیا۔ دیت کس پر لازم آئے گی۔'' یہ فقہ کا ایک دقیق مسئلہ تھا۔ سب کو تامل ہوا، کسی نے کہا سب کو دیت دینی ہوگی۔ بعضوں نے کہا صرف پہلا شخص ذمہ دار ہوگا۔ سب کے سب مختلف الرائے تھے اور باوجود بحث کے کچھ تصفیہ نہ ہوتا تھا۔ امام ابوحنیفہ چپ تھے اور مسکراتے جاتے تھے، آخر سب نے ان کی طرف خطاب کیا کہ آپ بھی تو اپنا خیال ظاہر کیجئے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا جب پہلے شخص نے دوسرے پر پھینکا اور وہ محفوظ رہا تو پہلا شخص بری الذمہ ہو چکا تھا۔ اسی طرح دوسرا اور تیسرا بھی بحث اگر ہے تو صرف اخیر شخص کی نسبت ہے۔ اس کی دو حالتیں ہیں اگر اُس کے پھینکنے کے ساتھ ہی سانپ نے کاٹا تو خود اس کی غفلت ہے کہ اس نے اپنی حفاظت میں جلدی اور تیز دستی کیوں نہ کی۔ اس رائے سے سب نے اتفاق کیا اور امام صاحب کی جودت طبع کی تحسین کی۔

رائے و تدبیر عقل و فراست، ذہانت و طباعی امام صاحب کے وہ مشہور اوصاف ہیں جن کو موافق و مخالف سب نے تسلیم کیا ہے۔ محمد انصاری کہا کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہؒ کی ایک ایک حرکت یہاں تک کہ بات چیت اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں دانشمندی کا اثر پایا جاتا ہے۔ علی بن عاصم کا قول تھا کہ اگر آدھی دنیا کی عقل ایک پلہ میں اور ابوحنیفہ کی عقل دوسرے پلہ میں رکھی جاتی تو ابوحنیفہ کا پلہ بھاری رہتا۔ خارجہ بن مصعب کہا کرتے تھے کہ میں کم و پیش ایک ہزار عالموں سے ملا ہوں جن میں عاقل صرف تین چار شخص دیکھے ان میں ایک ابوحنیفہ تھے۔

ہمارے تذکروں اور رجال کی کتابوں میں علماء کے وہ اوصاف جن کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا جاتا ہے تیزیٔ ذہن، قوت حافظہ، بے نیازی تواضع قناعت، زہد، اتقا غرض اس قسم کے اوصاف ہوتے ہیں لیکن عقل و رائے، فراست و تدبر کا ذکر تک نہیں آتا گویا یہ باتیں دنیا داروں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسی بات کو علامہ ابن خلدون نے اس پیرایہ میں لکھا ہے کہ علماء کا گروہ انتظام اور ریاست سے بالکل مناسبت نہیں رکھتا اور یہ بالکل سچ ہے، حالانکہ اگر سچ پوچھیے تو

علماء میں ان اوصاف کی زیادہ ضرورت ہے۔ اسلام بخلاف اور مذہبوں کے دین کے ساتھ دنیاوی انتظامات کا بھی متقنن ہے۔ خلفائے اولین کے حالات پڑھو، سیاست اور انتظام ملکی کے لحاظ سے تمام دنیا کے سلاطین اور فرمارواؤں میں کون شخص ان کا ہمسر کہا جا سکتا ہے۔ بے شبہ اس خصوصیت کے اعتبار سے امام ابوحنیفہ تمام فرقہ علماء میں ممتاز ہیں کہ وہ مذہبی امور کے ساتھ دینوی ضرورتوں کے بھی اندازہ دان تھے۔ یہی بات ہے کہ ان کا مذہب سلطنت وحکومت کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اسلام میں سلطنت وحکومت کے جو بڑے بڑے سلسلے قائم ہوئے مذہباً اکثر حنفی ہی تھے۔

امام ابوحنیفہ اگرچہ شاہی تعلقات سے آزاد رہے لیکن قوم اور ملک کے ساتھ ان کے جو تعلقات تھے وہ خود ایک ملکی حیثیت رکھتے تھے۔ جس کے فرائض کو انہوں نے اس دانائی اور ہوش مندی کے ساتھ انجام دیا جو ایک مدبر سلطنت کے شایان تھا وہ اپنے ہمعصروں کی طرح اپنے تلامذہ کو یہ نہیں سکھاتے تھے کہ زندگی کی ضروریات میں امیروں اور رئیسوں کی فیاضیوں کا منہ تکتے رہیں وہ خود کسی وقت دست نگر نہیں ہوئے اور شاگردوں کو بھی اسی کی تعلیم دی ہم نے ان کے شاگردوں کی مفصل فہرست دیکھی ہے۔ ان میں اکثر لوگ ایسے ہیں جو حلقہ درس سے اٹھ کر ملکی عہدوں پر پہنچے اور نہایت دیانت اور قابلیت سے اپنی اپنی خدمتوں کا انجام دیا۔ قاضی ابو یوسف صاحب جو ہارون الرشید کے عہد میں صیغۂ قضاء کے وزیر تھے اور جن کے حسنِ تدبیر اور انتظام نے اس صیغہ کو اس قدر وسیع، باقاعدہ مرتب کر دیا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور زمانہ مابعد بھی اس سے بڑھ کر نہ ہو سکا، یہ امام ابوحنیفہ ہی کی صحبت کا فیض تھا۔

یہ ضرور ہے کہ ملکی تعلقات کے ساتھ مذہب اور اخلاق کے فرائض کو سنبھالنا نہایت مشکل ہوتا ہے لیکن امام صاحب اس سے بے خبر نہ تھے وہ ہمیشہ شاگردوں کو ایسی ہدایتیں کرتے تھے جن کی پابندی سے دنیا و دین دونوں حاصل ہوں۔ جو اس آیت کی تفسیر ہے۔ اٰتِنَا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنه۔ قاضی ابو یوسف کو امام صاحب کی زندگی میں اگرچہ دربار سے کوئی تعلق پیدا نہیں ہوا تھا تاہم ان کی قابلیت اور امام صاحب کی تعلیم نے جو لیاقت ان میں پیدا کر دی تھی اس کے جوہر صاف نظر آتے تھے اسی لحاظ سے امام صاحب نے ان کو کچھ ہدائتیں لکھ کر دیں جو تمام مہمات دینی و دنیاوی کے لیے دستور العمل تھیں۔ یہ[1] تحریر کتابوں میں منقول

---

[1] الاشباہ والنظائر کے اخیر میں یہ وصیت بتمامہا مذکور ہے اور ہم نے اسی سے استنباط کیا ہے

ہے۔افسوس ہے کہ تطویل کے لحاظ سے ہم کو بتمامہا نہیں نقل کر سکتے، تاہم موقع و مقام کی رعایت سے اس کا انتخاب دکھانا ضرور ہے۔

اس تحریر میں پہلے سلطان وقت کے تعلقات کا ذکر ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ بادشاہ کے پاس بہت کم آمدورفت رکھنا اس سے ہر وقت اس طرح پر خطر رہنا جیسے انسان آگ سے احتیاط رکھتا ہے جب تک کوئی خاص ضرورت نہ ہو دربار میں نہ جانا کہ اپنا اعزاز و وقار قائم رہے اگر اتفاق سے دربار میں ایسے لوگ موجود ہوں جن سے تم کو واقفیت نہ ہو تو اور بھی پرہیز کرنا۔ کیونکہ جب ان کا رتبہ معلوم نہیں تو ممکن ہے مخاطبت اور گفتگو میں ان سے جو برتاؤ کیا جائے ان کی شان کے مناسب نہ ہو۔ وہ اگر تم سے زیادہ بلند مرتبہ ہیں۔ اور تم نے اس کا لحاظ نہیں کیا تو بے تمیزی سمجھی جائے گی اگر معمولی آدمی ہیں اور تم نے زیادہ تعظیم و تکریم کی تو بادشاہ کی آنکھ میں تمھاری ذلت ہوگی، بادشاہ اگر تم کو عہدۂ قضا پر مقرر کرنا چاہے تو پہلے دریافت کرنا کہ وہ تمھارے طریقۂ اجتہاد سے موافق ہے یا نہیں ایسا نہ ہو کہ سلطنت کے دباؤ سے تم کو اپنی رائے کے خلاف عمل کرنا پڑے، جس عہدہ اور خدمت کی تم میں قابلیت نہ ہوں اس کو ہرگز قبول نہ کرنا۔"

ان ہدایتوں میں اگرچہ بادشاہ کی حرمت و توقیر کی بہت تاکید ہے لیکن اظہار حق کے موقع پر پوری آزادی سے کام لیا ہے، چنانچہ اخیر میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص شریعت میں کسی بدعت کا موجد ہو تو علانیہ اس کی غلطی کا اظہار کرنا تاکہ اور لوگوں کو اس کی تقلید کی جرأت نہ ہو اس با کی کچھ پروانہ کرنا کہ وہ شخص جاہ و حکومت رکھتا ہے، کیونکہ اظہار حق میں خدا تمھارا مددگار ہوگا اور وہ اپنے دین کا آپ محافظ و حامی ہے۔ خود بادشاہ سے اگر کوئی نامناسب حرکت صادر ہو تو صاف کہہ دینا کہ گو میں عہدۂ قضاء کے لحاظ سے آپ کا مطیع ہوں تاہم آپ کی غلطی پر مطلع کر دینا میرا فرض ہے۔ پھر بھی نہ مانے تو تنہائی میں سمجھانا کہ آپ کا یہ فعل قرآن مجید اور احادیث نبوی کے خلاف ہے، اگر سمجھ گیا تو خیر ورنہ خدا سے دعا کرنا کہ اس کے شہر سے تم کو محفوظ رکھے۔

زندگی کے معمولی کاروبار کے متعلق بھی نہایت عمدہ ہدایتیں کی ہیں چنانچہ تحریر فرماتے ہیں کہ تحصیل علم کو سب پر مقدم رکھنا۔ اس سے فراغت ہو چکے تو جائز ذریعوں سے دولت حاصل کرنا۔ کیونکہ ایک وقت میں علم و دولت دونوں کی تحصیل نہیں ہو سکتی پھر نکاح کرنا۔ لیکن اس وقت جب یقین ہو کر اہل و عیال کی تمام ذمہ داریاں اٹھا سکو گے ایسی عورت سے شادی نہ کرنا جو

دوسرے شوہر سے اولاد رکھتی ہو۔ عام آدمیوں اور خصوصاً دولت مندوں سے کم میل جول رکھ
ورنہ ان کو گمان ہوگا کہ تم اس سے کچھ توقع رکھتے ہو۔ اور اس خیال سے وہ رشوت دینے پر آمادہ
ہوں گے، بازار میں جانا، دکان پر بیٹھنا، راستہ یا مسجد میں کوئی چیز کھالینی، سقایات یا سقاؤں کے
ہاتھ سے پانی پی لینا، ان باتوں سے نہایت احتراز رہے۔ کوئی شخص مسئلہ پوچھے تو صرف سوال کا
جواب دو۔ اپنی طرف سے کچھ نہ بڑھاؤ۔ عقائد کے متعلق عوام سے گفتگو نہیں کرنی چاہیے
شاگردوں کے ساتھ ایسے خلوص اور محبت سے پیش آؤ کہ کوئی غیر دیکھے تو سمجھے کہ تمھاری اولاد ہے
عام اور معمولی رتبہ کے لوگ مناظرہ کرنا چاہیں تو احتراز کرو۔ کسی شہر میں جانا ہو تو وہاں کے
علما و فضلاء سے اس طرح ملو کہ ان کو رقابت کا خیال نہ ہو۔ علمی تذکرہ آئے تو جو بات کہو خوب سوچ
سمجھ کر کہو۔ اور وہی کہو جس کا کافی ثبوت دے سکتے ہو۔ مناظرہ کے وقت نہایت جرأت
واستقلال سے کام لو۔ ورنہ دل میں ذرا بھی خوف ہوگا تو خیالات مجتمع نہ رہ سکیں گے۔ اور زبان
میں لغزش ہوگی۔ جو لوگ آداب مناظرہ سے واقف نہیں یا مکابرہ کرنا چاہتے ہیں، ان سے ہرگز
گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ مناظرہ کے وقت غصہ نہ کرنا چاہیے، ہنسنا کم چاہئے۔ زیادہ ہنسی سے دل
مردہ ہوتا ہے جو کام کرو اطمینان اور وقار کے ساتھ کرو۔ کوئی شخص جب تک سامنے سے نہ پکارے
کوئی جواب نہ دو۔ کیونکہ پیچھے سے پکارنا جانوروں کے لیے مخصوص ہے۔ راستہ چلو تو دائیں بائیں
نہ دیکھو۔ حمام میں جاؤ تو عام آدمیوں کی نسبت زیادہ اُجرت دو۔ صبح اور دوپہر کے وقت حمام میں
نہ جاؤ۔ گفتگو میں سختی نہ ہو، آواز بلند نہ ہونے پائے، کوئی چیز خریدنی ہو تو خود بازار نہ جاؤ۔ بلکہ نوکر
بھیج کر منگوا لو، خانگی کاروبار دیانت دار نوکروں کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیے تا کہ تم کو اپنے
مشاغل کے لیے کافی وقت اور فرصت ہاتھ آئے۔ بادشاہ کے قریب سکونت اختیار نہ کرو۔ ہر بات
سے بے پروائی اور بے نیازی ظاہر کرو اور فقر کی حالت میں بھی وہی استغنا قائم رہے، عام
آدمیوں میں بیٹھ کر وعظ نہ کہو، کیونکہ ایسے موقع پر واعظ اکثر جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتا ہے،
شاگردوں میں کسی کو درس فقہ کی اجازت دو تو خود بھی اس کی درس گاہ میں شامل ہوتا کہ اس کے
متعلق رائے قائم کر سکو۔ وہ اگر کبھی غلطی کر جائے تو بتا دو ورنہ تمھارے چپ رہنے سے لوگوں کو
گمان ہوگا کہ اس نے جو کچھ کہا صحیح کہا، فقہ کے سوا اور علوم کی مجلس ہو تو خود نہ جاؤ۔ بلکہ اپنے
معتمد دوستوں یا شاگردوں کو بھیج دو کہ وہ آ کر تم سے پورے حالات بیان کریں۔

ہر بات میں تقوے اور امانت کو پیش نظر رکھو۔ خدا کے ساتھ دل سے وہی معاملہ رکھو۔ جو لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے ہو۔ جس وقت اذان کی آواز آئے تو فوراً نماز کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ہر مہینے میں دو چار دن روزے کے لیے مقرر کرلو۔ نماز کے بعد ہر روز کسی قدر وظیفہ پڑھا کرو، قرآن کی تلاوت قضا نہ ہونے پائے۔ دنیا پر بہت مائل نہ ہو۔ اکثر قبرستان میں نکل جایا کرو۔ لہو ولعب سے پرہیز رکھو۔ ہمسایہ کی کوئی برائی دیکھو تو پردہ پوشی کرو۔ اہل بدعت سے بچتے رہو۔ نماز میں جب تک تم کو لوگ خود نہ امام بنائیں امام نہ بنو۔ جو تم سے ملنے آئیں ان کے سامنے علمی تذکرہ کرو۔ اگر وہ اہل علم ہونگے تو فائدہ اٹھائیں گے، ورنہ کم از کم ان کو تم سے محبت پیدا ہوگی۔

عبدالعزیز بن رواد کو خلیفہ نے دربار میں بلایا۔ وہ امام صاحب کے شاگرد تھے مشورہ کے لیے ان کے پاس آئے اور کہا کہ خلیفہ نے طلب کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے سامنے وعظ کہوں مگر کیا کہوں اور کس طریقہ سے کہوں، اس میں آپ کی ہدایت چاہتا ہوں۔ امام صاحب نے فرمایا کہ یہ کہنا اے امیر المومنین! دنیا کے طلب کرنے کی تین غرضیں ہو سکتی ہیں، عزت، ملک، مال، یہ سب آپ کو حاصل ہیں۔ اب تقویٰ اور عمل صالح بھی اختیار کیجئے کہ دنیا و آخرت دونوں دولتیں حاصل ہوں۔

اس موقع پر امام صاحب کے حکیمانہ مقولے بھی سننے اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص کو علم نے بھی معاصی اور فواحش سے باز نہ رکھا اس سے زیادہ زیاں کار کون ہوگا، جو شخص علم دین میں گفتگو کرے اور اس کو یہ خیال نہ ہو کہ ان باتوں کی باز پرس ہوگی وہ مذہب اور خود اپنے نفس کی قدر نہیں جانتا۔" اگر علماء خدا کے دوست نہیں ہیں تو عالم میں خدا کا کوئی دوست نہیں"۔ جو شخص قبل از وقت ریاست کی تمنا کرتا ہے ذلیل ہوتا ہے"۔ جو شخص علم کو دنیا کے لیے سیکھتا ہے، علم اس کے دل میں جگہ نہیں پکڑتا سب سے بڑی عبادت ایمان اور سب سے بڑا گناہ کفر ہے پس جو شخص افضل ترین عبادت کا پابند اور بدترین معاصی سے محترز رہے اس کی مغفرت کی بہر حال امید کی جا سکتی ہے، جو شخص حدیث سیکھتا ہے اور اس سے استنباط مسائل نہیں کرتا وہ ایک عطار ہے، جس کے پاس دوائیں ہیں لیکن یہ نہیں جانتا کہ کون کس مرض کے لیے ہیں شخص علم کا مذاق نہیں رکھتا اس کے آگے علمی گفتگو کرنی اس کو اذیت دینی ہے، اپنے دوست

(نفس) کے لیے گناہ جمع اور دشمن ورثاء کے لیے مال فراہم کرنا کیسی غلطی ہے۔

ایک شخص نے پوچھا، فقہ کے حاصل ہونے میں کیا چیز معین ہوسکتی ہے امام صاحب نے فرمایا ''دلجمعی'' اس نے عرض کیا کہ دلجمعی کیوں کر حاصل ہو، ارشاد ہوا کہ تعلقات کم کیے جائیں پوچھا کہ تعلقات کیونکر کم ہوں جواب دیا کہ ''انسان ضروری چیزیں لے لے اور غیر ضروری چھوڑ دے''۔

ایک بار کسی نے سوال کیا کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی لڑائیوں کی نسبت آپ کیا کہتے ہیں فرمایا کہ قیامت میں جن باتوں کی پرسش ہوگی مجھ کو ان کا ڈر لگا رہتا ہے، ان واقعات کو خدا مجھ سے نہ پوچھے گا اس لئے اس پر توجہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں''۔

اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ وہ اس بحث کے متعلق اپنی ذاتی رائے نہیں رکھتے خود ان کا قول ہے کہ حضرت علیؓ کی نظیر اگر ہمارے سامنے موجود نہ ہوتی تو ہم نہ بتا سکتے کہ باغیوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔ امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے۔ البتہ ان باتوں کو اسلام کا ضروری مسئلہ قرار دینا اور ان پر بحثوں کا دفتر تیار کرنا ایک فضول کام ہے اور اسی کی طرف امام صاحب نے اشارہ کیا ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص تحصیل علم کی غرض سے امام صاحب کے پاس حاضر ہوا اور سفارشی خط پیش کیا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ علم میں سعی و سفارش کا کام نہیں، علماء کا خود فرض ہے کہ ان کو جو کچھ آتا ہو دوسروں کو بھی بتائیں، علم کے دربار میں خاص و عام کی کوئی تفریق نہیں''۔

ایک دن گورنر کوفہ نے کہا آپ ہم سے الگ کیوں رہتے ہیں؟ فرمایا ''روٹی کا ایک ٹکڑا اور معمولی کپڑا امن و عافیت سے ملتا جائے تو اس عیش سے بہتر ہے جس کے بعد ندامت اٹھانی پڑے''۔ اسی مضمون کو ایک شاعر نے نہایت خوبی اور سادگی سے ادا کیا ہے، وہ کہتا ہے۔

دو قرص نان اگر گندم ست یا از جو | سہ تائے جامعہ اگر کہنہ است یا از نو
بچار گوشہ دیوار خود بخاطر جمع | کہ کس نگوید ازیں جا بجا بخیز و آں جا رو
ہزار بار فزوں تر بہ نزد ابن یمین | زفر مملکت کیقبا دو کیخرو

امام صاحب کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، لیکن تشبیب و غزل کی حیثیت سے نہیں بلکہ وعظ و پند کے طور پر چنانچہ فرماتے ہیں۔

ومن المروۃ للفتیٰ ما عاش دار فاخرۃ

فاشکر اذا اوتیتھا واعمل لدار اخرۃ

''یعنی انسان جب تک زندہ ہے عزت وآبرو کے لیے اس کو ایک اچھا مکان چاہیے ایسا مکان نصیب ہو تو شکر کرنا چاہیے اور عافیت کے مکان کے لیے کوشش کرنی چاہیے''۔

امام صاحب کی ذہانت اور طباعی عموماً ضرب المثل ہے۔ یہاں تک کہ ان کا اجمالی ذکر بھی کہیں آجاتا ہے تو ساتھ ہی صفت بھی ضرور بیان کی جاتی ہے علامہ ذہبی نے **عبر فی اخبار من عبر** میں ان کا ترجمہ نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے، تاہم اس فقرے کو نہ چھوڑ سکے کہ **کان من اولیاء بنی آدم** ۔یعنی اولاد آدم میں جو نہایت زکی گذرے ہیں امام ابوحنیفہ ان میں شمار کیے جاتے ہیں، مشکل سے مشکل مسئلوں میں ان کا ذہن اس تیزی کے ساتھ رسائی کرتا کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے، اکثر موقعوں پر ان کے ہمعصر جو معلومات کے لحاظ سے ان کے ہمسر تھے موجود ہوتے تھے اور ان کو اصل مسئلہ بھی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جو واقعہ پیش ہوتا تھا اس سے مطابقت کر کے فوراً جواب بتا دینا امام صاحب ہی کا کام تھا۔

ایک شخص کسی بات پر اپنی بیوی سے ناراض ہوا اور قسم کھا کر کہا کہ جب تک تو مجھ سے نہ بولے گی میں تجھ سے کبھی نہ بولوں گا۔'' عورت تند مزاج تھی اس نے بھی قسم کھالی اور وہی الفاظ دہرائے جو شوہر نے کہے تھے، اس وقت تو غصہ میں کچھ نہ سوجھا مگر پھر خیال آیا تو دونوں کو نہایت افسوس ہوا۔ شوہر امام سفیان ثوری کے پاس گیا اور صورت واقعہ بیان کی، سفیان نے کہا کہ قسم کا کفارہ دینا ہوگا۔ اس کے بغیر چارہ نہیں وہ مایوس ہو کر اٹھا اور امام ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ للہ آپ کوئی تدبیر بتایئے امام صاحب نے فرمایا جاؤ شوق سے باتیں کرو۔ کسی پر کفارہ نہیں ہے امام سفیان ثوری کو معلوم ہوا تو نہایت برہم ہوئے اور امام ابوحنیفہ سے جا کر کہا آپ لوگوں کو غلط مسئلے بتایا کرتے ہیں امام صاحب نے اس شخص کو بلا بھیجا اور کہا کہ تم دوبارہ واقعہ کی صورت بیان کر جاؤ اس نے اعادہ کیا۔ امام صاحب سفیان کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا میں نے جو پہلے کہا تھا اب بھی کہتا ہوں سفیان نے کہا کہ کیوں؟ فرمایا کہ جب عورت نے شوہر کو مخاطب کر کے وہ الفاظ کہے تو عورت کی طرف سے بولنے کی ابتداء ہو چکی، پھر کہا قسم رہی[1] ''سفیان نے کہا

---

[1] اس واقعہ کو امام رازی نے تفسیر کبیر میں نقل کیا ہے۔

حقیقت میں آپ کو جو بات وقت پر سوجھ جاتی ہے ہم لوگوں کا وہاں تک خیال بھی نہیں پہنچتا۔

کوفہ میں ایک شخص نے بڑی دھوم دھام سے ایک ساتھ ہی اپنی دو بیٹیوں کی شادی کی۔ ولیمہ کی دعوت میں شہر کے تمام اعیان و اکابر کو مدعو کیا۔ مسعر بن کدام، حسن بن صالح، سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ شریک دعوت تھے لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، کہ دفعتاً صاحب خانہ بدحواس گھر سے نکلا اور کہا کہ غضب ہو گیا۔ لوگوں نے کہا کہ خیر ہے؟ بولا کہ ''زفاف کی رات عورتوں کی غلطی سے شوہر اور بیبیاں بدل گئیں۔ جو لڑکی جس کے پاس رہی وہ اس کا شوہر نہ تھا اب کیا کیا جائے، سفیان نے کہا کہ امیر معاویہؓ کے زمانے میں بھی ایسا ہی اتفاق ہوا ہے اس سے نکاح میں کچھ فرق نہیں آتا۔ البتہ دونوں کو مہر دینا لازم ہوگا مسعر بن کدام ابو حنیفہ کی طرف مخاطب ہوئے کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ امام صاحب نے کہا شوہر خود میرے سامنے آئیں تو جواب دوں۔ لوگ جا کر بلا لائے، امام صاحب نے دونوں سے الگ الگ پوچھا کہ رات کو جو عورت تمہارے ساتھ رہی وہی تمہارے نکاح میں رہے تو تم کو پسند ہے، دونوں نے کہا ''ہاں'' امام صاحب نے کہا کہ تم اپنی بیبیوں کو جن سے تمہارا نکاح بندھا تھا طلاق دے دو اور ہر شخص اس عورت سے نکاح پڑھا لے جو اس کے ساتھ ہم بستر رہ چکی۔'' سفیان نے جو جواب دیا اگرچہ فقہ کی رو سے وہ بھی صحیح تھا، کیونکہ یہ صورت وطی بالشبہہ کی ہے، جس سے نکاح نہیں ٹوٹتا۔ لیکن امام صاحب نے مصلحت کو پیش نظر رکھا وہ جانتے تھے کہ موجودہ صورت میں نکاح کا قائم رہنا غیرت و حمیت کے خلاف ہوگا، کسی مجبوری سے زوجین نے تسلیم بھی کر لیا تو دونوں میں وہ خلوص و اتحاد پیدا نہ ہوگا جو تزویج کا مقصود اصلی ہے اس کے ساتھ مہر کی بھی تخفیف ہے کیونکہ خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دی جائے تو صرف آدھا مہر لازم آتا ہے۔

لیث بن سعد جو مصر کے مشہور امام تھے ان کا بیان ہے کہ میں ابو حنیفہؒ کا ذکر سنا کرتا تھا اور ان کے دیکھنے کا نہایت مشتاق تھا، حج کی تقریب سے مکہ معظمہ جانا ہوا اتفاق سے ایک مجلس میں پہنچا، دیکھا تو بڑا ہجوم تھا۔ ایک شخص صدر کی جانب بیٹھا ہے اور لوگ اس سے مسئلے پوچھ رہے ہیں'' ایک شخص نے بڑھ کر کہا ''یا ابو حنیفہ'' (یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ان کو پہچانا) امام ابو حنیفہ اس کی طرف متوجہ ہوا، اس نے کہا کہ میرا ایک بدمزاج بیٹا ہے اس کی شادی کر دیتا ہوں تو بیوی کو طلاق دے دیتا ہے، لونڈی خرید تا ہوں تو آزاد کر دیتا ہے۔ فرمایئے کیا تدبیر کروں؟ امام ابو حنیفہ

نے فرجستہ کہا "تم اسکو ساتھ لے کر بازار میں جہاں لونڈیاں بکتی ہیں جاؤ اور لونڈی جو پسند آئے خرید کر اس کا نکاح پڑھا دو۔ اب اگر وہ آزاد کرے دے گا تو نہیں کر سکتا۔ کیونکہ لونڈی اس کی ملک نہیں۔ طلاق دے گا تو تمھارا کچھ نقصان نہیں تمھاری لونڈی کہیں نہیں گئی"۔ سعد کہتے ہیں کہ مجھ کو جواب پر تو کم لیکن حاضر جوابی پر بہت تعجب ہوا۔

ربیع جو خلیفہ منصور کا عرض بیگی تھا، امام ابو حنیفہ سے عداوت رکھتا، ایک دن امام صاحب حسب الطلب دربار میں گئے ربیع بھی حاضر تھا، منصور سے کہا کہ حضور یہ شخص امیر المومنین کے جد بزرگوار (عبداللہ بن عباسؓ) کی مخالفت کرتا ہے، ان کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات پر قسم کھائے اور ذوایک روز کے بعد انشاء اللہ کہہ لے تو وہ قسم میں داخل سمجھا جائے گا اور قسم کا پورا کرنا ضروری نہ ہوگا۔ ابو حنیفہ اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انشاء اللہ کا لفظ قسم کے ساتھ ہو تو البتہ جزو قسم سمجھا جائے گا۔ ورنہ لغو اور بے اثر ہے"۔ امام صاحب نے کہا کہ امیر المومنین! ربیع کا خیال ہے کہ لوگوں پر آپ کی بیعت کا کچھ اثر نہیں، منصور نے کہا کہ یہ کیونکر؟ امام صاحب نے کہا کہ "ان کا گمان ہے کہ جو لوگ دربار میں آپ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کیا کرتے ہیں اور قسم کھاتے ہیں گھر پر جا کر انشاء اللہ کہہ لیا کرتے ہیں جس سے قسم بے اثر ہو جاتی ہے۔ اور ان پر شرعاً کچھ مواخذہ نہیں رہتا، منصور ہنس پڑا۔ اور ربیع سے کہا کہ تم ابو حنیفہ کو نہ چھیڑو ان پر تمھارا داؤ نہیں چل سکتا۔" امام صاحب دربار سے نکلے تو ربیع نے کہا، آج تو آپ میری جان ہی لے چکے تھے، فرمایا یہ تو تمھارا ارادہ تھا، میں نے تو صرف مدافعت کی۔"

ایک دفعہ بہت سے خارجی امام صاحب کے گھر پر چڑھ آئے اور کہا کہ کفر سے توبہ کرو، امام صاحب نے کہا۔ "ہاں میں تمھارے کفر سے توبہ کرتا ہو۔" خارجیوں کا اعتقاد ہے کہ گناہ کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔ یعنی گناہ اور کفر ایک چیز ہے۔ امام صاحب کا مطلب یہ تھا کہ جس چیز کو تم کفر سمجھتے ہو۔ میں اس سے توبہ کرتا ہوں کسی نے ان خارجیوں سے کہا کہ ابو حنیفہ "نے تم لوگوں کو دھوکا دیا۔ ان کا مطلب اور تھا خارجیوں نے امام صاحب کو پکڑا کہ تم نے تاویل کیوں کی؟ امام صاحب نے کہا کہ تم کو یقین ہے یا محض گمان کی بناء پر میری نسبت ایسا خیال کرتے ہو، بولے کہ نہیں، گمان ہی گمان ہے"۔ امام صاحب نے کہا کہ تم کو خود توبہ کرنی چاہیے کیوں کہ خدا فرماتا ہے **اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ**۔

ایک دن مسجد میں تشریف رکھتے تھے، شاگردوں کا مجامع تھا، دفعتاً خارجیوں کا ایک گروہ مسجد میں گھس آیا، لوگ بھاگ چلے، امام صاحب نے روکا اور تسلی دی کہ ڈرو نہیں، اطمینان سے بیٹھ جاؤ، ایک خارجی جو سب کا سردار تھا امام صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ تم لوگ کون ہو امام صاحب نے فرمایا مستجیر ہیں اور خدا نے فرمایا ہے کہ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ۔ یعنی مشرکین میں سے کوئی شخص اگر پناہ مانگے تو اسے پناہ دو۔ تاکہ وہ خدا کا کلام سنے، پھر اس کے مامن تک پہنچا دو''۔

خارجی اپنے سوا مسلمانوں کے تمام فرقوں کو مشرک اور کافر سمجھتے ہیں اور واجب القتل جانتے ہیں۔ اس موقع پر وہ اس نیت سے آئے تھے کہ امام ابوحنیفہ اپنا عقیدہ بیان کریں تو کفر کا الزام لگا کر ان کو قتل کر دیں، لیکن امام صاحب کے الزامی جواب نے ان کو بالکل مجبور کر دیا۔ چنانچہ ان کے سردار نے ساتھیوں سے کہا کہ ''ان کو قرآن پڑھ کر سناؤ اور ان کو ان کے گھر پہنچا آؤ۔''

ابوالعباس جو منصور کے دربار میں ایک معزز درجہ رکھتا تھا۔ امام صاحب کا دشمن تھا اور ہمیشہ ان کو ضرر پہنچانے کی فکر میں رہتا تھا، ایک دن امام صاحب کسی ضرورت سے دربار میں گئے، اتفاق سے ابوالعباس بھی حاضر تھا، لوگوں سے کہا کہ آج ابوحنیفہ میرے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جا سکتے، امام صاحب کی طرف مخاطب ہوا اور کہا ابوحنیفہ! امیر المومنین کبھی کبھی ہم لوگوں کو حکم دیتے ہیں کہ ''اس شخص کی گردن ماردو۔ ہم کو مطلق معلوم نہیں ہوتا کہ وہ شخص واقعی مجرم ہے یا نہیں، ایسی حالت میں ہم کو اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیے؟'' امام صاحب نے کہا کہ ''تمھارے نزدیک خلیفہ کے احکام حق ہوتے ہیں یا باطل۔'' منصور کے سامنے کس کی تاب تھی کہ احکام خلافت کی نسبت ناجائز ہونے کا احتمال ظاہر کر سکے۔ ابوالعباس کو مجبوراً کہنا پڑا کہ حق ہوتے ہیں، پھر امام صاحب نے فرمایا پھر حق کی تعمیل میں پوچھنا کیا؟

ایک شخص نے قسم کھائی کہ ''آج اگر میں غسل جنابت کروں تو میری بیوی کو تین طلاق ہے تھوڑی دیر میں کہا کہ آج کی کوئی نماز قضا ہو تو میری زوجہ مطلقہ ہے۔ پھر کہا کہ اگر آج میں اپنی بیوی کے ساتھ صحبت نہ کروں تو اس کو طلاق ہے۔'' لوگوں نے امام صاحب سے آکر مسئلہ پوچھا، امام صاحب نے فرمایا کہ نماز عصر پڑھ کر بیوی سے ہم صحبت ہو اور غروب کے بعد غسل کر کے فوراً

غرب کی نماز پڑھ لے۔ اس صورت میں سب شرطیں پوری ہو گئیں۔ بیوی سے ہم صحبت بھی ہوا،
ساز بھی قضا نہیں کی۔ غسل جنابت کیا تو اس وقت کہ دن گزر چکا تھا۔

ایک دفعہ ایک شخص امام صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے کچھ روپے ایک جگہ
حتیاط سے رکھ دیے تھے اب یاد نہیں آتا کہ کہاں رکھے تھے مجھ کو سخت ضرورت درپیش ہے، کوئی
مدبیر بتایئے۔ امام صاحب نے فرمایا "بھائی یہ مسئلہ تو فقہ میں مذکور نہیں مجھ سے کیا پوچھنے آئے ہو
ں نے زیادہ لجاجت کی تو کہا کہ آج ساری رات نماز پڑھو۔ اس نے جا کر نماز پڑھنی شروع کی،
تفاق یہ کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کو یاد آ گیا کہ روپے فلاں جگہ رکھے تھے، دوڑا ہوا امام
ساحب کے پاس آیا اور عرض کیا کہ آپ تدبیر راست آئی، فرمایا کہ ہاں شیطان کب گوارا کرتا
کہ تم رات بھر نماز پڑھتے رہو، اس لیے اس نے جلد یاد دلایا، تاہم تم کو مناسب تھا کہ اس کے
شکریہ میں شب بیداری کرتے اور نمازیں پڑھتے۔"

ایک دن ایک اور شخص نے آ کر کہا کہ میں نے کچھ اسباب گھر کے کسی کونے میں گاڑ دیا
تھا۔ اب یاد نہیں آتا کہ کہاں گاڑا تھا کیا کروں، امام صاحب نے کہا تم کو یاد نہیں تو مجھ کو اور بھی یاد
نہ ہونا چاہیے۔" وہ رونے لگا اور امام صاحب کو رحم آیا۔ چند شاگرد ساتھ لئے اور اسکے گھر پر گئے۔
شاگردوں سے کہا کہ "اگر یہ تمھارا گھر ہوتا اور تم حفاظت کے لیے کوئی چیز چھپا رکھتے تو کہاں
رکھتے۔" سب نے اپنے قیاس سے مختلف موقع بتائے امام صاحب نے فرمایا کہ انہی تین چار
جگہوں میں سے کہیں نہ کہیں گاڑ ہو گا۔ ان کے کھدوانے کا حکم دیا۔ خدا کی شان تیسری جگہ کھودی تو
اسباب بجنسہ مدفون ملا۔

امام صاحب اگرچہ نہایت ثقہ، متین، باوقار تھے تاہم ذہانت کی شوخیاں کبھی کبھی
ظرافت کا رنگ دکھاتی تھیں۔ ایک دن حجامت بنوا رہے تھے، حجام سے کہا کہ سفید بالوں کو چن
لینا، اس نے عرض کیا کہ جو بال چنے جاتے ہیں اور زیادہ نکلتے ہیں۔ امام صاحب نے کہا کہ یہ
قاعدہ ہے تو سیاہ بالوں کو چن لو وہ اور زیادہ نکلیں۔" قاضی شریک نے جب یہ حکایت سنی تو کہا کہ
ابوحنیفہ نے حجام کے ساتھ بھی قیاس کو نہ چھوڑا۔

امام صاحب کے محلے میں ایک پسنہارا رہتا تھا جو نہایت متعصب شیعہ تھا، اس کے
پاس دو خچر تھے، تعصب سے ایک کا ابوبکر اور دوسرے کا عمر نام رکھا۔ اتفاق سے ایک خچر نے لات

ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا اور اسی صدمہ سے مر گیا، محلّہ میں اس کا چرچا ہوا۔ امام صاحب نے سنا تو کہا دیکھنا اسی خچر نے مارا ہوگا جس کا نام اس نے عمر رکھا تھا، لوگوں نے دریافت کیا تو واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔

کوفہ میں ایک غالی شیعہ رہتا تھا جو حضرت عثمان کی نسبت کہا کرتا تھا کہ یہودی تھے"۔ امام صاحب ایک دن اس کے پاس گئے اور کہا کہ "تم اپنی بیٹی کی نسبت ڈھونڈ ھتے تھے ایک شخص موجود ہے جو شریف بھی ہے اور دولتمند بھی ہے، اس کے ساتھ پرہیز گار قائم اللیل، حفظ قرآن ہے۔ شیعہ نے کہا کہ اس سے بڑھکر کون ملے گا، ضرور آپ شادی ٹھہرا دیجئے امام صاحب نے کہا کہ "صرف اتنی بات ہے کہ مذہباً یہودی ہے۔" وہ نہایت برہم ہوا اور کہا سبحان اللہ! آپ یہودی سے رشتہ داری کر نیکی رائے دیتے ہیں، امام صاحب نے فرمایا کیا ہوا، خود پیغمبرؐ خدا نے جب یہودی کو (تمھارے اعتقاد کے موافق) داماد بنایا تو تم کو کیا عذر ہے، خدا کی قدرت اتنی سی بات سے اسکو تنبیہ ہوگئی اور اپنے عقیدے سے توبہ کی۔

❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حصہ دوم

امام صاحب کی تصنیفات

امام صاحب کی طرف جو کتابیں منسوب ہیں ان کے نام یہ ہیں:۔ فقہ اکبر، العالم و المتعلم، مسند۔

فقہ اکبر، عقائد کا ایک مختصر رسالہ ہے، مسائل اور ترتیب قریب قریب وہی ہے جو عقائد نسفی وغیرہ کی ہے، یہ رسالہ چھپ گیا اور ہر جگہ مل سکتا ہے لوگوں نے اس پر شرحیں بھی لکھی ہیں، مثلاً محی الدین محمد بن، بہاؤ دالدین المتوفی ۹۳۵ھ مولیٰ الیاس بن ابراہیم السیبو بی مولی احمد بن محمد المغنیسادی، حکیم اسحاق، شیخ اکمل الدین، ملا علی قاری، ملا علی قاری کی شرح متداول ہے یعنی اور شرحوں کے نسخے بھی جا بجا قلمی پائے جاتے ہیں، حکیم اسحاق کی شرح کو ابو البقا احمد نے ۹۱۸ھ میں نظم کیا اور اصل کتاب کو ابراہیم ابن حسام نے جو شریفی کے نام سے مشہور ہیں۔

العالم والمتعلم، سوال و جواب کے طور پر ایک مختصر سا رسالہ ہے لیکن ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

مسند، کے متعدد نسخے ہیں، جن کو ابو المؤید محمود الخوارزمی، المتوفی ۶۶۵ھ نے یکجا جمع کر دیا ہے، دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "بلادِ شام میں بعضوں جاہلوں کو میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ امام ابوحنیفہ کو فن حدیث میں چنداں دخل نہ تھا اور اسی وجہ سے حدیث میں ان کی کوئی کتاب نہیں ہے، اس پر مجھ کو حمیت مذہبی کا جوش آیا اور میں نے چاہا کہ ان تمام مسندوں کو یکجا کردوں جو علماء نے امام ابوحنیفہ کی حدیثوں سے مرتب کئے ہیں اور جن کی تفصیل یہ ہے:۔(۱) مسند حافظ ابو محمد

عبداللہ بن محمد بن یعقوب الحارثی البخاری، المعروف بعبد اللہ الاستاد (۲) مسند حافظ ابوالقاسم طلحہ بن محمد بن جعفر الشاہد (۳) مسند حافظ ابوالحسن محمد بن المظفر بن موسیٰ بن عیسیٰ (۴) مسند حافظ ابونعیم الاصبہانی (۵) مسند شیخ ابوبکر محمد بن عبدالباقی محمد الانصاری (۶) مسند امام ابواحمد عبداللہ بن عدی البحرجانی، (۷) مسند امام حافظ عمر بن حسن الاشنانی، (۸) مسند ابوبکر احمد بن محمد بن خالد الکلاعی (۹) مسند ابویوسف قاضی (۱۰) مسند امام محمدؒ (۱۱) مسند حماد بن امام ابوحنیفہ (۱۲) مسند امام ابوالقاسم عبداللہ بن ابی العوام العدی۔

ابوالموید الخوارزمی نے جن مسندوں کے نام لیے ہیں ان کے سوا اور بھی مسانید ہیں۔ مثلاً حافظ عبداللہ حنین بن محمد بن خسرو البلخی المتوفی ۵۲۳ھ مسند حصفکی جس کی شرح ملا علی قاری نے لکھی۔ مسند ماوردی، مسند ابن عبدالنبر ازی المتوفی ۸۲۷ھ ان مسندوں کی شرحیں بھی لکھی گئیں۔
جو لوگ امام صاحب کے سلسلۂ کمالات میں تصنیف و تالیف کا وجود بھی ضروری سمجھتے ہیں وہ ان ہی مفصلہ بالا کتابوں کو شہادت میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ ان تصنیفات کو امام صاحب کی طرف منسوب کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ امام صاحب کی زندگی میں ایک مجموعۂ فقہ مرتب ہو گیا تھا جس کے حوالے عقود الجمان وغیرہ میں جابجا ملتے ہیں۔ لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ وہ نسخہ معدوم ہو گیا۔ اس زمانہ کی ہزاروں تصنیفات کے نام تراجم کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ لیکن دو تین کے سوا ایک کا بھی دنیا کے کسی کتب خانے میں پتہ نہیں چلتا۔ خود امام صاحب کے ہمعصروں میں سے سفیان ثوری، امام اوزاعی، حماد بن سلمہ، ہشیم، معمر، جریرین عبدالحمید عبداللہ بن مبارک نے حدیث و فقہ میں بڑی بڑی کتابیں لکھیں لیکن آج ان کا نام ہی نام رہ گیا ہے اور ایک کا بھی وجود نہیں امام رازی نے مناقب الشافعی میں تصریح کی ہے کہ امام ابوحنیفہ کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی۔

مسند خوارزمی کو امام صاحب کا مسند کہنا مجازی اطلاق ہے، خوارزمی خود ساتویں صدی میں تھے، جن مسندوں کو جمع کیا ہے وہ بھی اکثر تیسری چوتھی صدی یا اس سے بھی بعد کی ہیں حماد، قاضی ابویوسف البتہ امام صاحب کے ہمعصر ہیں اور ان کا مسند بے شبہ امام ابوحنیفہ کا مسند کہا جا سکتا تھا۔ لیکن خوارزمی کے سوا اور کسی نے ان مسندوں کا نام نہیں لیا ہے حالانکہ حدیث کی کتاب جب تک مشہور اور مستند روایتوں سے نہ ثابت ہو۔ اس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے نزدیک

اس بحث میں شاہ ولی اللہ صاحب کا فیصلہ کافی ہے وہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ چوتھے طبقہ کی وہ کتابیں ہیں جن کے مصنفوں نے ایک مدت دراز کے بعد ان روایتوں کو جمع کرنا چاہا جو پہلے دو طبقوں میں موجود نہ تھیں اور گمنام مسندوں اور مجموعوں میں پائی جاتی تھیں، ان لوگوں نے ان کو بلند نام کرنا چاہا، حالانکہ وہ حدیثیں لوگوں کی زبانوں پر تھیں جن کا محدثین اعتبار نہیں کرتے مثلاً یا وہ گو واعظین اور اہل بدعت اور ضعیف الروایۃ یا وہ صحابہ اور تابعین کے آثار یا بنی اسرائیل کے قصے تھے، یا حکماء اور واعظین کے مقولے تھے جن کو راویوں نے رسول اللہ کے کلام سے مخلوط کر دیا تھا یا قرآن اور حدیث کے مختلف مضامین تھے جن کو ان نیک آدمیوں نے بالمعنی روایت کیا جو فن روایت کی باریکیوں سے ناواقف تھے، ان لوگوں نے ان باتوں کو رسول اللہ کی طرف منسوب کر دیا یا ایسے مضامین تھے جو قرآن و حدیث سے مستنبط ہوتے تھے، ان کو قصداً حدیث نبویؐ بنا دیا مختلف حدیثوں کے ٹکڑے تھے جو ایک عبارت میں مرتب کر دیے گئے اس قسم کی حدیثیں کتاب الضعفاء ابن حبان، کامل ابن عدی، تصنیفات خطیب و ابونعیم و جوزقانی و ابن عساکر و ابن بخار و دیلمی میں مل سکتی ہیں۔ مسند خوارزمی بھی قریباً اسی طبقہ میں داخل ہے

شاہ ولی صاحب نے ذرا سختی کی، بات اتنی ہے کہ جن مسندوں کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ امام صاحب کے شاگردوں نے لکھے ان کا نہ تاریخوں سے ثبوت ملتا ہے نہ وہ خود کہیں پائے جاتے ہیں، جو مسند امام کے زمانہ سے بہت پیچھے لکھے گئے وہ البتہ موجود ہیں۔ لیکن ان حدیثوں کا امام صاحب تک بسند صحیح متصل پہنچنا نہایت مشتبہ ہے اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض مسانید میں بے اعتباری کی اندرونی شہادتیں موجود ہیں، مسند حصکفی میں کئی روایتیں امام صاحب کی طرف منسوب ہیں، جن کو انہوں نے خود صحابہ سے سنا اور روایت کیا ہے حالانکہ امام صاحب کا صحابہ سے روایت کرنا محدثانہ تحقیقات کی رو سے ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا، خوارزمی نے آثار امام محمد کو بھی امام کی مسانید میں داخل کیا ہے بے شبہ اس کتاب میں اکثر روایتیں امام صاحب ہی سے ہیں، اس لیے ناظرین کو اختیار ہے کہ اس کو امام صاحب کا مسند کہیں یا آثار امام محمد کے نام سے پکاریں، لیکن یاد رہے کہ امام محمدؒ نے اس کتاب میں بہت سے آثار اور حدیثیں دوسرے شیوخ سے بھی روایت کی ہیں اس لحاظ سے اس مجموعہ کا انتساب امام محمدؒ کی طرف زیادہ موزوں ہے۔

فقہ اکبر کو اگرچہ فخر الاسلام بزدوی، عبد العلی بحر العلوم و شارحین فقہ اکبر نے امام

صاحب کی طرف منسوب کیا ہے لیکن ہم مشکل سے اس پر یقین کر سکتے ہیں، یہ کتاب جس زمانہ کی تصنیف بیان کی جاتی ہے اس وقت تک یہ طرز تحریر پیدا ہیں ہوا تھا، وہ بطور ایک متن کے ہے اور اس اختصار اور ترتیب کے ساتھ لکھی گئی ہے جو متاخرین کا خاص انداز ہے ایک جگہ اس میں جوہر وعرض کا لفظ آیا ہے، حالانکہ یہ فلسفیانہ الفاظ اس وقت تک زبان میں داخل نہیں ہوئے تھے، بے شبہ منصور عباسی کے زمانے میں فلسفہ کی کتابیں یونان زبان سے عربی میں ترجمہ کی گئیں تھی، لیکن یہ زمانہ امام صاحب کی آخری زندگی کا زمانہ ہے، کسی طرح قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ ترجمہ ہوتے ہی یہ الفاظ اس قدر جلد شائع ہو جائیں کہ عام تصنیفات میں ان کا رواج ہو جائے، فلسفہ کے الفاظ نے مذہبی دائرہ میں اس وقت بار پایا ہے جب کثرت استعمال کی وجہ سے وہ زبان کا جز بن گئے اور عام بول چال میں بھی ان کے استعمال کے بغیر چارہ نہ رہا لیکن یہ دور امام صاحب کے زمانے کے بعد شروع ہوا ہے۔

یہ بحث تو روایت کی حیثیت سے تھی، اصول روایت کے لحاظ سے بھی یہ امر ثابت نہیں ہوتا، دوسری تیسری بلکہ چوتھی صدی کی تصنیفات میں اس کتاب کا پتہ نہیں چلتا قدیم سے قدیم تصنیف جس میں اس رسالہ کا ذکر کیا گیا ہے (جہاں تک ہم کو معلوم ہے) فخر الاسلام بزدوی کی کتاب الاصول ہے جو پانچویں صدی کی تصنیف ہے۔ امام ابو حنیفہ کے ہزاروں شاگرد تھے جن میں سے اکثر بجائے خود استاد تھے اور بواسطہ در واسطہ ان کے ہزاروں لاکھوں شاگرد ہوئے نہایت خلاف قیاس ہے کہ امام صاحب کی کوئی تصنیف موجود ہوتی اور اتنے بڑے گروہ میں اس کا نام تک نہ لیا جاتا، علم عقائد اور اس کے متعلقات پر بڑی بڑی کتابیں مثلاً صحائف، شرح مقاصد، شرح مواقف، ملل ونحل وغیرہ تصنیف ہوئیں اس میں کہیں اس کا ذکر تک نہیں ہے۔ اس کتاب کی جس قدر شرحیں ہوئیں سب آٹھویں صدی میں یا اس کے بعد ہوئیں اس کے علاوہ ابو مطیع بلخی جو اس کتاب کے راوی ہیں حدیث وروایت میں چنداں مستند نہیں ہیں۔ کتب رجال میں ان کی نسبت محدثین نے نہایت سخت تنقید کی ہے۔ اگر چہ میں ان کلیۃً تسلیم نہیں کرتا تاہم ایک ایسی مشتبہ کتاب جس کا ثبوت صرف ابو مطیع بلخی کی روایت پر منحصر ہو، محدثانہ اصول پر قابل تسلیم نہیں ہو سکتی۔

میرا خیال ہے کہ ابو مطیع بلخی نے ایک رسالہ میں بطور خود عقائد کے مسائل قلم بند کئے تھے، رفتہ رفتہ وہ امام صاحب کی طرف منسوب ہو گیا اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ علامہ

ذہبی نے عبر فی اخبار من غبر، میں ابومطیع کا جہاں ذکر کیا ہے ان لفظوں سے کیا ہے کہ صاحب الفقہ الاکبر جس کے متبادر معنی یہ ہیں کہ خود ابومطیع اس کے مصنف ہیں۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ فقہ اکبر کی موجودہ ترتیب وعبارت ابومطیع کے زمانہ سے بھی بہت بعد کی ہے اور یہ کچھ نئی بات نہیں، جامع صغیر جو امام محمد کی تالیف ہے، اس کی موجودہ ترتیب امام ابوطاہر دباس نے کی ہے جو چوتھی صدی میں تھے، فرق یہ ہے کہ جامع صغیر کی عبارت وہی اصلی ہے، صرف ترتیب بدل گئی ہے برخلاف اس کے فقہ اکبر کا انداز بھی زمانہ مابعد کا معلوم ہوتا ہے۔

ہم نے اس بحث میں اپنی رائے اور قیاسات کو بہت دخل دیا ہے لیکن تمام واقعات بھی لکھ دیے ہیں، ناظرین کو ہم اپنی رائے کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتے اصلی واقعات اور ہماری رائیں دونوں ان کے سامنے ہیں۔ وہ جو چاہیں خود فیصلہ کرلیں بے شبہ ہماری ذاتی رائے یہی ہے کہ آج امام صاحب کی کوئی تصنیف موجود نہیں ہے

عقائد وکلام

امام صاحب ابتدائی تحصیل میں علم کلام کی طرف زیادہ مائل تھے۔ صحابہ کے اخیر زمانے میں نئے نئے فرقے پیدا ہو چلے تھے، معبد جہنی نے جو صحابہ کا صحبت یافتہ تھا، مسئلہ قدر کو چھیڑا واصل بن عطا نے جو علوم عربیہ اور علم کلام کا بہت بڑا عالم اور امام حسن بصری کا شاگرد تھا۔ اعتزال کی بنیاد قائم کی۔ جہم بن صفوان فرقہ جہمیہ کا بانی ہوا خوارج کے متعدد فرقے اس سے پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ امام ابوحنیفہ کے زمانے میں ان مسائل کے جابجا چرچے تھے اور ہر جگہ بحث ومناظرہ کا بازار گرم تھا۔ امام صاحب کو بھی ان کی رد وقدح کی طرف التفات ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی بے نظیر ذہانت نے ان مسائل میں نہایت دقیق بحثیں پیدا کی ہوں گی لیکن چونکہ یہ شغل تھوڑے زمانہ تک رہا اور بالآخر وہ فقہ کے مہمات میں مصروف ہو گئے۔ اس لیے ان مباحث کا آج پتہ نہیں چلتا تاہم چند مسائل جو بتواتر ان کی طرف منسوب ہیں ان کی دقت نظر، جدت ذہن وسعت خیال کے شاہد وعادل ہیں ان میں سے ہم بعض مسائل کا ذکر کرتے ہیں جو محدثین کے نزدیک بڑے معرکۃ الآراء مسئلے ہیں۔"

پہلا مسئلہ یہ کہ امام صاحب فرائض واعمال کو جزو ایمان نہیں سمجھتے۔ آج تو اس کی نسبت

بحث کرنی گویا تحصیل حاصل ہے ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ ایمان اعتقاد کا نام ہے جو دل سے متعلق ہے فرائض اور اعمال جوارح کے کام ہیں اس لیے دونوں سے نہ کوئی حقیقت مرکب ہو سکتی ہے نہ ان میں سے ایک دوسرے کا جزو ہو سکتا ہے، لیکن اس زمانہ میں یہ ایک بڑا بحث طلب مسئلہ تھا اور اکثر ارباب ظاہر بلکہ بعض مجتہدین بھی ایک دوسرے کے خلاف تھے۔

صحابہ کے زمانہ تک اسلامی عقائد کی سطح نہایت ہموار اور غیر متحرک رہی اہل عرب کو ان موشگافیوں اور باریک بینیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بنی امیہ کے وسط زمانے میں جب فوجی قوت کو زوال ہوا تو تمدن و معاشرت کی وسعت نے اور قسم کے اشغال پیدا کر دیے، جبر و قدر تشبیہ و تنزیہہ، عدل و جور کی بحثیں چھڑ گئیں۔ ان بحثوں کی ابتداء ان لوگوں نے کی جو عجم کی خاک سے تھے یا ان پر عجم کا پرتو پڑا تھا چونکہ یہ نامانوس صدائیں تھی ان باتوں پر مذہبی گروہ میں جو زیادہ عربوں سے تعلق رکھتا تھا۔ برا ہمی پیدا ہوگئی اور محدثین و فقہاء نہایت سختی سے بدعتیوں کے مقابلے کو اٹھے، اس مقابلہ کی بناء پر ان بزرگوں کو خود بھی ان مسائل میں نفی یا اثبات کا پہلو اختیار کرنا پڑا لیکن جوش مخالفت نے اکثریت کو اعتدال کی حد پر نہ رہنے دیا۔ معتزلہ کا مذہب تھا کہ قرآن مجید خدا کا ایک جدید کلام ہے جو رسول اللہ کی نبوت کے ساتھ وجود میں آیا لوگوں نے اس کی یہاں تک مخالفت کی کہ بعض محدثین نے تلفظ بالقرآن کو بھی قدیم ٹھہرایا، امام ذہلی جو امام بخاری کے اساتذہ میں سے تھے اور صحیح بخاری میں ان کی سند سے اکثر روایتیں ہیں اسی بات پر امام بخاری سے ایسے ناراض ہوئے کہ ان کو حلقۂ درس سے نکلوا دیا اور عام حکم دے دیا کہ جو شخص بخاری کے پاس آمد و رفت رکھے وہ ہمارے حلقہ نہ آنے پائے [1]۔ امام بخاری خود قرآن کے قدم کے قائل تھے لیکن قرأت کو حادث کہتے تھے، ذہلی کو اصرار تھا کہ یہ بھی قدیم ہے۔

اور مسائل میں بھی اس قسم کی بے اعتدالیاں پیدا ہوئیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، امام ابوحنیفہ نے ان تمام بحثوں میں وہی پہلو اختیار کیا جو مغز سخن تھا اور جو عقل کے ساتھ نقل کے بھی موافق تھا۔ انہی مسائل میں ایمان و عمل کا بھی مسئلہ تھا، مرجیہ کا مذہب ہے کہ ایمان و عمل دو مختلف چیزیں ہیں اور ایمان اور تصدیق کامل ہو تو عمل کا نہ ہونا کچھ ضرر نہیں کرتا۔ ایک شخص اگر دل سے توحید و نبوت کا معترف ہے اور فرائض نہیں ادا کرتا تو وہ مواخذہ سے بری ہے۔'' اس رائے کا

[1] ان واقعات کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

پہلا حصہ گو صحیح تھا مگر محدثین نے کچھ تفریق نہ کی اور کلیۃً اس مذہب کے مخالف ہو گئے چونکہ قرآن کی بعض آیتیں بھی بظاہر اس کے مؤید تھیں ان کی رائے کو اور بھی تقویت پہنچ گئی یہ ایک اجتہاد رائے تھا اور یہیں تک رہتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا، لیکن افسوس یہ ہے کہ ان بزرگوں نے یہاں تک شدت کی کہ جو شخص ان کی رائے کے ساتھ متفق نہ ہوتا تھا تو اس کو فاسق یا کافر سمجھتے تھے۔ قاضی ابو یوسف ایک بار شریک کی عدالت میں گواہ ہو کر گئے تو انہوں نے کہا "میں اس شخص کی شہادت قبول نہیں کرتا۔ جس کا یہ قول ہو کر نماز جزو ایمان نہیں"

امام ابوحنیفہ کو اس سے کچھ بحث نہ تھی کہ یہ مسئلہ فلاں شخص یا فلاں فرقہ کا ہے۔ وہ اصل حقیقت کو دیکھتے تھے اور مغز سخن کو پہنچتے تھے جب یہ بحث ان کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے علانیہ کہا کہ ایمان اور عمل دو جداگانہ چیزیں ہیں اور دونوں کا حکم مختلف ہے اس پر بہت سے لوگوں نے انہیں بھی مرجیہ کہا لیکن وہ ایسا مرجیہ ہونا خود پسند کرتے تھے، محدثین اور فقہا میں سے جو لوگوں میں امام صاحب کے ہمزبان تھے ان کو بھی یہی خطاب عنایت ہوا۔

محدث ابن قتیبہ نے اپنی مشہور اور مستند کتاب المعارف میں مرجیہ کے عنوان سے بہت سے فقہا اور محدثین کے نام گنائے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں، ابراہیم تیمی، عمرو بن مرہ، طلق الحبیب حماد بن سلیمان عبدالعزیز ابی داؤد۔ خارجہ بن مصعب، عمرو بن قیس الاصر، ابو معاویۃ الضریر یحیٰی بن زکریا، مسعر بن کدام، حالانکہ ان میں سے اکثر حدیث وروایت کے امام ہیں۔ اور صحیح بخاری و مسلم میں ان لوگوں کی سینکڑوں روایتیں موجود ہیں ہمارے زمانے کے بعض کوتاہ بین اس پر خوش ہیں کہ امام صاحب کو بعض محدثین نے مرجیہ کہا ہے۔ ابن قتیبہ کی فہرست دیکھتے تو شاید ان کو ندامت ہوتی، محدث ذہبی نے میزان الاعتدال میں مسعر بن کدام کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ارجا (مرجیہ ہونا) بہت سے علماء کبار کا مذہب ہے اور اس مذہب کے قائل پر مواخذہ نہ کرنا چاہیے۔ یہ اسی کی طرف اشارہ ہے جو امام ابوحنیفہ کا مذہب تھا۔

یہ مسئلہ اگرچہ بظاہر چنداں مہتم بالشان نہ تھا لیکن اس کے نتائج بہت بر اثر رکھتے تھے اسی لحاظ سے امام صاحب نے نہایت آزادی سے اس کا اظہار کیا، عمل کو جزو ایمان قرار دینا اس بات کا مستلزم ہے کہ جو شخص اعمال کا پابند نہ ہو وہ مومن بھی نہ ہو۔ جیسا کہ خارجیوں کا مذہب ہے جو مرتکب کبائر کو کافر سمجھتے ہیں، اگرچہ اکثر محدثین ایسے شخص کو کافر نہیں سمجھتے تھے لیکن یہ نہ سمجھنا اس

وجہ سے تھا کہ وہ لزوم سے ناواقف تھے حالانکہ لزوم قطعی اور یقینی ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔

امام رازی نے جو امام شافعی کے بہت بڑے حامی ہیں کتاب مناقب الشافعی میں لکھا ہے کہ "لوگوں نے امام شافعی پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ متناقض باتوں کے قائل ہیں۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ "ایمان تصدیق و عمل کے مجموعے کا نام ہے"۔ ساتھ ہی اس بات کے بھی قائل ہیں کہ ترک عمل سے کوئی شخص کافر نہیں ہوتا حالانکہ مرکب چیز کا جب ایک جزو نہ رہا تو وہ مرکب بھی من حیث المرکب رہا۔ اسی لیے معتزلہ جو اس بات کے قائل ہیں کہ عمل جزو ایمان ہے اور اس بات کے بھی قائل ہیں کہ عمل نہ ہو تو ایمان بھی نہیں لیکن امام شافعی کی طرف سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصل ایمان اقرار اور اعتقاد کا نام ہے رہے باقی اعمال تو وہ ایمان کے ثمرات اور توابع ہیں لیکن چونکہ توابع پر بھی کبھی مجازاً اصل شے کا اطلاق ہوتا ہے اس لیے مجازاً اعمال پر بھی ایمان کا اطلاق ہوا اور یہ مسلم ہے کہ توابع کے فوت ہونے سے اصل شے فوت نہیں ہوتی۔

لیکن یہ جواب **توجیہ القول بمالا یرضی بہ قائلہ** ہے اور خود امام رازی کو اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ چنانچہ جواب کے بعد فرماتے ہیں کہ **فیہ ترک لھذا المذھب** یعنی اس جواب سے یہ مذہب باطل ہوا جاتا ہے امام رازی گو شافعی المذہب اور اپنے امام کے نہایت طرفدار ہیں لیکن چونکہ صاحب نظر اور نکتہ شناس ہیں ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ عمل کو ایمان کے توابع سے شمار کرنا چاہیے یا مان لینا چاہیے کہ جو شخص پابند عمل نہیں مومن بھی نہیں۔

اس بحث کے متعلق امام ابوحنیفہ کی ایک تحریر موجود ہے جس کی طرز استدلال و استنباط نتائج سے امام صاحب کی دقت نظر کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اصل مسئلہ کی حقیقت کھلتی ہے اس لیے اس موقع پر ہم اس کا حوالہ دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ تحریر عثمان بتی کے ایک خط کا جواب ہے جو انہوں نے امام صاحب کو لکھا تھا۔ عثمان اس زمانہ کے ایک مشہور محدث تھے۔ عام لوگوں میں جب امام ابوحنیفہ کے ان خیالات کے چرچے ہوئے تو انہوں نے امام صاحب کو ایک دوستانہ خط لکھا۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ "وہ لوگ آپ کو مرجیہ کہتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ آپ مومن کا ضال (گمراہ) ہونا جائز قرار دیتے ہیں مجھ کو ان باتوں کے سننے سے نہایت رنج ہوتا ہے، کیا یہ باتیں صحیح ہیں۔" اس خط کے جواب میں امام صاحب نے ایک طولانی خط لکھا ہے جس کے فقرے ہم کہیں کہیں سے انتخاب کرتے ہیں، حمد و نعت کے بعد عثمان بتی کی دوستانہ نصیحت اور خیر خواہی کا

شکر یہ ادا کر کے اصل مضمون اس طرح شروع کیا ہے۔

میں آپ کو بتاتا ہوں کہ رسول اللہؐ کے مبعوث ہونے سے پہلے تمام لوگ مشرک تھے رسول اللہ (صلعم) جب مبعوث ہوئے تو لوگوں کو اس بات کی طرف دعوت دی کہ خدا کو ایک مانیں اور رسول اللہ صلعم جو کچھ لائے اس کو تسلیم کریں۔ پس جو شخص اسلام میں داخل ہوتا تھا اور شرک چھوڑ دیتا تھا اس کی جان اور مال حرام ہو جاتا تھا۔ پھر خاص ان لوگوں کے لیے جو ایمان لا چکے تھے۔ فرائض کے احکام آئے، پس اس کا پابند ہونا عمل ٹھہرا اور خدا نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے **اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا** اس قسم کی اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عمل کے نہ ہونے سے ایمان نہیں جاتا رہتا، البتہ اگر تصدیق و اعتقاد نہ ہو تو مومن کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ عمل و تصدیق کا دو جداگانہ چیز ہونا اس سے بھی ظاہر ہے کہ تصدیق کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں۔ لیکن اعمال کے لحاظ سے مراتب میں فرق ہوتا ہے کیونکہ دین و مذہب سب کا ایک ہی ہے، خدا نے خود کہا ہے **شرع لکم من الدین ما وصّٰی به نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا به ابراهیم و موسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیه** یعنی تمھارے لیے اس دین کو مشروع کیا جس کی وصیت نوح کو کی تھی اور جو تجھ پر وحی بھیجی اور جس کی وصیت ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ کو کی وہ یہ ہے کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں متفرق نہ ہو۔"

آپ کو جاننا چاہیے کہ تصدیق میں ہدایت اور اعمال میں ہدایت، یہ دونوں دو چیزیں ہیں آپ ایک شخص کو جو فرائض سے ناواقف ہو مومن کہہ سکتے ہیں۔ پس ایسا شخص فرائض سے جاہل اور تصدیق کے لحاظ سے مومن ہے خود خدا نے قرآن پاک میں یہ اطلاقات کئے ہیں کیا آپ اس شخص کو جو خدا اور رسول خدا کے پہچاننے میں گمراہ ہو اس شخص کے برابر قرار دیں گے۔ جو مومن ہو، لیکن اعمال سے ناواقف ہو، خدا نے جہاں فرائض بتائے ہیں اس موقع پر ارشاد فرمایا ہے **یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا** (یعنی خدا نے اس لیے بیان کیا کہ تم گمراہ نہ ہو) دوسری آیت میں ہے، **اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰی** ۔(یعنی ایک بھول جائے تو دوسرا یاد دلائے) حضرت موسیٰؑ کی زبان سے فرمایا **فَعَلْتُهَا اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ** (یعنی میں نے جب وہ کام کیا تب میں گمراہ تھا) ان آیتوں کے علاوہ اور بہت سی آیتیں ہیں جو اس دعوے کے ثبوت

کے لیے دلائل قاطعہ ہیں اور حدیثیں تو اور بھی واضح اور صاف ہیں۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ امیر المومنین کے لقب سے پکارے جاتے تھے تو کیا اس کے یہ معنی تھے کہ وہ صرف ان لوگوں کے ایمر تھے جو فرائض اور اعمال کے پابند تھے، حضرت علیؓ نے شام والوں کو جو ان سے لڑتے تھے" مومن" کہا، کیا قتل سے بڑھ کر کوئی گناہ ہے، پھر جو لوگ قتل کے مرتکب ہوئے کیا آپ قاتلین اور مقتولین دونوں کو برسرحق قرار دیتے ہیں۔ اگر آپ صرف ایک (یعنی حضرت علیؓ اور طرفداران علیؓ) کو برسرحق تسلیم کریں گے تو دوسرے فریق کو کیا کہیں گے۔ اس کو خوب سمجھ لیجئے اور غور کیجئے۔

میرا یہ قول ہے کہ اہل قبلہ سب مومن ہیں اور فرائض کے ترک سے کافر نہیں ہوسکتے، جو شخص ایمان کے تمام فرائض بجالاتا ہے وہ مومن اور جنتی ہے۔ جو ایمان اور اعمال دونوں کا تارک ہے وہ کافر اور دوزخی ہے لیکن جو شخص ایمان رکھتا ہے اور فرائض اس سے ترک ہو جاتے ہیں وہ مسلمان ضرو ہے لیکن گنہگار مسلمان ہے، خدا کو اختیار ہے اس پر عذاب کرے یا معاف کر دیے"۔

امام صاحب نے جس خوبی سے اس دعویٰ کو ثابت کیا ہے۔ انصاف ہے کہ اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا۔ فرائض اور ایمان کی باہمی امتیاز کی اس سے عمدہ تر کیا دلیل ہوگی کہ آغاز اسلام میں ایمان کی دعوت ہوتی تھی اور فرائض کا وجود نہ تھا۔ امام صاحب نے قرآن کی جو آیتیں استدلال میں پیش کی ہیں ان سے بداہۃً ثابت ہوتا ہے کہ دونوں دو چیزیں ہیں کیونکہ ان تمام آیتوں میں عمل کو ایمان پر معطوف کیا ہے اور ظاہر ہے کہ جزو کل پر معطوف نہیں ہوسکتا"۔

ان دلائل قاطعہ کے مقابلہ میں دوسری طرف بعض آیتیں اور حدیثیں ہیں لیکن ان میں سے کوئی اثبات مدعا کے لیے کافی نہیں۔ بڑا استدلال اس حدیث پر ہے کہ "مومن" مومن ہو کر زنا اور چوری نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ کلام کے زور دینے کا ایک پیرایہ ہے، ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ بھلا آدمی ہو کر تو ایسا کام نہیں کرسکتا۔ جس کا صرف یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ کام شان شرافت کے خلاف ہے، بےشبہ زنا اور سرقہ بھی ایمان کی شان کے خلاف ہیں اور حدیث کا مقصد اسی قدر ہے ورنہ ابوذرؓ کی حدیث میں صراحۃً یہ الفاظ موجود ہیں کہ جو شخص لا الہٰ الآ اللہ کا قائل ہے جنت میں جائے گا گو زانی اور چور ہو۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ "الایمان لا یزید و لا ینقص "یعنی ایمان کم وبیش نہیں ہو

سکتا"۔ بے شبہ یہ امام صاحب کا قول ہے لیکن اس کی تعبیر میں لوگوں نے غلطی کی ہے، نہ صرف محدثین اور شافعیہ نے بلکہ خود احناف نے بھی۔ ایمان کی کمی زیادتی دو لحاظ سے ہو سکتی ہے، ایک اس اعتبار سے کہ وہ مقولہ کیف سے ہے جس میں شدت اور ضعف ممکن ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ایمان یقین کا نام ہے اور یقین کے مراتب متفاوت ہوتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب خدا سے کہا کہ اے خدا مردوں کو کیونکر جلاتا ہے تو ارشاد ہوا **اَوَلَمْ تُؤْمِنْ** یعنی کیا اب تک تجھ کو یقین نہیں آیا۔" غرض کیا کہ یقین ضرور ہے لیکن **لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي** اور زیادہ اطمینان خاطر چاہتا ہوں۔

خدا نے متعدد آیتوں میں صاف تصریح کر دی ہے کہ ایمان میں ترقی ہوتی ہے **زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا** اس مسئلہ میں نص صریح ہے لیکن ابو حنیفہؒ کو بہ لحاظ اس معنی کے نہ تو انکار ہے اور نہ یہ امر اس وقت زیر بحث تھا۔ امام صاحب کے دعوے کا تو منشا ہی اور ہے اور وہ بالکل صحیح ہے جن لوگوں نے عمل کو جزو ایمان قرار دیا۔ ان کا مذہب ہے کہ ایمان بلحاظ مقدار کے زیادہ کم ہوتا ہے، جو شخص اعمال کا پابند ہے وہ زیادہ مومن ہے، جو گنہگار ہے وہ کم مومن ہے، محدثین صراحۃً اس کے مدعی ہیں اور اس پر دلیلیں لاتے ہیں علامہ قسطلانی صحیح بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں۔ **فاعلم ان الایمان یزید بالطاعات وینقص بالمعصیة**۔ یعنی ایمان ثواب کے کام سے زیادہ ہوتا ہے اور گناہ کرنے سے گھٹ جاتا ہے اور محدثین نے بھی جابجا اس کی تصریح کی ہے۔ امام ابو حنیفہ اس اعتبار سے ایمان کی کمی اور زیادتی کے منکر تھے۔ ان کے نزدیک جب اعمال جزو ایمان نہیں تو اعمال کی کمی بیشی سے ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی اور یہ بالکل صحیح ہے، حدیث میں آیا ہے کہ ابو بکر کو تم لوگوں پر جو ترجیح ہے وہ کثرت صوم و صلوٰۃ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس چیز کی وجہ سے جو اس کے دل میں ہے، غرض کہ امام صاحب کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ایمان بلحاظ کیفیت یعنی شدت و ضعف کے زیادہ و کم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ایمان مقدار کے اعتبار سے کم و بیش نہیں ہوتا۔ یہ دعویٰ اس کی فرع ہے کہ اعمال جزو ایمان نہیں ہیں اور اس کو ہم ثابت کر چکے ہیں۔

امام صاحب اس بات کے بھی قائل تھے کہ مطلق ایمان میں کچھ تفاوت نہیں ہے یعنی معتقدات کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں ایمان کے لیے جن مسائل پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے وہ سب کے لیے یکساں ہیں صحابہ اور عام مسلمان اس لحاظ سے برابر ہیں کہ دونوں ایک ہی چیز

یعنی توحید اور نبوت کا اعتقاد رکھتے ہیں۔فرق ہے تو اعتقاد کی شدت اور ضعف میں ہے اسی مطلب کو امام صاحب نے عثمان کے جواب میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔**دین اهل السمآء والارض واحد**۔''یعنی آسمان وزمین والوں کا ایک ہی دین ہے پھر اس دعوے پر آیت قرآنی سے استدلال کیا ہے **شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَاوَصّٰى بِهٖ نُوحًا**۔''یعنی اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے وہی دین مشروع کیا۔جس کی وصیت نوحؑ کو کی تھی۔''مخالفین نے بڑے زور شور سے امام صاحب پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ''میرا ایمان اور ابو بکر صدیقؓ کا ایمان برابر ہے اگر چہ امام صاحب کی طرف اس قول کی اسناد ثابت نہیں۔لیکن اگر ثابت ہو تو کیا نقصان ہے جس اعتبار سے وہ مساوات کے مدعی ہیں۔اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔تعجب اور سخت تعجب ہے کہ ایسا صاف مسئلہ معترضوں کی سمجھ میں نہ آیا۔''خطیب بغدادی نے صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے اور یہ نہ سمجھے کہ امام صاحب کا دعویٰ کیا ہے۔ان کو یہ الفاظ نہایت گراں گزرتے ہیں کہ''ہمارا اور صحابہ کا ایمان برابر ہے۔''وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بہت سی چیزوں میں ہم اور صحابہ برابر ہیں،تاہم ہم میں اور صحابہ میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

اگر چہ اس قسم کے مسائل میں امام صاحب اپنی خاص آراء رکھتے تھے لیکن وہ مخالف آراء پر کفر وفسق کا الزام نہیں لگاتے تھے۔یہ قلبی فیاضی امام صاحب کا خاصہ ہے اور قرن اول کے بعد اسلام میں اس کی بہت کم نظیریں ملتی ہیں۔اسلام کو کسی چیز نے ان مناقشات سے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا جو اختلاف آرا کی بنا پر قائم ہو گئے۔ان اختلاف کی بنیاد اگر چہ خود صحابہ کے زمانہ میں شروع ہو چکی تھی۔عبداللہ بن عباسؓ اور بہت سے صحابہ کا اعتقاد تھا کہ رسول اللہ صلعم نے معراج میں خدا کو آنکھوں سے دیکھا۔حضرت عائشہؓ نہایت اصرار سے اس کی مخالف تھیں۔امیر معاویہؓ کو معراج جسمانی سے انکار تھا۔حضرت عائشہ سماع موتی کی قائل نہ تھیں لیکن اس زمانہ تک ان اختلافات پر ہدایت وگمراہی کا مدار نہ تھا،جو لوگ مختلف رائیں رکھتے تھے ان میں بھی کسی نے کسی کی تکفیر یا تفسیق نہیں کی۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک شخص نے پوچھا کہ کچھ لوگ پیدا ہوئے ہیں جو قرآن کی غلط تاویل کرتے ہیں اور ہم کو کافر قرار دیتے ہیں۔وہ خود کافر ہیں یا نہیں۔حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ اس وقت تک کوئی شخص کافر نہیں ہو سکتا جب تک خدا کو دو نہ کہے [1]۔صحابہ

---

[1] آثار امام محمد ص ۶۵

کے بعد یہ اختلافات زور پکڑتے گئے اور رفتہ رفتہ مستقل فرقے قائم ہو گئے اعتقادی اور فقہی مسائل اکثر ایسے ہیں جن میں نص قاطعی موجود نہیں اور ہیں تو متعارض ہیں اس لیے۔ استنباط اور رفع تعارض کی ضرورت نے اجتہاد کو بہت وسعت دی اور سینکڑوں رائیں قائم ہو گئیں، بے شبہ ان میں سے بہت سی رائیں صحیح نہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ سب کفر ہوں۔"

افسوس ہے کہ سرگرم طبیعتیں جو مذہبی جوش اور تقدس کے نشہ میں سرشار تھیں اختلاف رائے کے صدمہ کی تاب نہ لا سکیں اور نہایت بے صبری سے مخالفت پر آمادہ ہو گئیں۔ بات بات پر کفر کے فتوے ہونے لگے۔ جو لوگ جس قدر زیادہ مذہبی حرارت رکھتے تھے اسی قدر کفر کے اطلاق میں کم احتیاط کرتے تھے، رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ ہر فریق نے دوسرے کی ضلالت وگمراہی ثابت کرنے کے لیے موضوع روایتوں سے اعانت لی اور اس قسم کی حدیثیں ایجاد ہونے لگیں کہ میری امت میں ۷۳ فرقے پیدا ہوں گے جن میں ایک جنتی ہوگا۔ باقی سب دوزخی اس فرضی تعداد کو بھی پورا کرنا ضرور تھا۔ اس لیے کھینچ تان کر ۷۳ فرقے قرار دیے اور سب کے الگ الگ نام رکھے، اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو ہر فرقے کے لیے جدا جدا روایتیں گھڑیں مثلاً **القدریۃ مجوس ھذہ الامۃ**۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان تعصبات اور جھگڑوں نے جماعت اسلامی کے تمام اجزاء پراگندہ کر دیے اور مذہب اخلاق، حکومت، تمدن، معاشرت، سب کا نقشہ بگڑ گیا اس عالمگیر آشوب میں صرف ایک امام ابو حنیفہ تھے جن کی صدا سب سے الگ تھی اور جو پکار کر کہتے تھے **لا تکفر احدا من اھل القبلۃ**۔ "یعنی" اہل قبلہ میں سے ہم کسی کو کافر نہیں سمجھتے"۔ اس وقت تو اس صدا پر چنداں توجہ نہیں ہوئی، لیکن زمانہ جس قدر ترقی کرتا گیا اس جملے کی قدر بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ علم کلام کا ایک بیش بہا اصول بن گیا ہے۔ اگرچہ افسوس ہے کہ اس پر عمل کیا گیا اور تکفیر کے غلغلے بھی پست نہ ہوئے۔

امام صاحب کی یہ رائے نہایت غور و تحقیق و تجربہ کے بعد قائم ہوئی تھی، بڑے بڑے مشہور بانیان مذہب انھیں کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے اور امام صاحب کو ان سے ملنے کا موقع حاصل ہوا تھا، خارجیوں کا صدر مقام بصرہ تھا جو امام صاحب کے شہر سے نہایت قریب تھا۔ واصل بن عطا و عمرو بن عبید جو مذہب اعتزال کے بانی اور مروج تھے بصرہ ہی کے رہنے والے اور امام

صاحب کے ہمعصر تھے۔ جہم بن صفوان جس کے نام پر فرقۂ جہمیہ مشہور ہے، اسی زمانہ میں تھا امام صاحب ان میں سے اکثروں سے ملے اور ان کے خیالات سے مطلع ہوئے تھے۔ ان فرقوں کی نسبت جو اقوال مشہور تھے کچھ تو سرے سے غلط اور افترا تھے۔ بعض کی تعبیر غلط طور پر کی گئی تھی بعض دراصل لغو اور باطل تھے لیکن کفر کی حد تک نہ پہنچے تھے اس لیے امام ابوحنیفہ نے یہ عام حکم دے دیا کہ اہل قبلہ سب مؤمن ہیں۔'' وہ دیکھ رہے تھے کہ جن مسائل پر قیامتیں برپا ہیں جو کفرو اسلام کی معیار قرار دی گئیں ہیں وہ صرف لفظی بحثیں اور فرضی اصطلاحیں ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ قدم قرآن کا تھا جس کو لوگوں نے کلمۂ توحید کے برابر قرار دیا تھا۔ بڑے بڑے علماء کا قول ہے کہ اسلام کو دو شخصوں نے نہایت نازک فتنوں میں محفوظ رکھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتدین عرب کا استیصال کیا اور امام احمد بن حنبل جو مامون رشید کے زمانہ میں حدوث قرآن کے منکر رہے، بلکہ ایک اعتبار سے امام احمد بن حنبلؒ کو ترجیح ہے۔ کیونکہ صحابہ حضرت ابوبکرؓ کے معاون اور انصار تھے لیکن امام احمد کا کوئی مددگار نہ تھا۔

رجال کی کتابوں میں جب کسی شخص کو ثقہ اور مستند ثابت کیا جاتا ہے تو سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ وہ حدوث قرآن کو کفر سمجھتا ہے۔'' حالانکہ یہ صرف ایک لفظی بحث ہے۔ جو لوگ قرآن کو حادث کہتے تھے ان کی غرض ان الفاظ اور اصوات سے تھی جن کا ظہور رسول اللہ (صلعم) کی زبان سے ہوا یا جس پر عام طور سے قرآن کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اور جو قدیم مانتے تھے وہ کلام سے کلام نفسی کو مراد لیتے تھے۔ جو خدا کی صفات میں سے ہے امام ابوحنیفہ سے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں اور وہ اسی تفصیل کی بناء پر ہیں ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ قرآن حادث ہے یا قدیم۔ فرمایا کہ حادث، کیونکہ قرآن خدا نہیں اور جو خدا نہیں وہ حادث ہے[1]۔

غرض اس قسم کے مسائل نفیاً یا اثباتاً نصی نہیں ہیں اور اس وجہ سے وہ کفر و اسلام کا معیار نہیں ہو سکتے۔ امام ابوحنیفہ کی نکتہ شناسی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے دائرہ کو جو ''**من قال لاالٰہ الا اللّٰہ دخل الجنة**'' کی وسعت رکھتا تھا اصلی وسعت پر قائم رکھا۔ افسوس کہ ان کی اس رائے پر بہت کم لحاظ رکھا گیا۔ ورنہ امام غزالی، محی الدین ابن عربی، حضرت غوث الاعظمؒ، ابن تیمیہ و ابوطالب مکی کو ہم فقہا کی زبان سے کافر نہ سنتے۔

---

[1] کتاب الاوائل ابوبلال عسکری۔

حدیث اور اصول حدیث

یہ خیال اگرچہ غلط اور بالکل غلط ہے کہ امام ابوحنیفہ علم حدیث میں کم مایہ تھے، تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ عام طور پر وہ محدث کے لقب سے مشہور نہیں، بزرگان سلف میں سینکڑوں ایسے گزرے ہیں جو اجتہاد و روایت دونوں کے جامع تھے لیکن شہرت اسی صفت کے ساتھ ہوئی جو ان کا کمال غالب تھا، ابوحنیفہ کی تو حدیث میں کوئی تصنیف نہیں تعجب ہے کہ امام مالک اور امام شافعی بھی اس لقب کے ساتھ مشہور نہ ہوئے، نہ ان کی تصنیفوں کو وہ قبول عام حاصل ہوا، جو صحاح ستہ کو ہوا۔ امام احمد بن حنبل ان لوگوں کی نسبت علم حدیث میں زیادہ نام آور ہیں۔ ان کی مسند کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ صحیح حدیثوں کا اتنا بڑا مجموعہ اور کوئی نہیں مل سکتا۔ لیکن جس قدر حدیث و روایت میں ان کا زایدہ اعتبار ہے اسی قدر استنباط اور اجتہاد میں ان کی نام آوری کم ہے، علامہ طبری نے جو خود بھی محدث اور مجتہد تھے، مجتہدین میں ان کا شمار نہیں کیا [1] قاضی ابن عبدالبر نے کتاب الانتہائی الثلثۃ الفقہاء میں جو مجتہدین کے حالات میں ہے امام ابوحنیفہ و امام مالک و امام شافعی پر اکتفا کیا۔ امام رازی مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں کہ امام شافعی کے بعد کوئی مجتہد مطلق پیدا نہیں ہوا۔'' اگرچہ امام احمد بن حنبل کی نسبت گروہ کثیر علماء کی یہی رائے تھی کہ وہ اجتہاد کامل کا منصب رکھتے تھے۔ تاہم ان کے اجتہاد پر اتفاق عام نہ ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ مجتہد و محدث کی حیثیتیں الگ الگ ہیں، محدث مواعظ و قصص، فضائل سیر، ہر ایک قسم کی روایتوں کا استقصاء کرتا ہے۔ بخلاف اس کے مجتہد کو زیادہ تر صرف ان احادیث سے غرض ہوتی ہے جن سے کوئی حکم شرعی مستنبط ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ محدثین کی بہ نسبت مجتہدین ہمیشہ قلیل الروایۃ ہوئے، مؤطا میں جو امام مالک کی تمام روایتوں کا مجموعہ ہے زیادہ سے زیادہ ہزار حدیثیں ہیں، جن میں صحابہ اور تابعین کے اقوال بھی شامل ہیں، امام شافعی نے احمد بن حنبل کے سامنے اکثر اعتراف کیا ہے کہ تم لوگ بہ نسبت ہمارے احادیث سے زیادہ واقف ہو، قاضی یحییٰ بن اکثم جو ترمذی کے شیخ ہیں حسرت سے کہا کرتے تھے کہ ''اگر شافعی نے علم حدیث کی طرف پوری توجہ کی ہوتی تو ہم لوگوں کو سب سے بے نیاز کر دیا ہوتا [2]۔ حافظ ابن حجر نے توالی

---

[1] طبقات المفسرین حافظ جلال الدین ترجمہ علامہ طبری۔ [2] توالی التاسیس لحافظ ابن حجر ص ۵۶

التاسیس میں جو امام شافعی کے حالات میں ایک مختصر اور مفید رسالہ ہے جہاں امام شافعی کے شیوخ حدیث سے بحث کی ہے خاتمہ پر لکھا ہے کہ **ولم یکثر من الشیوخ کعادۃ اھل الحدیث لا قبالہ علی الاشتغال بالفقہ** "یعنی وہ بہت سے شیوخ سے نہیں ملے جیسا کہ اہل حدیث کی عادت ہے۔ کیونکہ ان کو فقہ کا شغل رہتا تھا۔" حافظ ابن حجر نے امام شافعی کی نسبت قلت شیوخ کا جو سبب بیان کیا، امام ابوحنیفہ کی قلت روایت کا بھی وہی سبب ہے لیکن افسوس ہے کہ بعض لوگوں نے اس دائرہ کو زیادہ وسیع کیا اور عموماً ان کی قلت روایت کے قائل ہوئے، یہ خیال کچھ نیا نہیں ہے! اگلے زمانہ بھی بعض بعض لوگوں کی یہ رائے تھی، اور وہی غلط فہمی آج تک چلی آتی ہے۔

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ امام ابوحنیفہ کے وہ واقعات جو منظر عام پر نمایاں ہیں ان سے ایک ظاہر بین شخص ایسی ہی رائے قائم کرسکتا ہے، حدیث میں ان کی کوئی تصنیف موجود نہیں، صحاح میں بجز ایک دو روایت کے ان کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ سب سے زیادہ یہ کہ ان کی شہرت اہل الرائے کے لقب سے ہے جس سے متبادر ہوتا ہے، کہ حدیث سے ان کو کم تعلق تھا۔"

اس قدر ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مغازی، قصص، سیر وغیرہ میں ان کی نظر چنداں وسیع نہ تھی۔ امام مالک و امام شافعی کا بھی یہی حال تھا لیکن احکام و عقائد کے متعلق امام ابوحنیفہ کو جو واقفیت اور تحقیق حاصل تھی اس سے انکار کرنا صرف کم نظری اور ظاہر بینی کا نتیجہ ہے ان کی تصنیفات یا روایتوں کا مدون نہ ہونا قلت نظر کی دلیل نہیں ہوسکتا حضرت ابوبکر صدیق سے زیادہ کسی صحابی کو رسول اللہ (صلعم) کے ساتھ جلوت و خلوت میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوتا تھا، رسول اللہ (صلعم) کے اقوال و افعال سے جس قدر وہ واقف تھے اور کون ہوسکتا تھا لیکن حدیث کی تمام کتابوں میں ان کی روایت سے جس قدر صحیح حدیثیں ہیں۔ ان کی تعداد سترہ سے زیادہ نہیں۔ کون شخص کہہ سکتا ہے کہ ان کو صرف اسی قدر حدیثیں معلوم تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیق کے بعد حضرت عمرؓ فاروق کا درجہ ہے۔ ان سے بھی صرف پچاس حدیثیں [1] مروی ہیں جن میں سے بعض کا کافی ثبوت نہیں۔ حضرت عثمانؓ اور جناب امیرؓ کا بھی یہی حال ہے بخلاف اس کے حضرت ابوہریرہؓ

---

[1] مناقب الشافعی لامام الرازی خلفائے اربعہ کی نسبت یہ تعداد میں نے امام شافعی کے قول کے مطابق لکھی ہے اور محدثین کے نزدیک اس سے زیادہ حدیثیں ان لوگوں سے مروی ہیں۔ تاہم اس سے زیادہ تعداد نہیں پہنچی جس پر کثرت روایت کا اطلاق کیا جائے۔

سے ۵۳۴۶، انسؓ سے ۲۲۸۶، عبداللہ بن عباس ۲۶۶۰، جابرؓ سے ۲۵۴۰، عبداللہ بن عمرؓ سے جو رسول اللہ (صلعم) کے زمانہ میں نوجوان تھے ۲۶۳۰ حدیثیں مروی ہیں۔ اگر روایتوں کا موجود ہونا ہی معیار ہے تو خلفائے اربعہ کی نسبت تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کا حافظہ ضعیف اور نہایت ضعیف تھا یا دانستہ ان کو رسول اللہ (صلعم) کے اقوال و افعال کی طرف التفات اور توجہ نہ تھی۔ **وحاشاهم عن ذالک**

یہ سچ ہے کہ صحاح ستہ کے مصنفین نے امام صاحب سے روایت نہیں کی۔ (دو ایک روایتیں مستثنیٰ ہیں) لیکن اس الزام میں اور ائمہ بھی ان کے شریک ہیں، امام شافعی نے جن کو بڑے بڑے محدثین مثلاً امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، ابوثور، حمیدی، ابوزرعۃ الرازی، ابو حاتم نے حدیث اور روایت کا مخزن تسلیم کیا ہے۔ ان کی سند سے صحیحین میں ایک روایت بھی موجود نہیں، بلکہ بخاری و مسلم نے کی اور تصنیف میں بھی امام شافعی کی سند سے کوئی روایت نہیں کی۔ امام رازی نے بخاری و مسلم کی اس بے اعتنائی کی بہت سی تاویلیں کی ہیں، مگر کوئی معقول بات نہیں بتا سکتے۔ صحیحین پر موقوف نہیں، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ نسائی میں بھی بہت کم ایسی حدیثیں ہیں جن کے سلسلہ رواۃ میں امام شافعی کا نام آیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض محدثین نے اعتماد اور استنباط کا معیار قرار دیا تھا اس میں اہل نظر بلکہ اکثر لوگوں کے لیے کم گنجائش تھی، علامہ قسطلانی نے شرح صحیح میں لکھا ہے کہ امام بخاری فرمایا کرتے تھے "کہ میں نے کسی ایسے شخص سے حدیث نہیں لکھی جس کا یہ قول نہ تھا کہ **الایمان قول و عمل**[1]۔ اگر یہ صحیح ہے تو امام ابوحنیفہ کو ان کے دربار میں پہنچنے کی کیونکر امید ہو سکتی تھی۔

امام بخاری نے تاریخ کبیر میں امام شافعی کا ذکر کیا ہے لیکن جس بے پروائی سے کیا ہے اس کے لحاظ سے امام رازی نے یہی غنیمت سمجھا کہ تضعیف نہیں کی۔ چنانچہ امام شافعی کے فضائل میں فرماتے ہیں۔ **واما الامام محمد بن اسمعیل البخاری فقد ذکر الشافعی فی تاریخه الکبیر فقال فی باب محمد بن ادریس بن عبد الله محمد الشافعی القرشی مات سنة اربع و مائتین ثم انه ماذکرهٔ فی باب الضعفاء مع علمه بانه قدروی شیاً کثیر امن الحدیث ولو کان من الضعفاع فی الباب لذکره۔**

---

[1] حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے مقدمہ میں امام بخاری کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"یعنی امام بخاریؒ نے شافعی کا ذکر تاریخ کبیر میں کیا ہے چنانچہ فلاں باب میں لکھا ہے کہ محمد بن ادریس بن عبداللہ محمد الشافعی القرشی نے ۲۰۴ ہجری میں وفات پائی لیکن ان کو ضعفاء کے باب میں ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ امام بخاری جانتے تھے کہ شافعیؒ نے بہت سی حدیثیں روایت کی ہیں اور اگر وہ اس باب میں ضعیف ہوتے تو امام بخاری ضرور ان کو ضعیف لکھتے۔"

امام اوزاعی جو مستقل محدث و مجتہد تھے اور بلادِ شام میں ان کا وہی اعزاز و اعتبار تھا جو عرب و عراق میں امام مالک و شافعی کا تھا۔ ان کی نسبت کسی نے امام احمد بن حنبل سے رائے پوچھی "فرمایا حدیث ضعیف و راوی ضعیف[1]"

لطف یہ ہے کہ مجتہدین جس چیز پر فخر کر سکتے ہیں وہ دقت نظر، قوت استنباط، استخراج مسائل و احکام ہے۔ لیکن محدثین کے ایک گروہ کے نزدیک یہی باتیں عیب و نقص میں داخل ہیں۔ علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری، قاضی ابو یوسف کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ "اہل حدیث میں سے ایک گروہ نے ان کی روایت سے اس بناء پر احتراز کیا کہ ان پر رائے غالب تھی اور فروع احکام کی تفریع کرتے۔ ان باتوں کے ساتھ بادشاہ کی صحبت میں رہتے تھے اور منصب قضاء پر مامور تھے[2]۔ اگر فروغ اور احکام کا استنباط بھی جرم ہے تو بے شبہ امام ابو حنیفہ قاضی ابو یوسف سے زیادہ مجرم ہیں۔

البتہ یہ بات غور کے قابل ہے کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اتباع کو کیوں اہل الرائے کہا جاتا تھا۔ اس بات پر اکثر لوگوں نے غلطی کی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے شرف عام کے مقابلہ میں تحقیق کی پرواہ نہ کی۔

اس بحث کے تصفیہ کے لیے سب سے پہلے یہ پتہ لگانا چاہیے کہ یہ لقب کب ایجاد ہوا اور کن لوگوں پر اطلاق کیا گیا۔ جہاں تک ہم کو علم ہے اس لقب کے ساتھ اول جس کو یہ امتیاز حاصل ہے وہ ربیعۃ الرائے ہیں جو امام مالک کے استاد اور شیخ الحدیث تھے، رائے کا لفظ ان کے نام کا جزو بن گیا ہے اور تاریخ اور اسماء الرجال میں ہمیشہ ان کا نام ربیعۃ الرائے لکھا جاتا ہے، یہ مشہور محدث اور فقیہ تھے، اور بہت سے صحابہ سے ملے تھے علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں

---

[1] مناقب الشافعی امام الرازی باب رابع [2] تاریخ ابن خلکان ترجمہ قاضی ابو یوسف۔

ان کا ذکر ان لفظوں سے کیا ہے۔ "تمام اصحاب کتب (یعنی صحاح ستہ) نے ان سے احتجاج کیا ہے۔ عبدالعزیز ماجشون کا قول ہے کہ واللہ میں نے ربیع سے زیادہ کسی کو حافظ الحدیث نہیں دیکھا۔

اسی زمانہ میں اور اس کے بعد کے اور لوگ بھی اس لقب سے پکارے گئے۔ محدث ابن قتیبہ نے کتاب المعارف میں اہل الرائے کی سرخی سے ایک باب باندھا ہے اور عنوان کے نیچے یہ نام لکھے ہیں "ابن ابی لیلیٰ، ابوحنیفہ، ربیعۃ الرائے، زفر، اوزاعی، سفیان ثوری، مالک بن انس، ابو یوسف قاضی، محمد بن حسن" ابن قتیبہ نے ۲۷۶ھ میں وفات پائی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کم ازکم تیسری صدی تک مذکورہ بالا لوگ اہل الرائے کے لقب سے مشہور تھے۔ اگرچہ یہ سب لوگ درحقیقت (زفر کے سوا) محدث ہیں لیکن امام مالک، سفیان ثوری اور امام اوزاعی کی شہرت تو محتاج بیان نہیں۔

اصل یہ ہے کہ جو لوگ علم حدیث کے درس و تدریس میں مشغول تھے ان میں دو فرقے قائم ہو گئے تھے ایک وہ جنکا کام صرف حدیثوں اور روایتوں کا جمع کرنا تھا وہ حدیث سے صرف من حیث الروایۃ بحث کرتے تھے یہاں تک کہ انکو ناسخ و منسوخ سے بھی کچھ سروکار نہ تھا۔ دوسرا فرقہ حدیثوں کا استنباط احکام اور استخراج مسائل کے لحاظ سے دیکھتا تھا اور کوئی نص صریح نہیں ملتی تھی تو قیاس سے کام لیتا تھا۔ اگرچہ یہ دونوں حیثیتیں دونوں فریق میں کسی قدر مشترک تھیں لیکن وصف غالب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ممتاز تھا، پہلا فرقہ ہل الرولیۃ اور اہل حدیث اور دوسرا فرقہ مجتہد اور اہل الرائے کے نام سے پکارا جاتا تھا، امام مالک سفیان ثوری، اوزاعی اسی لیے اہل الرائے کہلائے کہ وہ محدث ہونے کے ساتھ مجتہد مستقل اور بانی مذہب تھے لیکن چونکہ ان لوگوں میں بھی معلومات حدیث اور قوت اجتہاد کے لحاظ سے اختلاف مراتب تھا اسلئے اضافی طور پر کبھی کبھی اس فرقے میں سے ایک کو اہل الرائے اور دوسرے کو اہل حدیث کہتے تھے، مثلاً امام مالک کی بہ نسبت امام ابوحنیفہ پر مجتہد اور اہل الرائے کا لقب دیا۔ وہ موزوں تھا امام احمد بن حنبل سے، ایک بار نضر بن یحییٰ نے پوچھا کہ "آپ لوگوں کو امام ابوحنیفہ پر کیا اعتراض ہے۔" انہوں نے جواب دیا کہ "رائے" نضر نے کہا کہ امام مالک رائے پر عمل نہیں کرتے، امام احمد بن حنبل بولے کہ ہاں لیکن ابوحنیفہ رائے کو زیادہ دخل دیتے ہیں، نضر نے کہا تو حصہ رسدی کے موافق دونوں الزام آنا چاہیے نہ صرف ایک پر، امام احمد بن حنبل کی کچھ جواب نہ دے سکے اور چپ ہو گئے[1]

---

[1] عقود الجمان خاتمہ فصل اول۔

امام ابو حنیفہ سے پہلے فقہ کوئی مستقل اور مرتب فن نہ تھا، امام صاحب نے اسکی تدوین کی تو ہزاروں مسئلے ایسے پیش آئے جن میں کوئی حدیث صحیح بلکہ صحابہ کا قول بھی موجود نہ تھا اسلئے ان کو قیاس سے کام لینا پڑا، قیاس پر پہلے بھی عمل تھا، خود صحابہ قیاس کرتے تھے اور اسکے مطابق فتوے دیتے تھے (اس کا مفصل بیان آگے آئے گا) لیکن اس وقت تک تمدن کو چنداں وسعت حاصل نہ تھی اسلئے نہ کثرت سے واقعات پیش آتے تھے نہ چنداں قیاس کی ضرورت پڑتی تھی امام صاحب نے فقہ کو مستقل فن بنانا چاہا قیاس کی کثرت استعمال کے ساتھ اسکے اصول وقواعد بھی مرتب کرنا پڑے اس بات نے انکو رائے اور قیاس کے انتساب سے زیادہ شہرت دی چنانچہ تاریخوں میں جہاں انکا نام لکھا جاتا ہے، امام اہل الرائے لکھا جاتا ہے۔

اس شہرت کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ عام محدثین حدیث وروایت میں درایت سے بالکل کام نہیں لیتے تھے اور امام ابو حنیفہ نے اس کی اتباع کی۔ اور اسکے اصول وقواعد منضبط کئے۔ انہوں نے بہت سی حدیثیں اس بناء پر قبول نہ کیں کہ اصول درایت کے موافق ثابت نہ تھیں۔ اس لیے اس لقب کو زیادہ شہرت ہوئی کیونکہ درایت اور رائے مترادف سے الفاظ ہیں اور کم از کم یہ کہ عام لوگ ان دونوں میں فرق نہیں کر سکتے تھے۔

ان عارضی بحثوں کے بعد ہم اصل مسئلہ پر متوجہ ہوئے یعنی یہ کہ امام ابو حنیفہ کو فن حدیث میں کیا رتبہ حاصل تھا، اس بحث کے فیصلے کے لیے ان کی علمی زندگی کے واقعات پر نظر ڈالنی چاہیے جو نہایت صحیح اور مستند روایتوں سے ثابت ہیں اس کتاب کے پہلے حصہ میں ہم امام ابو حنیفہؒ کی تحصیل حدیث کے حالات اور ان کتابوں کی سند سے لکھ آئے ہیں جن پر فن رجال کا دارومدار ہے۔ اب غور کرو کہ جس شخص نے بیس برس کی عمر سے جو فہم کی درستگی اور پختگی کا زمانہ ہے علم حدیث پر توجہ کی ہو اور ایک مدت تک اس شغل میں مصروف رہا ہو، جس نے کوفہ کے مشہور شیوخ حدیث سے حدیثیں سیکھی ہوں جو حرم محترم کی درس گاہوں میں برسوں تحصیل حدیث کرتا رہا ہو۔ جس کو مدینہ منورہ کے شیوخ نے سند فضیلت دی ہو۔ جس کے اساتذہ حدیث عطاء بن ابی رباح نافع ابن عمر، عمر بن دینار، محارب بن وثار، اعمش کوفی، امام باقر علقمہ بن مرثد، مکحول شامی، امام اوزاعی، محمد بن مسلم الزہری، ابو اسحٰق السبیعی، سلیمان بن یسار، عبد الرحمٰن بن ہرمز الاعرض، منصور المعتمر، ہشام بن عروہ وغیرہ ہوں جو فن روایت کے ارکان ہیں اور جنکی روایتوں سے

بخاری ومسلم مالا مال ہیں وہ حدیث میں کس رتبہ کا شخص ہوگا۔

اس کے ساتھ امام صاحب کے شاگردوں پر لحاظ کرو[۱]، یحییٰ بن سعید القطان جوفن جرح وتعدیل کے امام ہیں عبدالرزاق بن ہمام جنکی جامع کبیر سے امام بخاری نے فائدہ اٹھایا ہے، یزید بن ہارون جن کوامام بن حنبل کہا کرتے تھے کہ حفظ اسنادروایت میں میں نے ان کا ہمسر کسی کو نہیں دیکھا، عبداللہ بن المبارک جوفن حدیث میں امیر المومنین تسلیم کئے گئے ہیں یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ جن کو علی بن المدینی (استاد بخاری) منتہائے علم کہا کرتے تھے یہ لوگ برائے نام امام صاحب کے شاگرد نہ تھے۔ بلکہ برسوں ان کے دامن فیض میں تعلیم پائی تھی اوراس انتساب پران کوفخر وناز تھا، عبداللہ بن المبارک کہا کرتے تھے کہ اگر خدا نے ابوحنیفہ وسفیان ثوری سے میری مددنہ کی ہوتی تو میں ایک معمولی آدمی[۲] ہوتا، وکیع اور یحییٰ بن ابی زائدہ امام صاحب کی صحبت میں اتنی مدت رہے تھے کہ صاحب ابی حنیفہ کہلاتے تھے کیا اس رتبہ کے لوگ جوخود خدمت حدیث وروایت کے پیشوا ورمقتدا تھے کسی معمولی شخص کے سامنے سر جھکا سکتے تھے؟

ان باتوں کے علاوہ امام ابوحنیفہ کا مجتہد مطلق ہونا ایک مسلم مسئلہ ہے جس سے بارہ سو برس کی مدت میں شاید ایک آدھ ہی شخص نے انکار کیا ہو، اجتہاد کی تعریف علمائے حدیث مثلاً بغوی، رافعی، علامہ نووی وغیرہ نے ان لفظوں میں کی ہے ''مجتہد وہ شخص ہے جو قرآن' حدیث 'مذہاب سلف، لغت، قیاس ان پانچ چیزوں میں کافی دستگاہ رکھتا ہو یعنی مسائل شرعیہ کے متعلق جس قدر قرآن میں آیتیں ہیں جو حدیثیں رسول اللہ (صلعم) سے ثابت ہیں جس قدر علم لغت درکار ہے سلف کے جو اقوال ہیں، قیاس کے جو طریق ہیں قریب کل کے جانتا ہوں، اگر ان میں سے کسی میں کمی ہے تو وہ مجتہد نہیں ہے اور اسکو تقلید کرنی چاہیے[۳]۔

اسی بناپر علامہ ابن خلدون نے فصل علوم الحدیث میں مجتہدین کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ بعض ناانصاف مخالفین کا قول ہے کہ ان مجتہدوں میں سے بعض فن حدیث میں کم تھے اس لئے انکی روایتیں کم ہیں، لیکن یہ خیال غلط ہے، ائمہ کبار کی نسبت یہ گمان نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ شریعت قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے پس جو شخص حدیث میں کم مایہ ہے اسکو تلاش اور کوشش کرنی چاہیے

---

[۱] ان لوگوں کا تذکرہ اس کتاب کے خاتمہ میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

[۲] تہذیب التہذیب ترجمہ امام ابوحنیفہ [۳] عقد الجید شاہ ولی اللہ صاحب بحث حقیقت جہاد

تا کہ دین کو اصول صحیحہ سے اخذ کر سکے اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ "فن حدیث میں امام ابوحنیفہ کا کبار مجتہدین میں ہونا اس سے ثابت ہے کہ ان کا مذہب محدثین میں معتبر خیال کیا جاتا ہے اور رداً قبولاً اس سے بحث کی جاتی ہے [1] علامہ موصوف نے اس کا سبب بھی بتایا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی روایتیں کم کیوں ہیں ہم خود اسکو مفصل لکھیں گے۔

محدثین میں اکثروں نے اس کا اعتراف کیا ہے علامہ ذہبی نے جو زمانہ مابعد کے تمام محدثین کے پیشوا اور امام ہیں حفاظ حدیث کے حالات میں ایک مفصل کتاب لکھی ہے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "یہ ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو علم نبویؐ کے حامل ہیں اور جن کے اجتہاد پر توثیق اور تضعیف، تصحیح و تزئیف میں رجوع کیا جاتا ہے علامہ موصوف نے تمام کتاب میں اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے اور کسی ایسے شخص کا حال نہیں لکھا جو علم حدیث کا بڑا ماہر نہ ہو، چنانچہ خارجہ بن زید بن ثابت کا ضمناً ایک موقع پر ذکر آ گیا ہے تو لکھتے ہیں کہ میں نے ان کو حفاظ حدیث میں اس لئے ذکر نہیں کیا کہ وہ قلیل الحدیث تھے، امام ابوحنیفہؒ کے محدث ہونے کا اس سے زیادہ کیا ثبوت درکار ہے کہ علامہ ذہبی نے اس کتاب میں ان کا ترجمہ لکھا ہے اور انکو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔

حافظ ابوالمحاسن دمشقی شافعی نے عقود الجمان میں ایک خاص باب باندھا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں **الباب الثالث والعشرون فی بیان کثرۃ حدیثه وكونه من اعيان الحفاظ المحدثين** یعنی تیئسواں باب اس بیان میں کہ وہ (امام ابوحنیفہ) کثیر الحدیث اور اعیان الحفاظ میں سے تھے قاضی ابو یوسف صاحب جن کو یحییٰ بن معین صاحب الحدیث کہتے ہیں اور علامہ ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث میں محسوب کیا ہے ان کا بیان ہے کہ ہم لوگ امام ابوحنیفہ سے مسائل میں بحث کرتے ہوتے تھے جب انکی رائے قائم ہو جاتی تھی تو میں حلقۂ درس سے اٹھ کر کوفہ کے محدثین کے پاس جاتا تھا اور ان سے مسئلہ کے متعلق حدیثیں دریافت کر کے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا امام صاحب ان حدیثوں میں سے بعض کو قبول کرتے تھے اور بعض کو فرماتے تھے کہ صحیح نہیں میں پوچھتا کہ آپکو کیونکر معلوم ہوا فرماتے کہ "کوفہ" میں جو

---

[1] تعجب ہے اسکی تصریح کے ہوتے ہوئے بعض کوتاہ بینوں نے امام صاحب کی ناواقفیت حدیث پر ابن خلدون کے ایک ضمنی قول سے استدلال کیا ہے جسکو خود ابن خلدون نے ایسے لفظوں سے بیان کیا ہے جو ضعف اور عدم وثوق پر دلالت کرتا ہے

علم ہے میں اس کا عالم ہوں [1]

یہ تمام باتیں اس بات کی شاہد ہیں کہ علم حدیث میں امام ابوحنیفہ کا کیا پایہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں نے امام ابوحنیفہ کو امام ابوحنیفہ نہیں بنایا، اگر وہ حافظ حدیث تھے تو اور لوگ بھی تھے اگر ان کے شیوخ حدیث کئی سو تھے تو بعض ائمہ سلف کے شیوخ کئی ہزار تھے اگر انہوں نے کوفہ وحرمین کی درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی تو اوروں نے بھی یہ شرف حاصل کیا تھا۔ امام ابوحنیفہ کو جس بات نے تمام ہمعصروں میں امتیاز دیا وہ اور چیز ہے جو ان سب باتوں سے بالاتر ہے یعنی احادیث کی تنقید اور بلحاظ ثبوت احکام، ان کے مراتب کی تفریق امام ابوحنیفہ کے بعد علم حدیث کو بہت ترقی ہوئی غیر مرتب اور منتشر حدیثیں یکجا کی گئیں صحاح کا التزام کیا گیا، اصول حدیث کا مستقل فن قائم ہو گیا جس کے متعلق سینکڑوں بیش بہا کتابیں تصنیف ہوئیں۔ زمانہ اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ باریک بینی اور دقت آفرینی کی کوئی حد نہ رہی تجربہ اور وقت نظر نے سینکڑوں نئے نکتے ایجاد کیے لیکن تنقید احادیث اصول درایت امتیاز مراتب میں امام ابوحنیفہؒ کی تحقیق کی جو حد ہے آج بھی ترقی کا قدم اس سے آگے نہیں بڑھتا۔

اس اجمال کی تفصیل اس وقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ فن حدیث کے آغاز اور طرز ترقی کا اجمالی نقشہ کھینچا جائے جس سے ظاہر ہو کہ روایتوں کا سلسلہ کیونکر پیدا ہوا اور کس کس دور میں اسکی کیا کیا حالیں بدلیں اسی سے بات کا اندازہ ہو سکے گا کہ احادیث کی تنقید میں اجتہاد رائے کا کس قدر کام ہے اور امام ابوحنیفہؒ کو اس لحاظ سے اپنے تمام ہم فنوں میں کیا خاص امتیاز حاصل ہے۔

اسناد وروایت کا سلسلہ اگرچہ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک ہی میں شروع ہو چکا تھا لیکن اس وقت تک جس قدر تھا آغاز نبوت سے تیرہ برس کا زمانہ تو ایسا پر آشوب زمانہ تھا کہ صحابہ کو اپنی جان کی پڑی تھی۔ اسناد وروایت کا کہاں موقع تھا۔ اسی ضرورت سے احکام وفرائض بھی کم تھے یعنی نماز کے سوا اور کچھ فرض نہ ہوا تھا کیونکہ اس زحمت میں اور فرائض کی تکلیف، تکلیف مالایطاق سے کم نہ تھی نمازیں بھی مختصر تھیں یعنی ظہر، عصر، عشاء سب میں صرف دو دو رکعتیں فرض تھیں جمعہ وعیدین سرے سے مامور بہ نہ تھے ۲ھ میں یعنی نبوت سے تیرھویں برس روزے فرض ہوئے زکوۃ کی نسبت اختلاف ہے علامہ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ ۹ھ میں فرض ہوئی حج کا

---

[1] عقود الجمان

حکم بھی اسی ھ میں ہوا۔ غرض آغاز نبوت سے ایک مدت تک نماز کے سوا نہ اور احکام صادر ہو۔
تھے نہ ان کے متعلق حدیثیں اور روایتیں وجود میں آئی تھیں صحابہ مسائل واحکام کے متعلق زیادہ
پرسش وجستجو نہیں کرتے تھے۔ خود قرآن میں حکم آچکا تھا ''**لا تسئلوا عن اشیآء ان تبدلکم
تسؤکم**۔''

عبداللہ بن عباس فرمایا کرتے تھے کہ ''میں نے رسول اللہ صلعم کے اصحاب سے کسی قوم
کو بہتر نہیں دیکھا تمام زمانہ نبوت میں صرف تیرہ مسئلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے
جو سب قرآن میں مذکور ہیں [1] اور صحابہ سے بھی اسی قسم کے اقوال منقول ہیں۔

جو احکام اور واقعات پیش آتے تھے ان میں بھی روایت کا سلسلہ نہیں جاری ہوا تھا۔
صحابہ خود رسول اللہ (صلعم) سے پوچھ لیا کرتے تھے اور واسطہ وروایت کی کم ضرورت پڑتی تھی
حدیثوں کو قلم بند کرنے کی اباحت نہ تھی صحیح مسلم میں روایت ہے، **لا تکتبو عنی شیئاً غیر
القرآن ومن کتب عنی شیئاً غیر القرآن فلیمحو**۔ رسول اللہ کے بعد حضرت ابوبکر کی
خلافت شروع ہوئی تو ابتداء ہی میں عرب کی بغاوت عام کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس سے فارغ ہو کر
روم وایران کی مہمیں شروع ہوگئیں اور انکی مختصر خلافت میں حدیثوں کی چنداں اشاعت نہ ہوسکی
حضرت عمرؓ نے سات برس خلافت اور ملک میں نہایت امن وامان رہا لیکن وہ دانستہ حدیثوں
کثرت کو روکتے رہے علامہ ذہبی نے طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اس خوف سے
حدیث بیان کرنے والا رسول اللہ کی طرف غلط روایت منسوب نہ کردے صحاب کو ہمیشہ حکم دیتے
تھے کہ حدیثیں کم بیان کریں [2] اور ایک بار انصار کے ایک گروہ کو کوفہ بھیجا چلتے وقت ان سے فرمایا
کہ تم لوگ کوفہ جارہے ہو وہاں ایک قوم سے ملوگے جو بڑی رقت سے قرآن تلاوت کرتے ہیں وہ
تمہاری پاس آئیں اور حدیثیں سننی چاہیں تو حدیثیں نہ بیان کرنا [3] اسی طرح عراق کو صحابہ
جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے خود انکی مشایعت کی اور ان سے پوچھا کہ ''جانتے ہو میں کیوں
تمہارے ساتھ آرہا ہوں'' لوگوں نے کہا تکرمہ علینا، یعنی عزت افزائی کے لئے، فرمایا ہاں، لیکن
ایک اور مقصد ہے وہ یہ کہ جہاں جارہے ہو وہاں کے لوگ اکثر قرآن کی تلاوت کیا کرتے ہیں انکو
حدیثوں میں نہ پھنسا لینا اور رسول اللہ صلعم سے کم روایت کرنا چنانچہ جب یہ لوگ قرظہ پہنچے تو لوگ

---

[1] مسند دارمی [2] طبقات الحفاظ ترجمہ حضرت عمرؓ [3] مسند دارمی

یہ سن کر کہ صحابہ تشریف لائے ہیں زیارت کو آئے اور حدیثوں کی خواہش ظاہر کی ان لوگوں نے اس بنا پر انکار کیا کہ حضرت عمرؓ نے منع کیا ہے [1] جب ابو ہریرہؓ نے ابو سلمہ سے پوچھا کہ آپ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی اسی طرح حدیثیں روایت کیا کرتے تھے بولے کہ ''نہیں ورنہ عمرؓ درے مارتے [2]

حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کی مجموعی خلافت بیس اکیس برس تک رہی اس میں احادیث کی زیادہ اشاعت ہوئی۔ صحابہ دور دور پہنچ گئے تھے ضرورتیں بڑھتی جاتی تھیں نئے نئے مسئلے پیش آتے تھے ان اسباب نے حدیث و روایت کے سلسلے کو بہت وسعت دی حضرت عثمانؓ کے اخیر زمانے میں بغاوت ہوئی جس کا خاتمہ خلیفۂ وقت کی شہادت پر ہوا۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ جماعت اسلام میں فرقہ بندیاں قائم ہوئیں۔ حضرت علیؓ کی خلافت شروع ہی سے پر آشوب رہی ان اختلافات اور فتن کے ساتھ وضع احادیث کی ابتدا ہوئی اگرچہ کثرت اور انتشار زیادہ تر زمانہ مابعد میں ہوا لیکن خود صحابہ کے عہد میں اہل بدعت نے سینکڑوں ہزاروں حدیثیں ایجاد کر لی تھیں مقدمہ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک بار بشیر عدوی حضرت عبد اللہ بن عباس کے پاس آیا اور حدیث بیان کرنی شروع کی انہوں نے کچھ خیال نہ کیا بشیر نے کہا ابن عباس میں رسول (صلعم) سے روایت کر رہا ہوں اور تم متوجہ نہیں ہوتے فرمایا کہ ''ایک زمانہ میں ہمارا یہ حال تھا کہ کسی کو قال رسول اللہ کہتے سنتے تو فوراً ہماری نگاہیں اٹھ جاتی تھیں اور کان لگا کر سنتے تھے لیکن جب سے لوگوں نے نیک و بد میں تمیز نہیں رکھی ہم صرف ان حدیثوں کو سنتے ہیں جن کو ہم خود بھی جانتے ہیں۔''

زبانی روایت سے گذر کر تحریروں میں بھی جعل شروع ہو گیا تھا مسلم نے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ عبد اللہ بن عباسؓ حضرت علیؓ کے ایک فیصلہ کی نقل لے رہے تھے بیچ بیچ میں الفاظ چھوڑتے جاتے تھے اور کہتے ہیں کہ ''واللہ علی نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا ہوگا۔'' اسی طرح ایک اور دفعہ عبد اللہ بن عباس نے حضرت علیؓ کی ایک تحریر دیکھی تو تھوڑے سے الفاظ کے سوا باقی سب عبارت مٹا دی۔

لوگوں کو وضع حدیث کی زیادہ جرأت اس وجہ سے ہوتی تھی کہ اس وقت تک اسناد

---

[1] طبقات الحفاظ ترجمہ حضرت عمرؓ [2] مسند دارمی

وروایت کا طریقہ جاری نہیں ہوا تھا جو شخص چاہتا تھا قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ کہہ دیتا تھا اور اثبات سند کے مواخذہ سے بری رہتا تھا ترمذی نے کتاب العلل میں امام ابن سیرین سے روایت کی ہے کہ پہلے زمانہ میں لوگ اسناد نہیں پوچھا کرتے تھے جب فتنہ پیدا ہوا تو اسناد کی پوچھ گچھ ہوئی تا کہ اہل سنت کی حدیثیں لی جائیں اور اہل بدعت کی ترک کی جائیں لیکن حدیث کی بے اعتباری اہل بدعت پر موقوف نہ تھی اسلیئے یہ احتیاط چنداں مفید نہ ہوئی اور غلطیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

بنی امیہ کا دور شروع ہوا اور بڑے زور شور سے حدیث نے ترویج پائی صحابہ کی تعداد جسقدر کم ہوتی جاتی تھی اسی قدر انکی طرف التفات بڑھتا جاتا تھا، تمدن میں بہت کچھ ترقی ہوگئی تھی نئی نئی قومیں مسلمان ہوتی جاتی تھیں ان نومسلموں کو ادھر تو اسلام کا نیا جوش تھا ادھر قوم فاتح کے مجمع میں عزت واثر پیدا کرنیکی اس سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہ تھی ان باتوں نے انکو معلومات مذہبی کا اسقدر شائق بنادیا تھا کہ خود عرب انکی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے غرض تمام ممالک اسلامیہ میں گھر گھر حدیث وروایت کے چرچے پھیل گئے اور سینکڑوں ہزاروں درسگاہیں قائم ہوگئیں۔

لیکن جسقدر اشاعت کو وسعت حاصل ہوتی جاتی تھی اعتماد اور وسعت کا معیار کم ہوتا جاتا تھا ارباب روایت کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ اس میں مختلف خیال، مختلف عادات، مختلف عقائد مختلف اقوام کے لوگ شامل تھے اہل بدعت جابجا پھیل گئے تھے اور اپنے مسائل کی ترویج میں مصروف تھے سب سے زیادہ یہ کہ پوری ایک صدی گذر جانے پر بھی کتاب کا طریقہ مروج نہیں ہوا تھا ان اسباب سے روایتوں میں اسقدر بے احتیاطیاں ہوئیں کہ موضوعات اور اغلاط کا ایک دفتر بے پایاں تیار ہو گیا یہاں تک امام بخاری نے اپنے زمانے میں صحیح حدیثوں کو جدا کرنا چاہا تو کئی لاکھ میں سے انتخاب کر کے جامع صحیح لکھی جس میں کل ۷۳۹۷ حدیثیں ہیں اس میں بھی اگر مکررات نکال ڈالی جائیں تو صرف ۲۷۶۱ حدیثیں باقی رہتی ہیں۔

سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں حدیثیں دانستہ لوگوں نے وضع کر لیں حماد بن زید کا بیان ہے کہ چودہ ہزار حدیثیں صرف ایک فرقہ زنادقہ نے وضع کر لیں [1]، عبد الکریم وضاع نے خود تسلیم کیا تھا کہ چار ہزار حدیثیں اسکی موضوعات سے ہیں [2] بہت سے ثقات اور پارسا تھے جو نیک نیتی سے فضائل اور ترغیب میں حدیثیں وضع کرتے تھے حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں کہ ان حدیثوں نے بہت ضرر پہنچایا کیونکہ ان واضعین کی ثقاہت اور زہد وورع کی وجہ سے یہ حدیثیں

اکثر مقبول ہوگئیں اور رواج پا گئیں۔

وضع کے بعد مساہلات، غلط فہمیوں، بے احتیاطیوں کا درجہ تھا جنکی وجہ سے ہزاروں اقوال رسول اللہ کی طرف بے قصد منسوب ہو گئے بعض محدثین کا قاعدہ تھا کہ حدیث کے ساتھ حدیث کی تفسیر بھی بیان کرتے جاتے تھے اور اکثر حروف تفسیر حذف کر دیتے تھے جس سے سامعین کو دھوکا ہوتا تھا اور وہ انکے تفسیری جملوں کو حدیث مرفوع سمجھ لیتے تھے تعجب یہ ہے کہ اس قسم کے مسامحات بڑے بڑے ائمہ فن سے صادر ہوئے۔ امام زہری جو امام مالک کے استاد اور حدیث کے ایک بڑے رکن تھے انکی نسبت علامہ سخاوی لکھتے ہیں۔**و کذا کان الزھری یفسر الحدیث کثیرا وربما اسقط رواۃ التفسیر** ،یعنی اسی طرح زہری اکثر حدیث کی تفسیر کرتے تھے اور وہ حروف جن سے اس عبارت کا تفسیر ہونا ظاہر ہو چھوڑ دیا کرتے تھے" وکیع کا بھی یہی حال تھا وہ اکثر حدیث کے بیچ بیچ میں "یعنی" کہہ کر مطلب بیان کرتے جاتے تھے اور اکثر یعنی" کا لفظ چھوڑ دیتے تھے جس سے سامعین کو اشتباہ ہوتا تھا کتب رجال واصول حدیث میں اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

بڑی آفت تدلیس کی تھی جس کا ارتکاب بڑے بڑے ائمہ فن کرتے تھے اس تدلیس نے اسناد کے اتصال کو بالکل مشتبہ کر دیا تھا اس کے سوا اور بہت سی بے احتیاطیاں تھیں جنکی تفصیل حدیث کی کتابوں میں ملتی ہے۔

غرض امام ابو حنیفہؒ کے زمانے میں احادیث کا جو دفتر تیار ہو چکا تھا، ہزاروں موضوعات اغلاط، ضعاف مدرجات سے بھرا ہوا تھا اس وقت امام بخاری و مسلم نہ تھے جو صحیح حدیثوں کے انتخاب کی کوشش کرتے امام ابو حنیفہ گو مہمات فقہ کی وجہ سے اس طرف متوجہ نہ ہو سکے تاہم انہوں نے روایتوں کی تنقید کی بنیاد ڈالی اور اس کے اصول وضوابط مقرر کئے ان کے اصول تنقید نہایت سخت قرار دیئے گئے ہیں یہاں تک کہ محدثین نے ان کو مشدد فی الروایۃ کا لقب دیا ہے تمام اور محدثین کی بہ نسبت امام صاحب کے قلیل الروایۃ ہونگی ایک یہ بھی وجہ ہے بلکہ تمام اور وجوہ کی نسبت یہ زیادہ قوی سبب ہے علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں۔ **والامام ابو حنیفۃ انما قلت روایتہ لما شدد فی شروط الروایۃ والتحمل** ،یعنی امام ابو حنیفہ کی روایتیں اسلئے کم ہیں کہ انہوں نے روایت اور تحمل کی شروط میں سختی کی۔"

حدیث کے متعلق پہلا اجمال خیال جو امام صاحب کے دل میں پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ بہت کم حدیثیں ہیں جو صحیح ہیں یا یہ کہ بہت کم حدیثیں ہیں جنکی صحت کا کافی ثبوت موجود ہے یہ صدا اگر چہ جدت کی وجہ سے کسی قدر ناموس صدا تھی اور اسی وجہ سے بعض بعض ارباب حدیث نے نہایت سخت مخالفت کی لیکن امام صاحب اس خیال پر مجبور بلکہ معذور تھے انہوں نے یہ رائے مقلدانہ نہیں قائم کی تھی، وہ اپنے زمانہ کے اکثر شیوخ سے ملے تھے اوران کے سرمایۂ حدیث سے متمتع ہوئے تھے حرمین کی بڑی بڑی درس گاہوں میں برسوں تعلیم پائی تھی، کوفہ، بصرہ، حرمین میں ارباب روایت کا جو گروہ موجود تھا برسوں کے تجربے سے انکی ذاتی اوصاف، اخلاق وعادات پر اطلاع حاصل کی تھی غرض اس مسئلہ کے متعلق اثباتاً یا نفیاً مجتہدانہ رائے قائم کرنے کیلئے جو شرطیں درکا تھیں سب ان میں موجود تھیں۔

اس خیال کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ یہ مسئلہ کسی نہ کسی پیرایہ میں انکے خاندانی تعلیم میں وراشتہ چلا آتا تھا حدیث وفقہ میں ان کے خاندان تعلیم کے مورث اول عبداللہ بن مسعود ہیں اور مذہب حنفی کی بنیاد زیادہ انہی کی روایات واستنباط پر ہے عبداللہ بن مسعود اگر چہ بہت بڑے محدث تھے لیکن اور محدثین صحابہ کی نسبت قلیل الروایۃ تھے جسکی وجہ یہ تھی کہ وہ متشدد اور محتاط تھے علامہ ذہبی ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ **کان ممن یتحری فی الاداء دلیشدو فی الروایۃ وکان یقل من روایۃ الحدیث**، یعنی عبداللہ بن مسعودؓ ادا میں تحری اور روایت میں تشدد کرتے تھے اور حدیث کی روایت کم کرتے تھے ابراہیم نخعی جو عبداللہ بن مسعودؓ کے بہ یک واسطہ شاگرد اور امام ابوحنیفہ کے بہ یک واسطہ استاد تھے ان کا بھی یہی مذہب تھا اور اسی وجہ سے وہ صیر فی الحدیث کہلاتے ہیں امام ابوحنیفہ نے گو اور بہت سی درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی لیکن انکی معلومات اور خیالات کا اصلی مرکز یہی خاندانی اثر تھا جس نے انکے دل میں یہ خیال پیدا کیا اور اسکو انکے ذاتی تجربے اور وقت نظر نے اور بھی قوت دی۔

امام صاحب کے اس خیال نے اگر چہ قبول عام کی سند حاصل نہیں کی تاہم وہ بالکل بے اثر نہیں رہا امام مالک وامام شافعی جو اجتہاد میں امام ابوحنیفہ سے متاخر ہیں ان کے اصول اجتہاد میں اس خیال کا صاف پرتو پایا جاتا ہے امام مالک نے روایت کے متعلق جو قید اور شرطیں لگائی ہیں وہ امام ابوحنیفہ کے شرائط کے قریب قریب ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مشددین فی الروایۃ

میں امام ابوحنیفہ و امام مالک کا نام ساتھ لیا جاتا ہے ابن الصلاح مقدمہ میں لکھتے ہیں۔ **ومن مذاهب للتشديد مذهب من قال لاحجة الا فيما رواه الراوى من حفظه وتذكره وذلك مروى عن مالك وابى حنيفة** ، یعنی مشددین کا یہ مذہب ہے کہ صرف وہ حدیث قابل حجت ہیں جس کو راوی نے اپنے حفظ سے یاد رکھا ہوا اور یہ قول مالک وابوحنیفہ سے منقول ہے، محدثین نے لکھا ہے کہ امام مالک نے اول جب موطا لکھی تو اس میں دس ہزار حدیثیں تھیں پھر امام مالک زیادہ تحقیق کرتے گئے تو یہ تعداد کم ہوتی گئی یہاں تک کہ چھ سات سورہ گئی امام شافعیؒ نے صاف لفظوں میں امام ابوحنیفہؒ کے خیالات ظاہر کیے ہیں۔

امام بیہقی نے روایت کی ہے کہ ایک دن ہرم قرشی نے امام شافعی سے کہا کہ آپ وہ حدیثیں لکھوایئے جو رسول اللہ (صلعم) سے ثابت ہیں انہوں نے جواب دیا کہ "ارباب معرفت کے نزدیک صحیح حدیثیں کم ہیں کیونکہ ابو بکر صدیق نے جو حدیثیں رسول اللہ (صلعم) سے روایت کیں انکی تعداد ستر سے زیادہ نہیں ہے۔ عمر ابن الخطابؓ باوجود اس کے کہ رسول اللہ صلعم کے بعد مدت تک زندہ ہے انکی روایت سے پچاس حدیثیں بھی ثابت نہیں حضرت عثمانؓ کا بھی یہی حال ہے حضرت علیؓ اگرچہ لوگوں کو حدیث سیکھنے کی ترغیب دلاتے تھے لیکن ان سے بھی کم حدیثیں مروی ہیں کیونکہ وہ مطمئن نہیں رہے ان سے جو حدیثیں مروی ہیں اکثر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت کی ہیں ان لوگوں کے سوا اور صحابہ سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں لیکن اہل معرفت کے نزدیک وہ تمام روایتیں صحیح سند سے ثابت نہیں[1]۔

ان باتوں سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ امام ابوحنیفہ معتزلہ کی طرح احادیث کے منکر تھے یا صرف دس بیس حدیثوں کو تسلیم کرتے تھے ان کے شاگردوں نے خود ان سے سینکڑوں حدیثیں روایت کی ہیں موطا امام محمد، کتاب الآثار، کتاب الحج جو عام طور پر متداول ہیں ان میں بھی امام صاحب سے بیسیوں حدیثیں مروی ہیں البتہ اور محدثین کی نسبت انکی احادیث مسلمہ کی تعداد کم ہے اور اسکی وجہ وہی شروط روایت کی سختی ہے امام صاحب نے روایت کے متعلق جو شرطیں اختیار کیں کچھ تو وہی ہیں جو اور محدثین کے نزدیک مسلم ہیں کچھ ایسی ہیں جن میں وہ منفرد ہیں یا صرف امام مالک اور بعض اور مجتہدین ان کے ہمنوا ہیں۔

---

[1] مناقب الشافعیؒ از امام رازی فصل ثامن شرح مذہب شافعی

ان میں سے ایک یہ مسئلہ ہے کہ ''صرف وہ حدیث حجت ہے جس کو راوی نے اپنے کان سے سنا ہو اور روایت کے وقت تک یاد رکھا ہو'' یہ قاعدہ بظاہر نہایت صاف ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اس کی تعریفیں نہایت وسیع اثر رکھتی ہیں اور عام محدثین کو ان سے اتفاق نہیں ہے محدثین کے نزدیک ان پابندیوں سے روایت کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے اور اس سے ہم کو بھی انکار نہیں لیکن اس کا فیصلہ ناظرین خود کر سکتے ہیں کہ احتیاط مقدم ہے یا روایت کی وسعت ہم بعض تفریعات کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوگا کہ امام ابوحنیفہ کو کس خیال نے اس قسم کی سختیوں پر مجبور کیا تھا۔

اکثر شیوخ کا حلقۂ درس نہایت وسیع ہوتا تھا یہاں تک کہ ایک ایک مجلس میں دس دس ہزار سامعین جمع ہوتے تھے اس وقت متعدد مستملی یعنی نائب جا بجا بٹھائے جاتے تھے کہ شیخ کے الفاظ کو دور والوں تک پہنچائیں بہت سے ایسے لوگ ہوتے تھے جن کے کانوں میں شیخ کا ایک لفظ بھی نہیں پہنچتا تھا وہ صرف مستملی کے الفاظ سن کر حدیث روایت کرتے تھے اب بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ جس شخص نے صرف مستملی سے سنا وہ اصل شیخ کی نسبت حدثنا کہہ سکتا ہے یا نہیں اکثر ارباب روایت کا مذہب ہے کہ کہہ سکتا ہے، امام ابوحنیفہ اس کے خلاف ہیں ائمہ محدثین سے حافظ ابونعیم، فضل بن دکین، زائد بن کدامہ امام صاحب کے ہمنوا[1] ہیں، حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ مقتضائے عقل ہی یا امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے لیکن عام مذہب میں آسانی[2] ہے۔

ابوحنیفہ کو اس احتیاط پر جس چیز نے مجبور کیا تھا وہ یہ تھی کہ ان کے زمانہ تک روایت بالمعنی کا طریقہ نہایت عام تھا اور بہت کم لوگ تھے جو الفاظ حدیث کی پابندی کرتے تھے اس لئے روایت میں تغیر و تبدل کا احتمال ہر واسطہ میں بڑھتا جاتا تھا کم از کم یہ کہ ہر روایت پہلے واسطہ میں جس قدر قوی ہوتی تھی دوسرے واسطہ میں اس کا وہ پایہ قائم نہیں رہ سکتا بے شبہ مستملی کے مقرر کرنے کا طریقہ قائم رکھنا ضروری تھا کیونکہ اکثر موقعوں پر بغیر مستملی کے کام نہیں چل سکتا تھا لیکن ناانصافی تھی کہ جس شخص نے بلا واسطہ شیخ سے سنا ہو اور جس نے مستملی سے روایت کی ہو دونوں کا ایک ہی درجہ قرار دیا جائے مستملی کبھی کبھی نہایت غافل بے سمجھ ہوتے تھے اسلئے غلطیوں کا احتمال اور بھی زیادہ ہو جاتا تھا۔

---

[1] فتح المغیث صفحہ ۱۸۷۔۸ [2] ایضاً صفحہ ۱۱۸

اس طرح بلکہ اس سے زیادہ غیر محتاط طریقہ یہ تھا کہ اخبرنا وحدثنا کو بعض بعض محدثین نہایت عام معنوں میں استعمال کرتے تھے امام حسن بصری نے متعدد روایتوں میں کہا ہے حدثنا ابوھریرۃ۔ حالانکہ وہ ابوہریرہ سے کبھی نہیں ملے تھے انہوں نے اسکی یہ تاویل کی تھی کہ ابوہریرہ نے جب وہ حدیث بیان کی تھی تو اس شہر میں وہ موجود تھے۔

اسی طرح اور شیوخ صحابہ کی نسبت حدثنا کا لفظ استعمال کرتے تھے اور معنی یہ لیتے تھے کہ ان کے شہر والوں نے ان شیوخ سے سنا تھا محدث بزار نے لکھا ہے کہ حسن بصری نے ان لوگوں سے روایت کی ہے جن سے وہ کبھی نہیں ملے اور تاویل کرتے تھے کہ انکی قوم نے وہ حدیث ان لوگوں سے سنی تھی [1]۔ یہ امر علاوہ اس کے کہ ایک قسم کی غلط بیانی تھی جو حدیث کی اسناد کو مشتبہ کر دیتا تھا کیونکہ راوی نے جب خود شیخ سے حدیث نہیں سنی تو بیچ میں کوئی واسطہ ہوگا اور چونکہ راوی نے اس کا نام نہیں بتایا اسلئے اس کے ثقہ و غیرہ ثقہ ہونے کا حال نہیں معلوم ہوسکتا صرف حسن ظن پر مدار رہ گیا ایسے شخص نے جس سے سنا ہوگا وہ ضرور قابل استناد ہوگا امام ابوحنیفہ نے اس طریقہ کو نا جائز قرار دیا اور ان کے بعد اور ائمہ حدیث نے بھی انکی متابعت کی۔

ارباب روایت کا یہ طریقہ تھا کہ جب کسی شخص سے کچھ حدیثیں سنیں اور قلم بند کرلیں تو ان اجزاء سے روایت کرنی ہمیشہ جائز سمجھتے تھے اسکو اسقدر وسعت دی گئی کہ راوی کو ان حدیثوں کے الفاظ و معانی کچھ یاد نہ رہے ہوں تاہم اس بنا پر کہ اجزاء اس کے پاس موجود ہیں انکی روایت کرسکتا ہے امام ابوحنیفہ نے اس طریقہ کو قائم رکھا لیکن یہ قید لگائی کہ حدیث کے الفاظ و مطالب محفوظ ہونے چاہیں ورنہ روایت جائز نہیں۔

یہ مسئلہ بھی اگرچہ عام طور پر نہیں تسلیم کیا گیا، تاہم جیسا کہ محدث سخاوی نے تصریح کی ہے امام مالک اور بہت سے ائمہ فن نے اسکی موافقت کی امام بخاری و مسلم وغیرہ کے زمانہ میں اس قید کی چنداں ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ اس وقت روایت باللفظ کا عام رواج ہو چکا تھا لیکن امام ابو حنیفہ کے عہد تک حدیثیں زیادہ تر بالمعنی روایت کی جاتی تھی اسلئے اگر راوی کو الفاظ حدیث موقع حدیث شان نزول وغیرہ یاد نہیں ہوتے تھے تو روایت کا بعینہا ادا کرنا قریباً ناممکن ہوتا تھا اسی ضرورت سے امام ابوحنیفہ نے اس طریقہ کو محدود کر دیا اور انصاف بھی یہ ہے کہ ایسا کرنا ضروری تھا۔

---

[1] فتح المغیث صفحہ ۱۷۱۔

سب سے زیادہ مہتم بالشان اور قابل بحث مسئلہ یہ ہے کہ روایت بالمعنی جائز ہے یا نہیں یا یہ کہ ایسی روایت قطعاً قابل حجت ہے یا نہیں یہ مسئلہ ہمیشہ مختلف فیہ رہا ہے اور اب بھی ہے امام شافعی نے روایت کی ہے کہ بعض تابعین نے ایک حدیث متعدد صحابہ سے سنی جس کو سب نے مختلف لفظوں سے بیان کیا لیکن مطلب ایک تھا انہوں نے کسی صحابی سے یہ حقیقت بیان کی صحابی نے جواب دیا جس معنی مختلف نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں اگرچہ امام شافعی نے تابعی کا نام نہ بتایا جس سے روایت کی قوت اور ضعف کا اندازہ ہو سکتا تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض صحابہ روایت بالمعنی جائز سمجھتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے بخلاف اس کے بعض صحابہ مثلاً عبداللہ بن مسعود کو روایت باللفظ پر اصرار تھا علامہ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں ان کے حالات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ "وہ روایت میں سختی کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو جھڑک دیتے تھے کہ الفاظ کے ضبط میں بے پروائی نہ کریں عبداللہ بن مسعود جب کبھی بالمعنی روایت کرتے تھے تو ساتھ ہی یہ الفاظ استعمال کرتے، **او مثلہ او نحوا او شبیہٌ بہ اما فوق ذلکَ و اما دون ذلکَ و اما قریب من ذالک** یعنی رسول اللہ صلعم نے اس طرح فرمایا تھا یا اس کے مثل یا اس کے مشابہ یا اس سے کچھ زیادہ یا کم یا اس کے قریب قریب فرمایا تھا ابوالدردار کا بھی یہی حال تھا وہ حدیث بیان کر کے کہا کرتے تھے۔ **ھذا او نحوہ ھذا او شکلہ**[1]۔

حضرت عمرؓ جو لوگوں کو روایت حدیث سے منع کیا کرتے تھے ان کا بھی غالباً یہی منشا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ الفاظ کم یاد رہ سکتے ہیں اور معنی کی عام اجازت میں تغیر و تبدل کا احتمال بڑھتا جاتا ہے۔

صحابہ کے دور کے بعد بھی یہ مسئلہ طے نہ ہو سکا۔ تابعین کے دو گروہ تھے اور خود امام ابوحنیفہ کے استاد الاستاد روایت بالمعنی کے قائل تھے آگے چل کر تو گویا اتفاق عام ہو گیا کہ روایت بالمعنی جائز ہے چنانچہ اصول حدیث کی کتابوں میں جمہور کا یہی مذہب بیان کیا جاتا ہے مجتہدین میں سے صرف امام مالک اس کے خلاف ہیں محدثین کا ایک گروہ جن میں امام مسلم، قاسم بن محمد، محمد بن سیرین رجا ابن حیاۃ، ابوزرعہ، سالم بن ابی الجعد، عبدالمالک بن عمر داخل ہیں روایت باللفظ پر عمل کرتا تھا لیکن عام محدثین جواز ہی کے قابل ہیں اور درحقیقت ایک ایسا فرقہ جس کا عام

---

[1] فتح المغیث

میلان ہر حالت میں کثرت روایت کی طرف ہو جواز ہی کا قائل ہو سکتا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اکثر تابعین اور صحابہ نے بالمعنی حدیثیں روایت کیں اور اگر شروع سے یہ قید لگائی جائے تو روایت کا دائرہ اس قدر تنگ ہو جاتا ہے کہ مسائل و احکام کیلئے کچھ باقی نہیں رہتا لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ روایت بالمعنی میں اصل روایت کا اصلی حالت پر قائم رکھنا اس قدر مشکل ہے کہ قریباً ناممکن ہے زبان کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ مرادف الفاظ بھی یکساں اثر نہیں رکھتے اور معنی کی حیثیتوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ مجوزین نے مرادف وغیرہ کی قید بھی نہیں رکھی اور ادائے مطلب کو نہایت وسعت دی ہے صحابہ سے زیادہ کوئی شخص رسول صلعم کے الفاظ و مطالب کا انداز نہیں ہو سکتا۔ اول تو وہ زباندان اور زبان کے حاکم تھے اس کے ساتھ شرف صحبت کی وجہ سے رسول اللہ کی طرز ادا طریقہ گفتگو اندازِ کلام فحوائے سخن سے خوب واقف تھے تاہم کتب حدیث میں اسکی متعدد نظیریں ملتی ہیں کہ خود صحابہ سے ادائے مطلب میں کمی یا زیادتی ہوگئی۔

ابن ماجہ میں روایت ہے کہ ابو موسیٰ اعشری نے آنحضرت صلعم سے روایت کی ان **المیت یعذب ببکاء الحی اذا قالو اوا عضداء واکاسباہ وانا صراہ واجبلہ** یعنی "جب مردہ پر یہ الفاظ کہہ کر رو جاتا ہے تو اسکو عذاب دیا جاتا ہے کسی نے حضرت عائشہ سے کہا کہ ابن عمرؓ یہ حدیث بیان کرتے تھے حضرت عائشہؓ نے کہا میں یہ نہیں کہتی کہ ابن عمرؓ جھوٹ کہتے ہیں لیکن ان کو سہو ہوا واقعہ یہ ہے کہ ایک یہودی عورت مر گئی اس کے گھر والے اس پر روتے تھے آنحضرت صلعم نے سنا تو فرمایا اس کے گھر والے رو رہے ہیں اور اس پر قبر میں عذاب ہو رہا ہے ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے قرآن کی یہ آیت پڑھی "**لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِزرَ اُخریٰ**"۔ جس سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ایک شخص کے فعل کا دوسرا ذمہ دار نہیں ہو سکتا گھر والے روتے ہیں تو ان کا قصور ہے مردے نے گناہ کیا ہے تو اس پر عذاب کیا جائے دیکھو اس حدیث میں رسول اللہ صلعم نے یہودیہ عورت کا معذب ہونا بطور ایک واقعہ بیان کیا تھا۔ راوی نے رونے کو اس کا سبب قرار دیا اور حدیث کے یہ الفاظ بیان کئے "**ان المیت یعذب ببکاء الحی**"[1] "یعنی مردوں کو زندوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔

---

[1] تاریخ کبیر علامہ ابو جعفر جریر طبری صفحہ ۱۳۳۲

اسی طرح غزوۂ بدر کے واقعہ میں عام روایت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے قلیب پر کھڑے ہوکر فرمایا **ھل وجدتم ما فعل ربکم حقا**، لوگوں نے عرض کیا کہ آپ مردوں سے خطاب فرماتے ہیں ''ارشاد ہوا کہ جو میں نے کہا ان لوگوں نے سن لیا'' لیکن یہ واقعہ حضرت عائشہؓ کے سامنے بیان کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہؐ صلعم نے یہ نہیں فرمایا تھا بلکہ یہ الفاظ کہے تھے **لقد علموا ان ما دعوتھم حق**[1] یعنی ان لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ جس چیز کی میں نے دعوت دی تھی حق ہے دیکھو ان دونوں جملوں کے مفہوم میں کسقدر فرق ہے اور اس سے سماع موتی کے مسئلے پر کیسا مختلف اثر پڑتا ہے۔

غرض جب صحابہ سے اس قسم کے مسامحات واقع ہوتے تھے تو دوسرے اور تیسرے دور کا کیا ذکر ہے لطف یہ ہے جو لوگ روایت بالمعنی کے قائل ہیں انہوں نے چند الفاظ مثالاً بتائے ہیں کہ ان کو دوسرے لفظوں میں اس طرح ادا کرتے ہیں اور معنی مطلق فرق نہیں پیدا ہوگا حالانکہ غور سے دیکھئے تو ان الفاظ کے اثر میں صاف تفاوت نظر آتا ہے محدث سخاوی لکھتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے **اقتلو الاسودین الحیۃ والعقرب** اب بجائے اس کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ **امر بقتلھما** ۔ محدث سخاوی کے نزدیک اس مثال میں الفاظ کے اختلاف نے معنی میں کچھ فرق نہیں پیدا کیا حالانکہ اقتلو اور امر بالقتل میں صریح تفاوت ہے اقتلو اگرچہ امر کا صیغہ ہے، لیکن اس میں وہ تحکم اور تاکید نہیں ہے جو امر میں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے ان مشکلات کا اندازہ کر کے نہایت معتدل طریقہ اختیار کیا جو حدیثیں ان کے زمانے سے پہلے بالمعنی روایت ہو چکی تھیں اور محدثین میں شائع تھیں ان کے قبولیت سے تو چارہ نہ تھا ورنہ روایت کا تمام دفتر بے کار ہو جاتا اس لئے امام صاحب نے ان حدیثوں کو قبول کیا لیکن قید یہ لگائی کہ رواۃ حدیث فقیہہ ہوں یعنی الفاظ کے اثر اور مطالب کی تعبیر سے واقف ہوں تعبیر مطالب کا احتمال پھر بھی باقی رہتا ہے لیکن احادیث کا مدار (جیسا کہ محدثین نے تصریح کردی ہے) ظن غالب پر ہے اسلئے جب تک کوئی مخالف دلیل موجود نہ ہو روایت بالمعنی قابل عمل ہوگی امام صاحب نے ان احادیث کو بھی قبول کیا جن کے رواۃ ثقہ ہوں اور فقیہہ نہ ہوں لیکن ان کا درجہ پہلے کی نسبت کم قرار دیا اور ان میں اصول درایت کی زیادہ ضرورت سمجھی امام صاحب کے اس

---

[1] تاریخ کبیر علامہ ابوجعفر جریر طبری صفحہ ۱۳۳۲

اصول سے اور ائمہ نے بھی اتفاق کیا الفیتہ الحدیث میں ہے کہ جو شخص مدلول الفاظ کو اچھی طرح نہیں سمجھتا اس کو روایت باللفظ ضروری ہے البتہ جو شخص مطالب کا اندازہ داں ہے اسکی نسبت اختلاف ہے کثرت رائے اس طرف ہے کہ وہ الفاظ کا پابند نہیں لیکن امام ابوحنیفہ نے اس اجازت کو صحابہ اور تابعین تک محدود کر دیا اور لوگوں کے لیے روایت بالالفاظ کی قید لگائی اور امام طحاوی نے بسند متصل ان سے روایت کی ہے کہ صرف وہ حدیث روایت کرنی چاہیے جو روایت کرنے کے وقت اسی طرح یاد ہو جس طرح سننے کے وقت یاد تھی [1]۔ ملا علی قاری اس روایت کو نقل کر کے لکھتے اس کا حاصل یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ روایت بالمعنی کو جائز رکھتے تھے۔

اس پابندی میں اگرچہ امام مالک اور بعض محدثین نے امام ابوحنیفہ سے اتفاق کیا ہے فتح المغیث میں ہے وقیل [2] **لا تجوز له الروایة بالمعنی مطلقات قال له طائفة من المحدیثن والفقها والاصولیین من الشافعیة وغیرهم قال القرطبی وهو الصحیح من مذهب مالک** لیکن عام ارباب روایت اس سختی کے کیونکر پابند ہو سکتے تھے چنانچہ ایک بڑے فرقہ نے مخالفت کی اور امام صاحب کو مشدد فی الروایۃ ٹھہرایا تاہم انصاف یہ ہے کہ جو اصول امام صاحب نے اختیار کیا وہ ضروری اور نہایت ضروری تھا خود حدیث میں آیا ہے۔

یعنی رسول اللہ نے فرمایا کہ خدا اس شخص کو شاداب کرے جس نے ہم سے کچھ سنا اور اسکو اسی طرح پہنچایا جیسا کہ ہم سے سنا تھا اس سے زیادہ اس بات میں کسی دلیل کی کیا ضرورت ہے صحابہ میں سے جو لوگ روایت باللفظ کو غیر ضروری سمجھتے تھے ممکن ہے کہ یہ حدیث انکو نہ پہنچی ہو چنانچہ جن صحابہ کی نسبت ثابت ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو سنا تھا مثلاً عبداللہ بن مسعود جو اس حدیث کے راوی ہیں وہ الفاظ کے پابند تھے امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں یہ حدیث عام ہو چکی تھی اسلئے ان کو اسکی تعمیل میں کیا عذر ہو سکتا تھا۔

فن حدیث میں سب سے بڑا کام امام ابوحنیفہ نے یہ کیا کہ درایت کے اصول قائم کئے

---

[1] شرح مسند امام اعظم از ملا علی قاری صفحہ ۳۔

[2] یعنی کہا گیا کہ روایت بالمعنی مطلقاً جائز نہیں محدثین وفقہا واصولیین شافعیہ کا ایک گروہ اس قول کا قائل ہے اور قرطبی نے کہا کہ امام مالک کا صحیح مذہب یہی ہے

اور انکو احادیث کی تحقیق وتنقید میں برتا ئن حدیث کی شاخ یعنی روایت پر ہمارے علماء نے جس قدر توجہ کی اسکی کوئی نظیر دنیا کی گذشتہ اور موجودہ تاریخ میں نہیں مل سکتی لیکن یہ افسوس ہے کہ اصول درایت کے ساتھ چنداں اعتنا نہیں کیا گیا حافظ ابن حجر کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن میں بعض تصنیفیں لکھی گئیں وہ اسقدر کم اور غیر متعارف ہیں کہ گویا نہ ہونے کے برابر ہیں اصول حدیث ایک مستقل فن بن گیا ہے اور بڑی بڑی کتابیں جو اس میں لکھی گئیں عموماً متداول ہیں لیکن ان سے اصول درایت کے متعلق بہت کم واقفیت حاصل ہوتی ہے حالانکہ یہی اصول فن حدیث کے نہایت ضروری اجزاء ہیں یہ عزت صرف امام ابوحنیفہ کو حاصل ہے کہ اس فن کا نام ونشان بھی نہ تھا اس وقت انکی نگاہ باریک نکتوں پر پہنچی بے شبہ صحابہ کی تاریخ میں جستہ جستہ اصول درایت کے آثار نظر آتے ہیں اور درحقیقت وہی امام ابوحنیفہ کے لئے دلیل راہ بنے لیکن وہ باتیں عام مسائل کے ہجوم میں ایسی گم اور ناپید تھیں کہ ان پر عام لوگوں کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی۔

روایات کی صحت وعدم صحت کا مدار ہمیشہ راویوں کے اعتبار وعدم اعتبار پر نہیں ہوتا، اکثر ایسا ہوتا ہے وہ ایک دفعہ کی روایت جس سند سے بیان کی جاتی ہے اس کے تمام راوی ثقہ اور قابل اعتبار ہوتے ہیں لیکن واقعہ صحیح نہیں ہوتا حدیث میں بھی اسکی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں اسلئے ضروری ہے کہ صرف رواۃ کی بناء پر احادیث کا فیصلہ نہ کیا جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ اصول درایت کے مطابق ہیں یا نہیں۔

درایت سے یہ مطلب ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو اس پر غور کیا جائے کہ وہ طبیعت انسانی کے اقتضاء زمانہ کی خصوصتیں منسوب الیہ کے حالات اور دیگر قرائن عقلی کے ساتھ کیا نسبت رکھتا ہے اگر اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو اسکی صحت بھی مشتبہ ہوگی یعنی یہ احتمال ہوگا کہ روایت کے تغیرات نے واقعہ کی صورت بدل دی ہے اس قسم کے قواعد حدیث کی تحقیق وتنقید میں بھی استعمال کئے جاتے ہیں اور انہیں کا نام اصول درایت ہے علامہ ابن جوزی جو فن حدیث میں بڑا پایہ رکھتے ہیں لکھتے ہیں [1] کہ:

جس حدیث کو تم دیکھو عقل کے مخالف یا اصول کے مناقض ہے تو یہ سمجھ لو کہ وہ موضوع ہے اس میں تحقیق حال کی کچھ ضرورت نہیں ہے اسی طرح وہ حدیث بھی موضوع ہے جو حس و

---

[1] ابن جوزی کے الفاظ جیسا کہ فتح المغیث میں منقول ہے یہ ہیں

مشاہدہ سے باطل ثابت ہو یا قرآن حدیث متواتر اجماع قطعی کے خلاف ہو اور قابل تاویل نہ ہو یا جس میں ایک معمولی سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو یا ذرا سے کام پر بڑے انعام کا وعدہ ہو اسکی طرح حدیثیں واعظوں اور صوفیوں کی روایتوں میں پائی جاتی ہیں۔

امام ابوحنیفہ نے درایت کے جو اصول قائم کیے ہیں ان میں سے بعض ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

ا:۔ جو حدیث عقل قطعی کے مخالف ہو وہ اعتبار کے قابل نہیں[1] یہ وہی قاعدہ ہے جس کو ابن جوزی نے تمام اصول درایت پر مقدم رکھا ہے ابن جوزی چھٹی صدی میں تھے اس وقت اسلام علوم اوج کمال پر پہنچ گئے تھے اور فلسفیانہ خیالات کا اثر زیادہ عام ہو گیا تھا لیکن امام ابوحنیفہ کے زمانہ تک مذہب میں عقل کا نام لینا ایک جرم عظیم تھا۔ امام صاحب نے اول اول جب یہ قاعدہ قرار دیا اور روایات میں برتا تو سخت مخالفت ہوئی اس قسم کی حدیثیں جن میں ناممکن اور محال واقعات بیان کیے جاتے ہیں امام صاحب کے سامنے پیش کی جاتی تھیں تو وہ ان سے انکار کرتے تھے یہ امر عام لوگوں پر گراں گذرتا تھا کیونکہ ان لوگوں کے خیال میں روایات کی تحقیق وتنقید کا مدار صرف رواۃ کی حالت پر تھا اصول روایت سے غرض نہ تھی زمانۂ مابعد میں اگرچہ یہ قاعدہ اصول حدیث میں داخل کرلیا گیا، لیکن ارباب روایت نے اسکو بہت کم برتا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بیسوں مزخرف اور دوراز کار حدیثیں قبول عام کے شرف سے ممتاز ہیں۔

تلک الغرانیق العلی کی حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ کی زبان سے (سورہ نجم کی تلاوت کے وقت) بتوں کی تعریف میں یہ الفاظ ادا ہوئے۔ "**تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھم لترتجیٰ**"۔ یعنی یہ بت بہت معزز ہیں اور انکی شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے۔" اور

---

[1] کل حدیث رائیہ یخالفہ العقول اوینا قض الاصول فاعلم انہ موضوع فلا [illegible] اعتبارھای لاتعتبر رواتہ ولا تنظر فی جرحھم او یکون مما یدفعہ الحس والمشاھدۃ اومبائنا النص الکتاب او السنتہ المتواترۃ والاجماع القطعی حیث لا یقبل شی من ذالک التاویل او تیضمن الافراط بالوعید الشدید علی الامرالیسیر اوبالوعدالعظیم علی الفعل الیسیر وھذالاخیر کثیر موجود فی حدیث القصاص والط[illegible] رقیتہ

[1] اس اصول کو علامہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب کیا ہے۔

یہ الفاظ شیطان نے آنحضرت صلعم کی زبان میں ڈال دیئے تھے چنانچہ تلاوت کے بعد جبرئیلؑ آئے اور انہوں نے یہ شکایت کی کہ میں نے تو یہ الفاظ آپ کو نہیں سکھائے تھے آپ نے کہاں سے پڑھ دیئے، اس حدیث کو امام صاحب کے اصول کے موافق بعض محدثین مثلاً قاضی عیاض وابوبکر بیہقی وغیرہ نے غلط کہا لیکن محدثین کا ایک بڑا گروہ اسکواب بھی صحیح تسلیم کرتا ہے متاخرین میں حافظ ابن حجر سے زیادہ نامور کوئی محدث نہیں گذرا، وہ بڑے زور شور سے اس حدیث کی تائید کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ چونکہ اس کے رواۃ ثقہ میں اسلیئے اسکی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ردالشمس کی حدیث کو جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علیؓ کی نماز عصر قضا ہوگئی تھی اسلیئے آنحضرتؐ صلعم کی دعائے آفتاب غروب ہونے کے بعد پھر طالع ہوا۔ محدث ان ابن جوزی نے جرأت کر کے موضوع کہا لیکن حافظ ابن حجر وجلال الدین سیوطی وغیرہ نے نہایت شدت سے مخالفت کی امام صاحب کے زمانے میں اس سے زیادہ مخالفتیں ہوئیں لیکن وہ ان باتوں کی کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ لفظ عقل سے امام صاحب کی مراد وہ وسیع معنی نہیں جو آجکل کے تعلیم یافتہ لوگوں نے قرار دیئے ہیں جسکی رو سے شریعت کے بہت سے اصلی مسائل برباد ہوئے جاتے ہیں۔

۲:۔ جو واقعات تمام لوگوں کو رات دن پیش آیا کرتے ہیں ان کے متعلق اگر رسول اللہ سے کوئی ایسی روایت منقول ہو جو اخبار آحاد کے درجہ سے زیادہ نہ ہو تو وہ روایت مشتبہ ہوگی یہ اصول اس بناء پر ہے کہ جو واقعات تمام لوگوں کو پیش آیا کرتے تھے ان کے متعلق جو کچھ آنحضرت صلعم کا ارشاد تھا اسکی ضرورت تمام لوگوں سے متعلق ہتی تھی اسلیئے صرف ایک آدھ شخص تک اس روایت کا محدود رہنا درایت کے خلاف ہے۔

اکثر مفسرین نے تصریح کی ہے کہ امام ابوحنیفہ اس روایت کو قبول نہیں کرتے تھے جو قیاس اس کے مخالف ہو۔ اگرچہ یہ قول محض بے اصل نہیں ہے لیکن اسکی تعبیر میں لوگوں نے اکثر غلطی کی ہے اور انہی غلط تعبیرات کا اثر ہے کہ امام ابوحنیفہ کی نسبت ارباب ظاہر میں بہت سی بدگمانیاں قائم ہوگئیں ان لوگوں نے امام صاحب کے مقصد ومنشا پر کافی غور نہیں کیا اور عام رائے قائم کرلی کہ وہ قیاس کی حدیث پر مقدم سمجھتے ہیں امام صاحب سے اس مسئلہ کے متعلق جو اقوال منقول ہیں وہ صریح اس دعوے کے خلاف ہیں مسائل فقہ میں متعدد مثالیں موجود ہیں جن میں امام ابوحنیفہ نے حدیث واثر کی وجہ سے قیاس کو مطلقاً ترک کر دیا ہے امام محمد اس بحث میں کہ نماز میں

قہقہہ لگانا ناقض وضو ہے امام ابوحنیفہ کی طرف سے استدلال کرتے ہیں اور لکھتے ہیں "**لو لا ماجاء من الاثار کان القیاس علی ماقال اهل المدینة ولکن لا قیاس مع اثر ولا ینبغی الا ان ینقاد الاثار** ۔" یعنی قیاس وہی ہے جو اہل مدینہ کہتے ہیں لیکن حدیث کے ہوتے قیاس کوئی چیز نہیں اور صرف حدیث ہی کی پیروری کرنی چاہیے اس سے زیادہ اس بات میں کی تصریح ہوسکتی ہے عقود الجمان کے مصنف نے مختلف رِوایتوں سے امام ابوحنیفہ کے خاص اقوال نقل کیے ہیں کہ حدیث کے مقابلہ میں قیاس کو دخل نہیں امام جعفر صادقؒ سے امام صاحب نے جو گفتگو کی تھی اس میں بھی اس خیال کا اظہار کیا ہے۔

ان تصریحات کو دیکھ کر بعضوں نے اس انتساب میں تخصیص کی اور دعویٰ کیا کہ جو حدیث قیاس جلی کے مخالف ہو اسکو امام صاحب قبول نہیں کرتے" عبدالکریم شہرستانی نے اصحاب الرائے کے بیان میں جہاں امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کا ذکر آیا ہے لکھا ہو **وربما یقدمون القیاس الجلی علیٰ احاد اخبار** " یعنی یہ لوگ اکثر قیاس جلی کو آحاد پر ترجیح دیتے ہیں" امام رازی نے بھی مناقب الشافعی میں اس کی جابجا تصریح کی ہے اور اس بناء پر امام ابوحنیفہؒ کے مقابلہ میں امام شافعی کی ترجیح کے وجوہ قائم کیے ہیں۔

میں نے بہت کچھ جدوجہد کی اس مسئلہ کے متعلق امام صاحب کا کوئی صریح قول مل سکے لیکن نہ مل سکا جن لوگوں نے امام صاحب کی طرف اس قول کو منسوب کیا ہے غالباً استنباط سے کام لیتے ہیں صریح قول نہیں پیش کر سکتے بے شبہ حنفیوں کا اصول فقہ میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ" وہ حدیث جس کے رواۃ فقیہ نہ ہوں اور ہر طرح قیاس کے مخالف ہو قابل حجت نہیں" لیکن یہ حنفیوں کا مسلمہ اصول نہیں ہے بلکہ صرف عیسیٰ بن ابان اور انکے متبعین کی رائے ہے ابوالحسن کرخی وغیرہ صریح اس کے مخالف ہیں اور صاحب مسلم الثبوت نے اس قول کو ترجیح دی ہے تعجب اور سخت تعجب ہے کہ بغیر کسی ثبوت کے امام ابوحنیفہؒ کی طرف یہ دعویٰ صرف اس اعتماد پر منسوب کر دیا گیا کہ فقہائے حنفیہ میں سے چند علماء اس کے قائل ہیں بہت بڑی مثال بیع مصراۃ کی پیش کی جاتی ہے جس سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اس مسئلہ میں صریح حدیث کے ہوتے ہوئے قیاس[1] کو

---

[1] تعجب ہے کہ بڑے بڑے علماء یہاں تک کہ امام غزالی، امام رازی نے بھی امام ابوحنیفہ کی نسبت یہ الزام لگایا اور یہی بیع مصراۃ کی مثال پیش کی

مقدم رکھا ہے لیکن ان مدعیوں کو معلوم نہیں کہ اس مثال میں قیاس کی تقدیم بعض علمائے حنیفہ کی ذاتی رائے ہے امام صاحب سے اسکو کچھ واسطہ نہیں امام رازی نے مناقب الشافعی میں اتنی احتیاط کی کہ اس موقع پر امام ابوحنیفہؒ کا نام نہیں لیا بلکہ اصحاب ابوحنیفہ لکھا لیکن ہم اس احتیاط میں بھی ان کو معذور نہیں رکھتے کیونکہ یہ رائے بعض حنفیوں کی ہے نہ کہ سب کی امام رازی نے اصحاب کے لفظ سے جو تعمیم ظاہر کی وہ صحیح نہیں۔

بیع مصراۃ کی حدیث کو امام ابوحنیفہ نے قیاس کی بناء پر رد نہیں کیا بلکہ اس کے فسخ کا دعوی کیا ہے امام طحاوی نے معنی الآثار میں اس بحث کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے وہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کا مذہب لکھ کر لکھتے ہیں۔ **وذھبوا الی ان ماروی عن رسول فی ذلک مما تقدم ذکرنالہ فی ھذا الباب منسوخ** "۔یعنی یہ لوگ اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ اس بارے میں جو کچھ رسول اللہ (صلعم) سے روایت کیا گیا ہے وہ منسوخ ہے۔

اس موقع پر ہم اس بحث کی تفصیل نہیں کر سکتے صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں امام صاحب نے قیاس کی ترجیح نہیں دی بلکہ نسخ کا دعویٰ کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے موقعوں پر نہایت دقیقہ بینی سے دیکھنا چاہیے کہ جو اقوال امام صاحب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں وہ ان سے ثابت بھی ہیں یا نہیں؟ متاخرین نے ان باتوں میں کم احتیاط کی ہے اسلئے ہم کو نہایت غور و تحقیق سے کام لینا ہے یہی بیع مصراۃ کی حدیث ہمیشہ اصول موضوعہ کے طور پر پیش کی جاتی ہے اور اس سے ثابت کیا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ قیاس کو حدیث پر مقدم رکھتے تھے لیکن ذرا تحقیق سے کام لو تو معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام شور و غل کی کچھ اصل نہیں۔

بخلاف اس کے نہایت قوی ذریعہ سے امام ابوحنیفہ کی تصریحات ثا۔ت ہیں کہ وہ حدیث صحیح کے مقابلہ میں قیاس کا مطلق اعتبار نہیں کرتے تھے، امام محمد اس بحث کے ذیل میں کہ جو شخص رمضان میں بھول کر کچھ کھا پی لے تو روزہ نہیں ٹوٹتا اور قضا نہیں لازم آتی حدیث پر استدلال کر کے لکھتے ہیں کہ آثار کے ہوتے ہوئے رائے کچھ چیز نہیں۔ پھر امام ابوحنیفہ کا خاص قول نقل کرتے ہیں کہ "لولا ماجاء فی ھذا من الآثار لامرت بالقضاء" یعنی اگر اس بارہ میں آثار موجود ہوتے تو میں قضا کا حکم دیتا[1]۔

---

[1] کتاب الحج امام محمدؒ

ہاں یہ ضرور ہے کہ احادیث کے ثبوت کے متعلق امام ابوحنیفہؒ کی شرطیں نہایت سخت ہیں جب تک وہ شرطیں پائی نہ جائیں وہ حدیث کو قابل استدلال نہیں سمجھتے لیکن ان شرطوں کے ساتھ حدیث ثابت ہو تو ان کے نزدیک پھر قیاس کوئی چیز نہیں۔

جس حد تک ہم تحقیق کر سکے امام ابوحنیفہ نے قیاس فقہی کو حدیث پر ہرگز مقدم نہیں رکھا لیکن ان کے زمانہ تک قیاس کا لفظ وسیع معنوں میں مستعمل تھا اور بے شبہ ان معنوں کے لحاظ سے امام صاحب نے قیاس کو حدیثوں میں دخل دیا ہے مسائل اور احکام شرعیہ کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو فرقے قائم ہو گئے تھے ایک کا خیال تھا کہ شرعی احکام کسی مصلحت اور اقتضائے عمل پر مبنی نہیں ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ حسن وقبح اشیاء عقلی نہیں ہے دوسرے فریق کی رائے تھی کہ تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں جن میں سے بعض کی مصلحتیں صاف نمایاں ہیں خود شارع کے کلام سے اس کے اشارے پائے جاتے ہیں بعض ایسے ہیں جن کی مصلحت ہم کو معلوم نہیں لیکن فی الواقع وہ مصالح سے خالی نہیں۔

اس اختلاف رائے نے حدیثوں کی روایت پر مختلف اثر پیدا کیے بعض لوگ جب کسی حدیث کو سنتے تھے تو صرف یہ دیکھ لیتے تھے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں یا نہیں اگر ان کے خیال کے موافق قابل حجت ہیں تو پھر ان کو کوئی بحث نہیں ہوتی تھی اور بے تکلف اس حدیث کو قبول کر لیتے تھے، دوسرا فریق جو حسن وقبح عقلی کا قائل تھا یہ بھی دیکھتا تھا کہ جو مسئلہ یا عقیدہ حدیث سے مستنبط ہوتا ہے وہ عقل یا مصلحت کے موافق ہے یا نہیں اگر نہیں ہوتا تھا تو وہ حدیث کی زیادہ تحقیق وتنقید کی طرف ماء ہوتے تھے وہ دیکھتے تھے کہ اوی فہم ودرایت کے لحاظ سے کیا پایہ رکھتے ہیں روایت باللفظ ہے یا معنی موقع حدیث کیا تھا، کون لوگ مخاطب تھے، کیا حالت تھی غرض اس قسم کے اسباب اور وجوہ پر غور کرتے تھے ان باتوں سے اکثر اصل حقیقت کا پتہ لگ جاتا تھا۔

یہ طرز تحقیق خود صحابہ کے زمانے میں قائم ہو چکا تھا صحیح ابن ماجہ وترمذی میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے رسول اللہ (صلعم) سے حدیث روایت کی کہ **توضوا مما غیرت النار** یعنی جس چیز کو آگ نے متغیر کر دیا ہو اس کے استعمال سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اسی بناء پر بعض مجتہدین قائل ہیں کہ گوشت کھانے سے وضو لازم آتا ہے ابوہریرہؓ نے جب یہ حدیث بیان کی تو عبداللہ بن عباس موجود تھے بولے کہ **اتوضا من الرحیم** ۔یعنی اس بنا پر تو گرمی پانی سے بھی

وضو لازم آتا ہے ابو ہریرہؓ نے کہا کہ اے برادر زادہ! جب رسول اللہ (صلعم) سے کوئی روایت سنو تو اس پر مثالیں نہ کہو لیکن عبداللہ بن عباسؓ اپنی رائے پر قائم رہے حضرت عائشہؓ نے ابن عمرؓ کی اس حدیث **انا المیت لیعذب بیکاء الھلہ** پر جو اعتراض کیا تھا اسی طرز تحقیق پر مبنی تھا صحابہ کے حالات میں اس قسم کی متعدد مثالیں ملتی ہیں جن کا استقصا اس موقع پر ضروری نہیں۔

امام ابوحنیفہ کا بھی یہی مسلک تھا اور اسی کو لوگوں نے قیاس کے لفظ سے شہرت دی اس مسئلہ پر کہ احکام شریعت مصالح پر مبنی ہیں۔ اس موقع پر ہم تفصیلی گفتگو نہیں کر سکتے شاہ ولی اللہ صاحب کی بے نظیر کتاب حجۃ اللہ البالغہ اس بحث کے لئے کافی و وافی ہے یہاں صرف اس قدر کہنا ضروری ہے کہ علمائے اسلام میں جو لوگ عقل و نقل کے جامع تھے مثلاً امام غزالی عزالدین عبدالسلام شاہ ولی اللہ وغیرہ ان لوگوں کا یہی مسلک تھا، امام ابوحنیفہ احادیث کی تنقید میں اس اصول کو ضروری طور پر ملحوظ رکھتے تھے دو متعارض حدیثیں جو روایت کی حیثیت سے یکساں نسبت رکھتی تھیں ان میں وہ اس حدیث کو ترجیح دیتے تھے جو اصول مذکور کے موافق ہو۔

امام صاحب نے بعض موقعوں پر محض اس اصول کی مخالفت کی وجہ سے بعض حدیثوں کے تسلیم کرنے میں تامل کیا ان کی اصطلاح میں یہ ایک علت خفیہ ہے محدثین نے اقسام حدیث میں ایک قسم معلل قرار دی ہے جس کی یہ تعریف قرار دی ہے کہ "حدیث میں بظاہر صحت کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں اور وہ قابل استدلال نہیں ہوتی اس قسم کی حدیثوں کی تمیز پر محدثین کو نہایت فخر ہے اور وہ اسکو ایک قسم کا الہام سمجھتے ہیں علی بن المدینی جو امام بخاری کے استاد اور بہت بڑے مشہور محدث تھے ان کا قول ہے کہ **ولو قلت للقیم بالعلل من این لک ھذالم تکن لہ حجۃ**[1] یعنی یہ الہام ہے اور اگر تم ماہر علل سے پوچھو کہ تم نے کیونکر اس کو معلل کہا تو وہ کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتا محدث ابو حاتم سے ایک شخص نے چند حدیثیں پوچھیں انہوں نے بعض کو مدرج بعض کو باطل بعض کو منکر، بعض کو صحیح بتایا، پوچھنے والے نے کہا کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا کیا راوی نے آپ کو ان باتوں کی اطلاع دی؟ ابو حاتم نے کہا نہیں! بلکہ مجھ کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے سائل نے کہا تو کیا آپ علم غیب کے مدعی ہیں ابو حاتم نے جواب دیا کہ تم اور ماہرین فن سے پوچھو اگر وہ میرے ہمز[illegible]ں تو سمجھنا کہ میں نے بے جا نہیں کہا سائل نے ابوزرعہ سے وہ حدیثیں جا کر دریافت کیں، انہو[illegible] ابو حاتم کو موافقت کی تب سائل کو تسکین ہوئی[2]۔

بعض محدثین کا قول ہے "**اثر بھـ[illegible]ـم قلوبھم لایمکنھم ردھو ھیۃ نفسانیۃ لامعدل لھم**" یعنی وہ ایک امر ہے ج[illegible] [illegible]حدیث کے دل پر وارد ہوتا ہے اور وہ اسکو رد نہیں کر سکتے اور نفسانی اثر ہے جس سے گریز نہیں ہو سکتا [illegible]ثین کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے بلاشبہ فن روایت کی ممارست

---

[1] فتح المغیث صفحہ ۹۸ [2] فتح المغیث صفحہ ۹

سے ایک ملکہ یا ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس سے خود تمیز ہو جاتی ہے کہ یہ قول رسول اللہ (صلعم) کا ہو سکتا ہے یا نہیں، اسی طرح شریعت کے احکام اور مسائل اور ان کے اسرار و مصالح کے تتبع اور استقراء سے ایسا ذوق حاصل ہو سکتا جس سے یہ تمیز ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ (صلعم) نے یہ حکم دیا ہو گا یا نہیں لیکن ان اسرار اور مصالح کا تتبع محدث کا فرض نہیں ہے وہ مجتہد کے ساتھ مخصوص ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ان دقیق وجوہ کے لحاظ سے امام ابو حنیفہ بعض حدیثوں کو معلل قرار دیا تو ارباب ظاہر نے مخالفت کی اور بعضوں کی بدگمانی ہوئی کہ امام صاحب حدیث کو عقل و رائے کی بناء پر رد کرتے ہیں، لیکن انصاف پسند انصاف کر سکتا ہے کہ جب روایات اور اظاہر الفاظ کے استقراء سے محدثین کو ایسا مذاق پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ایک حدیث کو جسمیں بظاہر صحت کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں رد کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جس شخص نے دقت نظر اور نکتہ شناسی کے ساتھ احکام شریعت کے اسرار و مصالح کا تتبع کیا ہو وہ ایسے وجدان اور ذوق سے محروم رہے، البتہ یہ نہایت نازک اور ذمہ داری کا کام ہے جس کا صرف وہی شخص متحمل ہو سکتا ہے جو بہت ہی بڑا عالم مجتہد، محدث، دقیقہ بین، موید بتائید الٰہی ہو، لیکن ان شرطوں کا جامع امام ابو حنیفہ سے زیادہ کون ہو سکتا ہے۔

نہایت مہتم بالشان اور دقیق چیز جو امام ابو حنیفہؒ نے اس فن میں اضافہ کی وہ احادیث کے مراتب کا تفاوت اور ان تفاوتوں کے لحاظ سے احکام شرعیہ کی تقسیم ہے احکام اور مسائل کا پہلا ماخذ قرآن ہے جسمیں کسی گفتگو نہیں ہو سکتی قرآن کے بعد حدیث کا رتبہ ہے حدیث اور قرآن میں اصل امر کے لحاظ سے تو چنداں فرق نہیں، وہ وحی متلو ہے اور یہ غیر متلو جو کچھ تفاوت اور اختلاف ہے وہ ثبوت کی حیثیت سے ہے اگر کوئی حدیث اسی تواتر اور قطعیت سے ثابت ہے جس طرح قرآن ثابت ہے تو اثبات احکام میں وہ قرآن کے ہم پلہ ہے لیکن حدیثوں کے ثبوت کے مراتب متفاوت ہیں اور احکام کے ثبوت میں انہی تفاوتوں کے لحاظ کی ضرورت ہے محدثین نے حدیث کی جو قسمیں کی ہیں یعنی صحیح، حسن، ضعیف، مشہور، عزیز، غریب وغیرہ ان کے اختلاف مراتب سے احکام پر چنداں اثر نہیں پڑتا چنانچہ ان قسموں میں سے محدثین صرف ضعیف کا اعتبار نہیں کرتے باقی اقسام کو قریباً یکساں قابل حجت قرار دیتے ہیں محدثین کو اس سے زیادہ تدقیق اور امتیاز مراتب کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ استنباط احکام اور تفریع مسائل ان کا فرض نہ تھا لیکن امام ابو حنیفہ کو تدوین فقہ کی وجہ سے جس کی وہ بانی اول ہیں زیادہ تدقیق اور فرق مراتب کی ضرورت پڑی انہوں نے نوعیت ثبوت کے لحاظ سے حدیث کی تین قسمیں قرار دیں۔

۱:۔ **متواتر** یعنی وہ حدیث جس کے رواۃ پہلے طبقہ روایت میں اس کثرت سے ہوں جن پر تواتر علی الکذب کا گمان نہیں ہو سکتا یعنی رسول اللہ (صلعم) سے بے شمار لوگوں نے روایت کی ہو اسی طرح ان لوگوں سے لیکر اخیر زمانہ تک بے شمار رواۃ روایت کرتے آتے ہوں۔

۲:۔ **مشہور** یعنی وہ حدیث جس کے رواۃ پہلے طبقہ روایت میں تو بہت نہ ہوں لیکن دوسرے طبقہ سے اخیر تک اسی کثرت سے ہوں جو متواتر کے لیے مشروط ہے۔

۳: احاد:۔ جو متواتر اور مشہور نہ ہو۔

اس تقسیم کا اثر ان کی رائے کے موافق احکام شرعیہ پر جو پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ متواتر سے فرضیت اور رکنیت ثابت ہو سکتی ہے مشہور کا درجہ چونکہ متواتر سے کم ہے اس لئے فرضیت کا اثبات تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآن میں جو مطلق ہو حدیث مشہور سے مقید ہو سکتا ہے اسی طرح اس سے زیادۃ علی الکتاب ہو سکتی ہے احاد کا ثبوت چونکہ بالکل ظنی ہے اس لئے وہ قرآن کے احکام منصوصہ پر کچھ اثر نہیں پیدا کر سکتی یہ مسئلہ اگرچہ نہایت واضح اور صاف ہے لیکن تعجب ہے کہ امام شافعی اور بعض اور محدثین اس کے مخالف ہیں امام بیہقی وغیرہ نے بعض مناظرات نقل کئے ہیں جو امام شافعیؒ اور امام محمدؒ میں واقع ہوئے اور جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس مسئلہ میں امام شافعیؒ نے امام محمدؒ کو بند کر دیا۔

اگرچہ ہمارے نزدیک یہ مناظرے فرضی مناظرے ہیں جن کا ثبوت اصول روایت کے مطابق ہرگز نہیں ہو سکتا لیکن قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ مسئلہ کا انتساب امام ابو حنیفہ کی طرف ضرور صحیح ہے۔

قوی سے قوی اعتراض جو اس مسئلہ پر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خود امام ابو حنیفہ اور ان کے تلامذہ اس کے پابند نہ رہ سکے شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ امام شافعی نے امام محمد سے کہا کہ کیا آپ کے نزدیک خبر واحد سے قرآن پر زیادتی نہیں ہو سکتی، امام محمدؒ نے کہا ہاں، امام شافعی نے کہا کہ قرآن مجید میں وارثوں کے حق میں وصیت کا حکم ہے، آپ اس حدیث کی بنا پر **لا وصیة للوارث** کو ناجائز کیوں قرار دیتے ہیں۔؟

غالباً شاہ صاحب نے یہ روایت بیہقی کی مناقب الشافعیؒ سے لی ہے جس میں اور بھی بے سروپا روایتیں مذکور ہیں لیکن ہم شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ حنفیوں کے نزدیک وارثوں کے حق میں وراثت کا حکم کسی حدیث سے نہیں منسوخ ہوا بلکہ خود قرآن مجید کی اس آیت سے جس سے توریت کے احکام ہیں یہ صرف حنفیوں ہی کی رائے نہیں ہے بلکہ تمام مفسرین کا یہی قول ہے **الا الشاذ النادر منهم**

ان مسائل پر اور بھی بہت سی بحثیں پیدا ہو گئی ہیں جن کی تفصیل ہم نہیں کر سکتے لیکن اخبار احاد کی بحث اور اس سے عقائد اسلام پر جو اثر پڑتا ہے اسکو ہم اس موقع پر تفصیل سے لکھتے ہیں کیونکہ بعض محدثین کو زیادہ تر اسی مسئلہ میں ان سے اختلاف ہے۔

اخبار احاد کی نسبت اگرچہ محققین اور اکثر ائمہ حدیث کا بھی یہی مذہب ہے کہ وہ ظنی الثبوت ہیں لیکن ایک فرقہ اس کے خلاف بھی ہے جس کے سرکردہ علامہ ابن الصلاح ہیں اگرچہ علامہ ابن الصلاح نے بھی اخبار احاد کی تمام حدیثوں کو قطعی نہیں تسلیم کیا ہے انہوں نے صحیح احادیث کی سات قسمیں کی ہیں (۱) جس پر بخاری و مسلم دونوں متفق ہوں (۲) بخاری منفرد ہوں (۳) مسلم منفرد ہوں (۴) بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہ کیا ہو لیکن انکی شرطوں کے موافق ہو (۵) صرف بخاری کی شرط پر ہو (۶) صرف مسلم کی شرط پر ہوں (۷) بخاری و مسلم کی شرط کے موافق نہ ہو لیکن اور محدثین نے

اسکو صحیح تسلیم کیا ہو ان سات قسموں میں سے علامہ ابن الصلاح پہلی قسم کو قطعی الصحتہ قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ وھذاقسم جیعۂ مقطوع بصحة والعلم النظری و اقع به، منفردات بخاری و مسلم کی نسبت ان کی رائے ہے کہ اسی قبیل میں داخل ہیں، بجز ان چند حدیثوں کے جن پر دار قطنی وغیرہ نے جرح کی ہے ابن الصلاح کا قول اگرچہ ظاہر بینوں میں اور بالخصوص آج کل زیادہ رواج پا گیا ہے لیکن کچھ شبہ نہیں کہ وہ بالکل غلط اور بے دلیل خیال ہے اور خود ائمہ حدیث اس کے مخالف ہیں علامہ نووی شرح صحیح مسلم میں ابن الصلاح کا قول تفصیلاً نقل کر کے لکھتے ہیں۔ **وھذالذی ذکرہ الشیخ فی ھذہ المواضع خلاف ماقا له الم حققون والاکثرون فانهم قالو احادیث الصحیین التی لیست بمتواترۃ انما تفید الظن فانها احادو الاحاد انما تفید الظن علی ما تقرر ولا فرق بین البخاری و مسلم وغیرہ همافی ذلک** یعنی شیخ ابن الصلاح نے ان موقعوں پر جو کچھ کہا وہ محققین اور اکثریت کی رائے کے خلاف ہے کیونکہ محققین اور اکثروں کا قول ہے کہ محققین کی حدیثیں جو تواتر کے رتبہ کو نہیں پہنچی ہیں صرف ظن کے لئے مفید ہیں کیونکہ وہ اخبار احاد ہیں اور اخبار احاد کی نسبت ثابت ہو چکا ہے کہ ان سے صرف ظن پیدا ہو سکتا ہے اور اس باب میں بخاری و مسلم اور دوسرے لوگ بھی برابر ہیں ابن الصلاح کے قول کو اور دوسرے ائمہ فن نے بھی رد کیا ہے لیکن ہم اس بحث کو لفظی طور سے طے کرنا نہیں چاہتے ہم کو خود غور کرنا چاہیے کہ اخبار احاد سے یقین پیدا ہو سکتا ہے یا ظن۔

کسی حدیث کو جب ایک محدث، گو وہ کسی رتبہ کا ہو صحیح کہتا ہے تو اس کا یہ دعوی در حقیقت چند دعووں پر مشتمل ہوتا ہے یعنی یہ کہ روایت [1] متصل ہے اس [2] کے رواۃ ثقہ میں ضابط القلب ہیں روایت میں شدوذ نہیں ہے کوئی علت قادحہ نہیں ہے یہ سب امور ظنی اور اجتہادی ہیں جن پر یقین کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی جسطرح ایک فقیہہ کسی مسئلے کو قرآن یا حدیث سے استنباط کر کے اپنی دانست میں صحیح سمجھتا ہے اور اس قسم کی صحت یقینی نہیں ہوتی کیونکہ استنباط میں جن مقدمات سے اس نے کام لیا ہے اکثر اس کے ظنیات ہیں، اسی طرح حدیث کا حال ہے کسی حدیث کو صحیح کہنا محدث کے ظنیات و اجتہادات پر مبنی ہے ایک یا چند محدثین نے کسی حدیث کو اگر صحیح کہا ہے اور دوسرا شخص اس کی صحت تسلیم نہیں کرتا تو وہ صرف اس گناہ کا مجرم ہے کہ اس محدث یا محدثین کے اصول تحقیق، قواعد استنباط، طریق روایت غرض ان کے اجتہادات اور مزعومات کا مخالف ہے۔

حدیث کی تحقیق و تنقید کے لئے محدثین نے جو اصول مقرر کئے ہیں اور جن پر احادیث کی صحت کا مدار ہے سب عقلی اور اجتہادی مسائل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان میں خود محدثین باہم اختلاف عظیم رکھتے ہیں ظاہر بینوں کا خیال ہے کہ حدیث کا فن نقلی ہے نہ عقلی، لیکن جس شخص نے اصول حدیث پر غور کیا ہے وہ اس خیال کی غلطی کو نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے اس نکتہ کی طرف امام ابوحنیفہ نے اشارہ کیا ہے **ھذالذی نحن فیه رای لا بخبر علیه احدا ولا نقول یجب علی احدقبوله** بعضوں نے غلطی سے امام صاحب کے اس وسیع قول کو فقہ پر محدود سمجھا لیکن ان کو معلوم نہیں کہ مجتہد کو مسائل کے ماخذ سے بحث ہوتی ہے۔

اصول حدیث کے ظنی اور اجتہادی ہونے کا ہی اثر ہے کہ محدثین کو احادیث کی صحت وعدم صحت میں باہم اختلاف ہوتا ہے ایک محدث ایک حدیث کو نہایت صحیح مستند واجب العمل قرار دیتا ہے دوسرا اسی کو ضعیف بلکہ موضوع کہتا ہے محدث ابن جوزی نے بہت سی حدیثوں کو موضوعات میں داخل کیا ہے جن کو دوسرے محدثین صحیح اور حسن کہتے ہیں ابن جوزی نے تو یہ قیامت کی کہ صحیحین کی بعض حدیثوں کو موضوع لکھ دیا۔ علامہ سخاوی لکھتے ہیں: ۔**بل ربما ادرج فیھا الحسن والصحیح مما ھونی احدی الصحیحین فضلا عن غیر ھا** یعنی ابن جوزی نے حسن اور صحیح تک کو جو بخاری یا مسلم میں موجود ہیں موضوعات میں درج کر دیا ہے دوسری کتابوں کا کیا ذکر ہے بے شبہ ابن جوزی نے اس افراط میں غلطی کی لیکن یہ غلطی ایک اجتہادی غلطی ہے جس کا حاصل اسی قدر ہے کہ انہوں نے بخاری یا مسلم کے صحیح اجتہاد کو غلط تسلیم کیا ان اصولی اختلافات کی وجہ سے احادیث کی صحت اور عدم صحت میں جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں ان کا استقصاء کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

حدیث مرفوع کی پہلی ضروری شرط یہ ہے کہ رسول اللہ (صلعم) تک ثابت ہو لیکن اتصال کے ثبوت کے جو طریقے تسلیم کیے ہیں ان میں اکثر ظنی اور اجتہادی ہیں صحابہ کے الفاظ کو "یہ امر سنت ہے ہم کو یہ حکم دیا گیا تھا، ہم اس بات سے روکے گئے تھے رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں ہم فلاں کام کرتے تھے یا ہم اسکو برا نہیں سمجھتے تھے اکثروں نے مرفوع قرار دیا ہے اور بعضوں نے یہاں تک وسعت دی کہ جن حدیثوں کے یہ الفاظ تھے ان کو لفظوں سے روایت کر دیا رسول اللہ صلعم نے یہ فرمایا حالانکہ یہ الفاظ اس معنی میں قطعی الدلالۃ نہیں ہیں بلکہ صحابہ کے ظن اور اجتہاد پر مبنی ہیں جسکی نسبت عموماً تسلیم کیا گیا ہے **فھم الصحابی لیسن بحجۃ** یعنی صحابی کی سمجھ کوئی دلیل نہیں اس بناء پر بعض علماء نیا ختلاف کیا اور کہا کہ یہ الفاظ اتصال ورفع کے لئے کافی نہیں ہیں امام شافعی ابن حزم ظاہری ابوبکر رازی اور دیگر محققین نے صحابہ کے اس قول کو کہ یہ فعل سنت ہے" حدیث مرفوع نہیں قرار دیا کتب سیر واحادیث میں بیسیوں مثالیں ملتی ہیں جن میں صحابی نے یہ الفاظ استعمال کئے اور وہ حدیث نبوی نہ تھی بلکہ خود انکا قیاس واجتہاد تھا لیکن اکثر محدثین نے ان حدیثوں کو مرفوع کہا اس خیال نے یہ فتنہ پیدا کیا کہ اسکی بناء پر بعض رواۃ نے صریح مرفوع الفاظ میں حدیث کی روایت کر دی جسکی وجہ سے ایک عام شبہ پیدا ہو گیا۔

من دعن روایتوں میں اتصال کا ثابت ہونا نہایت مشکل ہے حالانکہ اس قسم کی روایتیں کثرت سے ہیں امام بخاریؒ کا مذہب ہے کہ معنا حدیثوں میں اگر یہ ثابت ہو کر راوی اور روی عنہ دونوں ہم زمان اور کبھی ملے بھی تھے تو وہ حدیث متصل سمجھی جائیگی امام مسلم حالانکہ امام بخاری کے شاگرد اور زیادہ تر انہی کے طریقے کے پیرو تھے تاہم انہوں نے نہایت سختی سے اس شرط کی مخالفت کی اور صرف ہم زمان ہونا کافی سمجھا[1] اس اختلاف کا یہ نتیجہ ہے کہ بخاری کے اصول کے موافق امام مسلم کی وہ تمام معنا روایتیں جن میں لقاء ثابت نہیں ہے مقطوع ہیں حالانکہ امام مسلم انکو متصل سمجھتے ہیں اور اس پر انکو یہاں تک اصرار ہے کہ اپنے مخالف کو سخت الفاظ سے یاد کرتے ہیں امام مسلم نے تو زیادہ توسیع کی لیکن امام بخاری کی شرط کے موافق بھی معنا روایت میں اتصال کا ثبوت محض ظنی ہے یہ کچھ ضروری نہیں کہ دو شخص ہم زماں اور ہم لقا ہوں تو انکی روایتیں ہمیشہ بالذات ہوں جہاں حدثنا اور اخبرنا ہوگا وہاں ایسا ہونا البتہ ضرور ہے لیکن اگر یہ الفاظ نہیں ہیں اور راوی نے عن کے لفظ سے روایت کی دے تو اتصال کا خیال قیاس غالب ہوگا لیکن یقینی نہ ہوگا حدیث وسیر میں بیسوں مثالیں مل سکتی ہیں کہ دو راوی ایک زمانے مین تھے اور آپس میں ملاقات بھی تھی تاہم ایک نے دوسرے سے بعض روایتیں بواسطہ کیں روزمرہ کے تجربوں میں اسکی سینکڑوں شہادتیں ملتی ہیں۔

سب سے بڑا ضروری اور اہم مسئلہ رجال کی تنقید ہے اخبار احاد کا تمام تر مدار رجال پر ہے لیکن رجال کی تنقید و توثیق ایسا ظنی مسئلہ ہے جس کا قطعی فیصلہ نہایت مشکل اور قلیل الوجود ہے ایک شخص کو بہت سے لوگ نہایت ثقہ، نہایت متدین، نہایت راستباز سمجھتے ہیں اسی شخص کو دوسرے اشخاص ضعیف الروایۃ، غیر ثقہ نا قابل اعتبار خیال کرتے ہیں لطف یہ ہے کہ دونوں فریق اس رتبہ کے ہوتے ہیں جنکی عظمت و شان سے انکار نہیں کیا جا سکتا امام بخاری و مسلم میں گو ایسا سخت اختلاف نہیں ہے تاہم بہت سے رواۃ ہیں جن کو ان دونوں اماموں میں سے ایک نے قابل حجت سمجھا ہے اور دوسرا نہیں سمجھتا علامہ نووی نے مقدمہ شرح صحیح مسلم میں بعضوں کے نام بھی لکھے ہیں اور محدث حاکم کی کتاب المدخل سے نقل کیا ہے کہ انکی تعداد جن سے امام مسلم نے مسند صحیح میں احتجاج کیا ہے اور امام بخاری نے جامع صحیح میں ان سے حجت نہیں کی ۶۲۵ ہے۔

---

[1] دیکھو مقدمہ صحیح مسلم

میزان الاعتدال کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں رواۃ ہیں جن کی جرح وتعدیل مختلف فیہ ہے اور ایسا ہونا ضرور تھا کسی شخص کے ان اوصاف وعادات پر مطلع ہونا جن کا اثر روایت کی قوت وضعف پر پڑ سکتا ہے مدتوں کی ملاقات اور تجربہ پر موقوف ہے جو لوگ جرح وتعدیل کے کام میں مصروف تھے سینکڑوں ہزاروں راویوں سے ایسی عمیق واقفیت کیونکر حاصل کر سکتے تھے اسی لئے مختلف قرائن ظاہری آثار عام شہرت سمعی روایتوں سے کام لینا پڑتا تھا اور بہت کم قطعی فیصلہ ہو سکتا تھا اگرچہ محدثین نے ان معارضات کے رفع کرنے کے لیے اصول قرار دیئے ہیں لیکن وہ اصول خود اجتہادی اور مختلف فیہ ہیں اس کے علاوہ متعدد موقعوں پر محدثین کو خود اپنے اصول سے انحراف کرنا پڑتا ہے جرح کو عموماً تعدیل پر متقدم مانا گیا ہے لیکن لیکن بہت سے رواۃ ہیں جنکی نسبت اس قاعدہ کی پابندی نہیں کی جاتی محمد بن بشار مصری، احمد بن صالح مصری، عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ کی نسبت مفصل جرحیں موجود ہیں تاہم ان جرحوں کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔

تعجب یہ ہے کہ جارحین ومعدلین دونوں ائمہ فن ہوتے ہیں اور انکی آرا میں اس قدر اختلاف ہوتا ہے جس سے سخت تعجب پیدا ہوتا ہے جابر جعفی کوفی ایک مشہور راوی ہے جسکو دعویٰ تھا کہ مجھ کو پچاس ہزار حدیثیں یاد ہیں انکی نسبت ائمہ جرح وتعدیل کی یہ رائیں ہیں۔

سفیان کا قول ہے کہ میں نے جابر سے زیادہ محتاط حدیث میں نہیں دیکھا شعبہ کہتے ہیں کہ جابر جب اخبرنا وحدثنا کہیں تو وہ اوثق الناس ہیں، امام سفیان ثوری نے شعبہ سے کہا کہ اگر تم جابر جعفی میں گفتگو کرو گے تو میں تم میں گفتگو کروں گا، وکیع کا قول ہے کہ تم لوگ اور کسی بات میں شک کرو تو کرو لیکن اس بات میں کچھ شک نہ کرو کہ جابر جعفی ثقہ ہیں اس کے مقابلہ میں اور ائمہ فن کی بھی آرا ہیں جن کے یہ الفاظ ہیں کہ وہ متروک ہے کذاب ہے وضاع ہے چنانچہ اخیر فیصلہ میں جو پچھلے محدثوں نے کیا وہ یہی ہے کہ جابر کی روایت قابل اعتبار نہیں۔

اس سے یہ غرض نہیں کہ جرح وتعدیل کا فن ناقابل اعتبار ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جن وسائل اور طرق سے رجال کے حالات قلمبند کئے گئے اور کئے جا سکتے ہیں ان کا مرتبہ ظن غالب یا محض ظن سے فائق نہیں ہو سکتا اس لیے اس پر تیقن وقطعیت کی بنیاد نہیں قائم ہو سکتی۔

ان امور کے تادیہ معنی کی بحث باقی رہتی ہے مثلاً ایک حدیث تمام محدثین اور مجتہدین

کے اصول کے موافق متصل بھی ہے، رواۃ بھی ثقہ ہیں شذوذ بھی نہیں ہے، لیکن یہ بحث اب بھی باقی ہے کہ راوی نے ادائے مطلب کیونکر کیا؟ موقع اور محل روایت کی تمام خصوصیتیں ملحوظ رکھیں یا نہیں؟ فہم مطلب یا طریقہ ادا میں تو کوئی غلطی نہیں کی چونکہ یہ مسلم ہے کہ حدیثیں اکثر بالمعنی روایت کی گئی ہیں اس لیے ان احتمالات کو زیادہ قوت ہو جاتی ہے، صحابہ کے زمانہ میں کسی روایت کی صحت سے انکار کیا جاتا تھا، تو اسی بناء پر کیا جاتا تھا ورنہ یہ ظاہر ہے کہ صحابہ عموماً ثقہ تھے، اور ان کی روایت میں انقطاع کا کوئی احتمال نہ تھا۔ صحیح مسلم باب التیمم میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے مسئلہ د یافت کیا کہ مجھ کو غسل کی حاجت ہوئی اور پانی نہ مل سکا تو عمرؓ نے فرمایا کہ نماز پڑھو، عمارؓ موجود تھے انہوں نے اس مسئلہ کے متعلق رسول اللہ (صلعم) سے ایک روایت بیان کی اور کہا کہ اس موقع پر آپ بھی موجود تھے حضرت عمرؓ نے کہا **اتق اللہ یا عمار** یعنی ''اے عمار خدا سے ڈرو'' ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ عمارؓ کو کاذب الروایۃ نہیں سمجھتے تھے، لیکن اس احتمال پر کہ شاید ادائے مطلب میں غلطی ہوئی یہ الفاظ فرمائے، چنانچہ عمارؓ نے کہا ''اگر آپ کی مرضی نہ ہو تو میں یہ حدیث روایت نہ کیا کروں'' اخبار آحاد کی بحث کو ہم نے قصداً اس لیے طول دیا کہ محدثین زیادہ تر اسی مسئلہ کی وجہ سے امام ابوحنیفہ پر ردوقدح کرتے ہیں حالانکہ امام صاحب کا مذہب نہایت تحقیق اور دقت نظر پر مبنی ہے۔

یہ تمام احتمالات اور اجتہادات اخبار آحاد کے ساتھ مخصوص ہیں متواتر اور مشہور میں ان بحثوں کا سراغ نہیں، انہیں وجوہ اور اسباب سے اخبار آحاد کے متعلق مختلف رائیں پیدا ہو گئیں معتزلہ نے سرے سے انکار کیا۔ ان کے مقابلہ میں بعض محدثین نے یہ شدت کی کہ خبر واحد کو قطعی قرار دیا صرف شرط لگائی کہ رواۃ ثقہ ہوں اور انقطاع و شذوذ علت نہ ہو۔ بعض محدثین اگر چہ اصول کے طور پر اخبار آحاد کو ظنی کہتے، امام ابوحنیفہؒ نے اس بحث میں جو مسلک اختیار کیا وہ نہایت معتدل اور ان کی دقت نظر کی بڑی دلیل ہے، انہوں نے نہ معتزلہ کی طرح سرے سے انکار کیا۔ نہ ظاہریوں کی طرح خوش اعتقادی سے اس کی قطعیت تسلیم کی، امام صاحب کی یہ رائے بڑے بڑے صحابہ کی رائے کے موافق ہے حضرت عمرؓ حضرت عائشہ عبداللہ بن مسعودؓ نے متعدد موقعوں پر خبر واحد کی تسلیم میں تردد کیا ہے، جس یک وجہ یہی تھی کہ وہ اخبار آحاد کو قطعی نہیں سمجھتے تھے، فاطمہ بنت قیس نے جب حضرت عمرؓ کے سامنے رسول اللہؐ سے روایت کی کہ **لا سکنی ولا نفقۃ** تو

حضرت عمرؓ فرمایا لا انترک کتاب اللہ بقول امرأۃ لا تدری اصدقت امر کذبت ۔یعنی ایک عورت کی روایت کی بناء پر جس کی نسبت معلوم نہیں کہ اس نے غلط کہا یا صحیح، ہم کتاب الٰہی کو چھوڑ نہیں سکتے۔ فقہی احکام میں اس قاعدہ کی متعدد تفریعیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ اخبار احاد سے کسی حکم کا فرض ہونا ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ فرضیت ثبوت قطعی کی محتاج ہے، البتہ اس سے ظن غالب پیدا ہوتا ہے اس لیے وجوب، تسنن، استحباب ثابت ہو سکتا ہے اسی بناء پر نماز میں قرأت فاتحہ امام شافعیؒ فرض سمجھتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ واجب اس اصول پر بہت سے احکام متفرع ہیں۔

فقہ سے زیادہ اس قاعدہ کا اثر علم کلام پر پڑتا ہے اور یہی چیز ہے جس نے ایک زمانہ کو امام ابوحنیفہ کا مخالف بنا دیا تھا۔ امام صاحب نے مذکور بالا قاعدہ کی بناء پر یہ اصول قرار دیا تھا کہ جو مسائل اور عقائد اسلام میں متفق علیہ ہیں ان کے خلاف اخبار آحاد قابل اعتبار نہیں، مثلاً انبیاء کی عصمت اہل حق کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے، اس کے برخلاف جن روایتوں سے انبیاء کا مرتکب کبائر ہونا ثابت ہوتا ہے امام ابوحنیفہ کے اصول کے موافق وہ روایتیں قابل اعتبار نہیں، اس اصول کی بناء پر بہت سے اشکالات سے جو ملاحدہ پیش کرتے ہیں نجات ملتی ہے لیکن افسوس ہے کہ اکثر ارباب روایت نے اس عمدہ اصول کی قدر نہ کی بلکہ الٹی اور مخالفت کی، علامہ ابن عبدالبر نے جو مشہور محدث ہیں۔ کتاب الکنیٰ میں لکھا ہے کان مذھب الامام ابی حنیفۃ نی اخبار احاد ان لا یقبل منھا المخالف الاصول المجمع علیھا فانکر علیھا اصحاب الحدیث فافرطوا[1] ۔یعنی اخبار آحاد میں امام ابوحنیفہ کا یہ مذہب تھا کہ اصول متفق علیہ کے خلاف ہو تو قابل قبول نہیں اس پر اصحاب حدیث نے ان کی مخالفت کی اور افراط کو پہنچا دیا'' محدثین اور امام ابوحنیفہ کے اصول میں عملاً یہ فرق ہے کہ جو حدیث اصول متفق علیہ کے خلاف ہوتی تھی، محدثین اس کی صحت کو تسلیم کر کے تاویل سے کام لیتے تھے، حالانکہ اکثر جگہ بارد تاویل ہوتی تھی بخلاف اس کے امام صاحب اس طرف مائل ہوتے تھے کہ چونکہ وہ حدیث متواتر اور مشہور نہیں ہے اس لیے ممکن ہے کہ رواۃ نے غلطی یا مسامحت کی ہو، امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں ایک بحث لکھی ہے جو اس موقع کی ایک عمدہ مثال ہے وہ لکھتے کہ ایک شخص سے میں نے کہا کہ یہ حدیث جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے تین بار جھوٹ بولے

[1] اس عبارت کو حافظ ابوالمحاسن نے عقود الجمان میں نقل کیا۔

ما کذب ابراھیم الا ثلث کذبات صحیح نہیں کیونکہ اس سے حضرت ابراہیم کا کاذب ہونا (نعوذ باللہ) لازم آتا ہے۔ اس شخص نے کہا کہ اس حدیث کے رواۃ ثقہ ہیں ان کو کاذب کیونکر کہا جائے، میں نے جواب دیا کہ حدیث کو صحیح مانیں تو حضرت ابراہیم کا کذب لازم آتا ہے اور غلط تسلیم کریں تو راوی کو کاذب ماننا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بدیہی بات ہے کہ حضرت ابراہیم کو راوی پر ترجیح ہے امام رازی کا استدلال امام ابوحنیفہ کے اسی خیال پر مبنی ہے یعنی چونکہ انبیاء کا معصوم اور صادق ہونا متفق علیہ ہے اس لیے خبر واحد اس کے متعارض نہیں ہو سکتی، افسوس ہے کہ محدث قسطلانی صحیح بخاری کی شرح میں استدلال کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ جب رواۃ ثقہ ہیں تو حدیث کو بہر حال صحیح ماننا چاہیے۔''

اسی اصول پر امام صاحب اس بات کے قائل ہیں کہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ ہر سورۃ کے شروع میں جزو قرآن نہیں۔'' امام شافعی اور بعض محدثین اس کے خلاف ہیں۔ اور سند میں چند حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی طرف سے یہ جواب ہے کہ قرآن تواتر سے ثابت ہے اور جو تواتر سے ثابت ہے وہی قرآن ہے، اخبار آحاد سے قرآن نہیں ثابت ہو سکتا اسی طرح امام صاحب کے اصول کے مطابق وہ روایتیں قابل اعتبار نہیں جن میں عبداللہ بن مسعود کی طرف سے معوذتین کا انکار منسوب کیا گیا ہے حافظ ابن حجر نے ان راویتوں کو صحیح تسلیم کیا ہے اور کہا ہے کہ روایت سے انکار نہیں کرنا چاہیے بلکہ تاویل سے کام لینا چاہیے لیکن تاویل کیا ہو سکتی ہے ۔خدانخواستہ یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ معوذتین متواتر نہیں ہیں یا تواتر کا اعتبار تبہ گھٹانا ہوگا کہ رسول اللہ صلعم کے اصحاب کا بھی اس سے واقف ہونا ضروری نہ ہو۔ امام صاحب کے اس اصول کے مطابق اسلام کا دائرہ اس قدر وسیع رہتا ہے جس قدر کہ اس کو رہنا چاہیے۔ بخلاف اس کے اور لوگوں کی رائے کے مطابق اس کی وسعت نقطہ سے بھی کم رہ جاتی ہے مثلاً یہ مسلم اور یقینی ہے کہ جو شخص توحید اور نبوت کا قائل ہے اور دل سے اس پر اعتقاد رکھتا ہے وہ قرآن مجید کی نص کے مطابق مسلمان ہے اب اس کے مقابلہ میں وہ حدیثیں جو قطعی الثبوت نہیں ہیں اور جن میں بہت سے خارجی امور پر کفر کا حکم دیا گیا ہے کچھ اثر نہیں پیدا کر سکتیں، اسی بناء پر امام صاحب معتزلہ، قدریہ، جہمیہ وغیرہ کو کافر نہیں کہتے تھے اور اس قسم کی حدیثوں کا کہ ''بہتر فرقوں میں سے صرف ایک فرقہ بہشتی ہے اور باقی دوزخی'' اعتبار نہیں کرتے تھے لیکن بہت سے ظاہر بینوں نے ان حدیثوں کا یہ

رتبہ قائم کیا کہ ان کی بناء پر بات بات پر کفر کے فتوے دیئے۔ یہاں تک کہ جو شخص وضع قطع میں ذرا بھی کسی دوسرے کے مشابہ ہو جائے وہ افر ہے، خود متاخرین حنیفہ نے امام صاحب کے اس عمدہ اصول کو نظر انداز کر دیا اور سینکڑوں ہزاروں مسئلے کفر کے ایجاد کر دیے جنکی تفصیل سے فقہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

فقہ

اسلامی علوم مثلاً تفسیر، حدیث، مغازی ان کی ابتدا اگرچہ اسلام کے ساتھ ساتھ ہوئی لیکن جس وقت تک ان کو فن کی حیثیت نہیں حاصل ہوئی وہ کسی خاص شخص کی طرف منسوب نہیں ہوئے۔ دوسری صدی کے اوائل میں تدوین وترغیب شروع ہوئی اور جن لوگوں نے تدوین وترتیب کی وہ ان علوم کے بانی کہلائے۔ چنانچہ بانی فقہ کا لقب امام ابو حنیفہ کو ملا جو درحقیقت اس لقب کے سزاوار تھے، اگر ارسطو علم منطق کا موجد ہے تو بے شبہ امام ابو حنیفہ بھی علم فقہ کے موجد ہیں، امام صاحب کی علمی زندگی کا بڑا کارنامہ فقہ ہی ہے اس لیے ہم اس پر تفصیلی بحث کرنا چاہتے ہیں لیکن اصل مقصد سے پہلے ضروری ہے کہ مختصر طور پر ہم علم فقہ کی تاریخ لکھیں جس سے ظاہر ہے کہ یہ علم کب سے شروع ہوا اور خاص کر یہ کہ امام ابو حنیفہ نے جب اس کو پایا تو اس کی کیا حالت تھی۔

فقہ کی تاریخ پر شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک نہایت عمدہ مضمون لکھا ہے جس کا التقاط ہمارے لیے کافی ہے وہ لکھتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں احکام کی قسمیں نہیں پیدا ہوئی تھی، آنحضرتؐ صحابہ کے سامنے وضو فرماتے تھے اور کچھ نہ بتاتے تھے کہ یہ رکن ہے یہ واجب ہے، یہ مستحب ہے، صحابہ آپ کو دیکھ کر اسی طرح وضو کرتے تھے، نماز کا بھی یہی حال تھا، یعنی صحابہ فرض وواجب وغیرہ کی تفصیل وتدقیق نہیں کیا کرتے تھے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا خود بھی پڑھ لی۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے کسی قوم کو رسول اللہ (صلعم) کے اصحاب سے بہتر نہیں دیکھا۔ لیکن انہوں نے رسول اللہ (صلعم) کی زندگی میں تیرہ مسئلوں سے زیادہ نہیں پوچھے جو سب کے سب قرآن میں موجود ہیں البتہ جو واقعات غیر معمولی طور پر پیش آتے تھے ان میں لوگ آنحضرت صلعم سے استفتاء کرتے اور آنحضرتؐ جواب دیتے

، اکثر ایسا بھی ہوتا کہ لوگوں نے کوئی کام کیا اور آپ نے اس پر تحسین کی یا اس سے ناراضامندی ظاہر کی۔ اس قسم کے فتوے عام مجموں میں ہوتے تھے اور لوگ آنحضرتؐ کے اقوال کو ملحوظ رکھتے تھے۔

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد فتوحات کو نہایت وسعت ہوئی اور تمدن کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، واقعات اس کثرت سے پیش آئے کہ اجتہاد و استنباط کی ضرورت پڑی اور اجمالی احکام کی تفصیل پر متوجہ ہونا پڑا۔ مثلاً کسی شخص نے غلطی سے نماز میں کوئی عمل ترک کر دیا اب بحث پیش آئی کہ نماز ہوئی یا نہیں۔ اس بحث کے پیدا ہونے کے ساتھ یہ تو ممکن نہ تھا کہ نماز میں جس قدر اعمال تھے سب کو فرض کہہ دیا جاتا، صحابہ کو تفریق کرنی پڑی کہ نماز میں کتنے ارکان فرض و واجب ہیں، کتنے مسنون اور مستحب، اس تفریق کے لیے جو اصول قرار دیے جا سکتے تھے ان پر تمام صحابہ کی آراء متفق ہونا ممکن نہ تھا۔ اس لیے مسائل میں اختلاف آرا ہوا اور اکثر مسئلوں میں صحابہ کی مختلف رائیں قائم ہوئیں۔ بہت سے ایسے واقعات پیش آئے کہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں ان کا عین واثر بھی پایا نہیں گیا تھا۔ صحابہ کو ان صورتوں میں استنباط تفریع، حمل النظیر، قیاس سے کام لینا پڑا، ان اصول کے طریقے یکساں نہ تھے اس لیے ضروری اختلاف پیدا ہوئے۔ غرض صحابہ ہی کے زمانہ میں احکام اور مسائل کا ایک دفتر بن گیا اور جدا جدا طریقے قائم ہو گئے۔

صحابہ میں سے جن لوگوں نے استنباط و اجتہاد سے کام لیا اور مجتہد یا فقیہ کہلائے ان میں سے چار بزرگ نہایت ممتاز تھے، عمرؓ علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، حضرت علیؓ و عبد اللہؓ بن مسعود زیادہ تر کوفہ میں رہے اور وہیں ان کے مسائل و احکام کی زیادہ ترویج ہوئی۔ اس تعلق سے کوفہ فقہ کا دارالعلوم بن گیا جس طرح کہ حضرت عمرؓ و عبداللہ بن عباس کے تعلق سے حرمین کو دارالعلوم کا لقب حاصل ہوا تھا۔

حضرت علیؓ بچپن سے رسول اللہ (صلعم) کی آغوش تربیت میں پلے تھے اور جس قدر ان کو آنحضرتؐ کے اقوال و افعال سے مطلع ہونے کا موقع ملا تھا کسی کو نہیں ملا تھا، ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ آپ اور صحابہ کی نسبت کثیر الروایۃ کیوں ہیں؟ فرمایا کہ میں آنحضرت صلعم سے کچھ دریافت کرتا تھا تو بتا[illegible] تھے اور چپ رہتا تھا تو خود ابتداء کرتے تھے"۔ اس کے ساتھ ذہانت، قوت استنباط [illegible] مزاج ایسا بڑھا ہوا تھا کہ عموماً صحابہ اعتراف کرتے تھے حضرت عمرؓ کا

عام قول تھا کہ خدا نہ کرے کہ کوئی مشکل مسئلہ آن پڑے اور علیؓ موجود نہ ہوں عبداللہ بن عباس خود مجتہد تھے مگر کہا کرتے تھے کہ جب ہم کو علیؓ کا فتوے مل جائے تو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔''

عبداللہ بن مسعود بھی حدیث وفقہ دونوں میں کامل تھے، رسول اللہ (صلعم) کے ساتھ جس قدر جلوت اور خلوت میں ہمدم وہمراز رہے تھے بہت کم لوگ رہے ہوں گے، صحیح مسلم میں ابو موسیٰ سے روایت ہے کہ ہم یمن سے آئے اور کچھ دنوں تک مدینہ میں رہے۔ ہم نے عبداللہ بن مسعود کو رسول اللہ (صلعم) کے پاس اس کثرت سے آتے جاتے دیکھا کہ ہم ان کو رسول اللہؐ کے اہل بیت سے گمان کرتے رہے۔ عبداللہ بن مسعود کو یہ دعویٰ تھا کہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کی نسبت میں یہ نہ جانتا ہوں کہ کس باب میں اتری ہے، وہ کہا کرتے تھے کہ ''اگر کوئی شخص قرآن مجید کا مجھ سے زیادہ عالم ہوتا تو میں اس کے پاس سفر کر کے جاتا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ انہوں نے ایک مجمع میں دعویٰ کیا کہ تمام صحابہ جانتے ہیں کہ میں قرآن کا سب سے زیادہ عالم ہوں، شقیق اس جلسے میں موجود تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد اکثر صحابہ کے حلقوں میں شریک ہوا مگر کسی کو عبداللہ بن مسعود کے دعوے کا منکر نہیں پایا۔

عبداللہ بن مسعود باقاعدہ طور پر حدیث وفقہ کی تعلیم دیتے تھے اور ان کی درس گاہ میں بہت سے تلامذہ کا مجمع رہتا تھا، جن میں سے چند شخص یعنی اسو، عبیدہ، حارث علقمہ نہایت نام آور ہوئے، علقمہ رسول اللہ (صلعم) کی زندگی میں پیدا ہوئے تھے اور حضرت عمرؓ اور عثمانؓ، علیؓ، عائشہؓ، سعدؓ، حذیفہؓ، خالد بن ولیدؓ، خبابؓ اور بہت سے صحابہ سے حدیثیں روایت کیں، خاص کر عبداللہ بن مسعودؓ کی صحبت میں اس التزام سے رہتے تھے اور ان کے طور وطریقہ پر اس قدر قدم بقدم چلتے تھے کہ لوگوں کا قول تھا کہ جس نے علقمہ کو دیکھ لیا اس نے عبداللہ بن مسعود کو دیکھ لیا۔ خود عبداللہ بن مسعود کا قول تھا کہ جس قدر علقمہ کی معلومات ہیں میری معلوات اس سے زیادہ نہیں ہیں''۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ صحابہ ان سے مسائل دریافت کرنے آتے تھے۔ عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں میں اگر کوئی شخص علقمہ کا ہمسر تھا تو اسود تھے۔

علقمہ واسود کے انتقال کے بعد ابراہیم نخعی مسند نشین ہوئے اور فقہ کو بہت کچھ وسعت دی، یہاں تک کہ ان کو فقیہ العراق کا لقب ملا۔ علم حدیث میں ان کا یہ پایہ تھا کہ 'صیر فی الحدیث'' کہلاتے تھے، امام شعبی جو علامۃ التابعین کے لقب سے ممتاز ہیں۔ ان کی وفات کے

وقت کہا ''ابراہیم نے کسی کو نہیں چھوڑا جوان سے زیادہ عالم اور فقیہ ہو''۔ اس پر ایک شخص نے تعجب سے پوچھا کیا حسن بصری اور ابن سیرین بھی؟ شعبی نے کہا کہ حسن بصری اور ابن سیرین پر کیا موقوف ہے۔ بصرہ، کوفہ، شام و حجاز میں کوئی شخص ان سے زیادہ عالم نہیں رہا۔

ابراہیم نخعی کے عہد میں مسائل فقہ کا ایک مختصر مجموعہ تیار ہو گیا تھا، جس کا ماخذ حدیث نبوی اور حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے فتاوے تھے، یہ مجموعہ گو مرتب طور پر قلمبند نہیں کیا گیا۔ ان کے شاگردوں کو ان کے مسائل زبانی یاد تھے، سب سے زیادہ یہ مجموعہ حماد کے پاس جمع تھا جو ابراہیم کے تلامذہ میں نہایت ممتاز تھا چنانچہ ان کے مرنے کے بعد فقہ کی مسند خلافت بھی انہیں کو ملی حماد نے گو فقہ کو چنداں ترقی نہ دی لیکن ابراہیم کے مجموعہ فقہ کے بہت بڑے حافظ تھے حماد نے ۱۲۰ھ میں قضا کی اور لوگوں نے ان کی جگہ امام ابوحنیفہ کو فقہ کی مسند پر بٹھایا۔

امام صاحب کے زمانہ تک اگرچہ فقہ کے معتد بہ مسائل مدون ہو چکے تھے لیکن اولاً تو یہ تدوین صرف زبانی روایت تھی دوسرے جو کچھ تھا فن کی حیثیت سے نہ تھا، نہ استنباط و استدلال کے قواعد قرار پائے تھے، نہ احکام کی تفریع کے اصول منضبط تھے، نہ حدیثوں میں امتیاز مراتب تھا نہ قیاس اور شبیہ النظیر علی النظیر کے قاعدے مقرر تھے، مختصر یہ کہ فقہ جزئیات مسائل کا نام تھا اور اس کو قانون کے رتبہ تک پہنچانے کے لیے بہت سے زینے باقی تھے۔

تاریخ سے اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ امام ابوحنیفہ کو خاص کس وجہ سے فقہ کی تدوین کا خیال پیدا ہوا۔ قلائد عقود الجمان کے مصنف نے انموذج القتال سے اس کا ایک قصہ نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ دو شخص حمام میں نہانے گئے اور حمامی کے پاس کچھ امانت رکھتے گئے ایک ان میں سے نہا کے نکلا اور حمامی سے امانت طلب کی، اس نے دے دی یہ لے کے چلتا ہوا، دوسرا حمام سے باہر آیا اور امانت مانگی تو اس نے عذر کیا کہ میں نے تمہارے شریک کے حوالے کر دی۔ اس نے عدالت میں استغاثہ کیا، قاضی صاحب نے حمامی کو ملزم ٹھہرایا کہ جب دونوں نے مل کر تیرے پاس امانت رکھی تھی تو تجھ کو ضرور تھا کہ دونوں کی موجودگی میں واپس کرتا حمامی گھبرایا ہوا امام ابوحنیفہ کے پاس آیا، امام صاحب نے کہا کہ تم اس سے جا کر کہو کہ میں تمہاری امانت ادا کرنے کو تیار ہوں، لیکن قاعدے کے موافق تنہا تم کو نہیں دے سکتا، شریک کو لاؤ تو لے جاؤ، اس واقعہ کے بعد امام صاحب کو فقہ کی تدوین کا خیال پیدا ہوا اور اس کی ترتیب شروع کی۔

ممکن ہے کہ یہ واقعہ صحیح ہو، لیکن اس خیال کے پیدا ہونے کے اصلی اسباب اور تھے، یہ امر تاریخوں سے ثابت ہے کہ امام صاحب کو تدوین فقہ کا خیال قریباً ۱۲۰ھ میں پیدا ہوا، یعنی جب ان کے استاد حماد نے وفات پائی یہ وہ زمانہ ہے کہ اسلام میں تمدن نہایت وسعت پکڑ گیا تھا عبادات اور معاملات کے متعلق اس کثرت سے واقعات پیدا ہو گئے تھے اور ہوتے جاتے تھے کہ ایک مرتبہ مجموعہ قانون کے بغیر کسی طرح کام نہیں چل سکتا تھا، نیز سلطنت کی وسعت اور دوسری قوموں کے میل جول سے تعلیم و تعلم نے اس قدر وسعت حاصل کر لی تھی کہ زبانی سند و روایت اس کا تحمل نہیں کر سکتی تھی، ایسے وقت پر قدرتی طور پر لوگوں کے دلوں میں خیال آیا ہوگا کہ ان جزئیات کو اصول کے ساتھ ترتیب دے کر ایک فن بنا دیا جائے۔

امام ابوحنیفہ کی طبیعت مجتہدانہ اور غیر معمولی طور پر مقننانہ واقعہ ہوئی تھی، اس کے ساتھ تجارت کی وسعت اور ملکی تعلقات نے ان کو معاملات کی ضرورتوں سے خبردار کر دیا تھا، اطراف و بلاد سے ہر روز جو سینکڑوں ضروری استفتاء آتے تھے ان سے ان کو اندازہ ہوتا تھا کہ ملک کو اس فن کی کس قدر حاجت ہے، قضاۃ اور حکام فصل قضایا میں جو غلطیاں کرتے تھے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔

غرض یہ اسباب اور وجوہ تھے جنہوں نے ان کو اس کی تدوین اور ترتیب پر آمادہ کیا ممکن ہے کہ کسی خاص واقعہ سے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اس آمادگی کو اور تحریک ہوئی ہو جس کے ساتھ عملی کوشش کا ظہور ہوا۔

امام صاحب نے جس طریقہ سے فقہ کی تدوین کا ارادہ کیا وہ نہایت وسیع اور پرخطر کام تھا، اس لیے انہوں نے اتنے بڑے کام کو اپنی ذاتی رائے اور معلومات پر منحصر کرنا نہیں چاہا۔ اس غرض سے انہوں نے اپنے شاگردوں میں سے چند نامور شخص انتخاب کئے جن میں سے اکثر خاص خاص فنون میں جو تکمیل فقہ کے لیے ضروری تھے استاد زمانہ تسلیم کئے جاتے تھے، مثلاً یحییٰ بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، قاضی ابو یوسف، داؤد الطائی، حبان مندل حدیث و آثار میں نہایت کمال رکھتے تھے، امام زفر قوت استنباط میں مشہور تھے قاسم بن معن اور امام محمد کو ادب اور عربیت میں کمال تھا۔ امام صاحب نے ان لوگوں کی شرکت سے ایک مجلس مرتب کی اور باقاعدہ طور سے فقہ کی تدوین شروع ہوئی امام طحاوی نے بسند متصل اسد بن فرات سے روایت کی ہے کہ

ابو حنیفہ کے تلامذہ جنہوں نے فقہ کی تدوین کی چالیس تھے، جن میں یہ لوگ زیادہ ممتاز تھے، ابو یوسف، زفر، داؤدالطائی، اسد بن عمر یوسف بن خالد التیمی، یحیٰ بن ابی زائدہ۔ امام طحاوی نے یہ بھی روایت کی ہے کہ لکھنے کی خدمت یحیٰ سے متعلق تھی اور وہ تیس برس تک اس خدمت کواجام دیتے رہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس کام میں کم وبیش تیس برس کا زمانہ صرف ہوا یعنی ۱۲۱ھ سے ۱۵۰ھ تک جو امام ابو حنیفہ کی وفات کا سال ہے، لیکن یہ غلط ہے کہ یحیٰ شروع سے اس کام میں شریک تھے۔ یحیٰ ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے تھے اس لیے وہ شروع سے کیونکر شریک ہو سکتے تھے، طحاوی نے جن لوگوں کے نام گنائے ہیں ان کے سوا عافیہ ازدی، ابو علی عزی، علی مسہر، قاسم بن معن، حبان، مندل بھی اس مجلس کے ممبر رہے تھے۔

تدوین کا طریقہ یہ تھا کہ کسی خاص باب کا کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تھا اگر اس کے جواب میں سب لوگ متفق الرائے ہوتے تو اسی وقت قلمبند کر لیا جاتا اور نہایت آزادی سے بحثیں شروع ہوتیں کبھی کبھی بہت دیر تک بحث قائم رہتی، امام صاحب بہت غور اور تحمل کے ساتھ سب کی تقریریں سنتے اور بالآخر ایسا جچا تلا فیصلہ کرتے کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ امام صاحب کے فیصلہ کے بعد بھی لوگ اپنی اپنی آرا پر قائم رہتے اس وقت وہ سب مختلف اقوال قلمبند کر لیے جاتے، اس کا التزام تھا کہ جب تک تمام شرکائے جلسہ جمع نہ ہولیں کسی مسئلہ کو طے نہ کیا جائے۔

جواہر مضیۂ کے مصنف نے عافیہ بن یزید کے تذکرہ میں اسحٰق سے روایت کی ہے کہ امام ابو حنیفہ کے اصحاب کسی مسئلہ میں بحث کرتے ہوتے اور عافیہ موجود نہ ہوتے تو امام صاحب فرماتے کہ عافیہ کو آلینے دو جب وہ آلیتے اور اتفاق کرتے تب وہ مسئلہ درج تحریر کیا جاتا اس طرح تیس برس کی مدت میں یہ عظیم الشان کام انجام کو پہنچا، امام صاحب کی اخیر عمر قید خانہ میں گزری، وہاں بھی یہ کام برابر جاری رہا۔

اس مجموعہ کی ترتیب جیسا کہ حافظ ابوالمحاسن نے بیان کی ہے یہ تھی۔ اول باب الطہارۃ باب الصلوٰۃ باب الصوم، پھر عبادات کے اور ابواب کے اس کے بعد معاملات، سب سے اخیر میں باب المیراث، امام صاحب کی زندگی ہی میں اس مجموعہ نے وہ حسن قبول حاصل کیا کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے مشکل سے قیاس میں آسکتا ہے جس قدر اس کے اجزاء تیار ہوتے

جاتے تھے ساتھ ہی ساتھ تمام ملک میں اس کی اشاعت ہوتی جاتی تھی امام صاحب کی درسگاہ
ایک قانونی مدرسہ تھا جس کے طلباء نہایت کثرت سے ملکی عہدوں پر مامور ہوئے اور ان کے آئین،
حکومت کا یہی مجموعہ تھا، تعجب ہے کہ جن لوگوں کو امام صاحب سے ہمسری کا دعویٰ تھا وہ بھی اس
کتاب سے بے نیاز نہ تھے امام سفیان ثوری نے بڑے لطائف الحیل سے کتاب الرہن کی نقل
حاصل کی اور اس کو اکثر پیش نظر رکھتے تھے زائدہ کا بیان ہے کہ میں نے ایک دن سفیان کے
سرہانے ایک کتاب دیکھی جس کا وہ مطالعہ کر رہے تھے ان سے اجازت مانگ کر میں اس کو دیکھنے
لگا تو امام ابوحنیفہ کی کتاب الرہن نکلی، میں نے تعجب سے پوچھا کہ "آپ ابوحنیفہ کی کتابیں دیکھتے
ہیں" بولے کاش ان کی سب کتابیں میرے پاس ہوتیں [1]۔

یہ بھی کچھ کم تعجب کی بات نہیں کہ باوجودیکہ اس وقت بڑے بڑے مدعیان فن موجود
تھے، اور ان میں بعض امام ابوحنیفہ سے مخالفت بھی رکھتے تھے تاہم کسی کو اس کتاب کی ردوقدح کی
جرات نہیں ہوئی۔ امام رازی مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں۔ **ان اصحاب الرای اظہر و امذاھبھم و کانت الدنیا مملوۃ من المحدثین و رواۃ الاخبار ولم یقدر احد منھم الطعن فی اقاویل اصحاب الرای** ۔ (یعنی اصحاب الرائے ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ
نے اپنے مسائل جس زمانہ میں ظاہر کئے دنیا محدثین اور راویان اخبار سے بھری ہوئی تھی تاہم کسی
کو یہ قدرت نہ ہوئی کہ ان کے اقوال پر اعتراض کرتا۔" امام رازی نے تو عام نفی کی ہے لیکن ہم کو
زیادہ استقصاً سے معلوم ہوا کہ اس عموم میں ایک استثنا ہے کیونکہ بیہقی نے تصریح کی ہے کہ امام
اوزاعی نے ابوحنیفہ کی کتاب السیر کا رد لکھا تھا جس کا جواب قاضی ابو یوسف نے لکھا،

غالباً یہ مجموعہ بہت بڑا مجموعہ تھا اور ہزاروں مسائل پر مشتمل تھا قلائد عقود العقیان کے
مصنف نے کتاب الصیانہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جس قدر مسائل مدون کئے ان
کی تعداد بارہ لاکھ نوے ہزار سے کچھ زیادہ ہے، شمس الائمہ کردری نے لکھا ہے کہ یہ مسائل چھ لاکھ
تھے۔" یہ خاص تعداد شاید صحیح نہ ہو، لیکن کچھ شبہ نہیں کہ ان کی تعداد لاکھوں سے کم نہ تھی، امام محمد کی
جو کتابیں آج موجود ہیں ان سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

اگرچہ اس میں کسی طرح شبہ نہیں ہو سکتا کہ امام ابوحنیفہ کی زندگی ہی میں فقہ کے تمام

---

[1] عقود الجمان باب عاشر

ابواب مرتب ہو گئے تھے، رجال و تاریخ کی کتابوں میں اس کا ثبوت ملتا ہے جس کا انکار گویا تواتر کا انکار ہے لیکن افسوس ہے کہ وہ مجموعہ ایک مدت سے ضائع ہو گیا ہے اور دنیا کے کسی کتب خانہ میں اس کا پتہ نہیں چلتا، امام رازی مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں کہ ابو حنیفہ کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی، امام رازی نے ۶۰۶ھ میں انتقال کیا، اس لحاظ سے کم از کم چھ سو برت ہو گئے کہ امام ابو حنیفہ کی تصنیفات ناپید ہو چکیں، امام صاحب کی تصنیفات کا ضائع ہو جانا اگر چہ کچھ محل تعجب نہیں، اس عہد کی ہزاروں کتابوں میں سے آج ایک کا بھی وجود نہیں، امام اوزاعی، ابن جریج، ابن عروبہ، حماد بن ابی معمر ان کی تالیفات عین اسی زمانہ میں شائع ہوئیں، جب امام ابو حنیفہ کا دفتر فقہ مرتب ہو رہا تھا تاہم ان کتابوں کا نام بھی کوئی نہیں جانتا، لیکن امام ابو حنیفہ کی تصنیفات کی گمشدگی کی ایک خاص وجہ ہے، امام صاحب کا مجموعہ فقہ اگر چہ بجائے خود مرتب اور خوش اسلوب تھا، لیکن قاضی ابو یوسف و امام محمد نے انہی مسائل کو اس توضیح و تفصیل سے لکھا اور ہر مسئلہ پر استدلال و براہان کے ایسے حاشیے اضافہ کئے کہ انہی کو رواج عام ہو گیا اور راصل ماخذ سے لوگ بے پرواہ ہو گئے، ٹھیک اسی طرح کہ متاخرین نحویوں کی تصنیفات کے بعد فراء کسائی، خلیل اخفش، ابو عبیدہ کی کتابیں دنیا سے بالکل ناپید ہو گئیں، حالانکہ وہ فن نحو کے بانی اور مدون اول تھے۔

امام صاحب کے مسائل کا آج کو ذخیرہ دنیا میں موجود ہے وہ امام محمد اور قاضی ابو یوسف کی تالیفات ہیں، جن کے نام اور مختصر حالات ان بزرگوں کے ترجمہ میں ہم لکھیں گے۔

یہ فقہ اگر چہ عام طور سے فقہ حنفی کہلاتی ہے، لیکن درحقیقت وہ چار شخصوں یعنی امام ابو حنیفہ، زفر، قاضی ابو یوسف، امام محمد کی آراء کا مجموعہ ہے، قاضی ابو یوسف و امام محمد نے بہت سے مسائل میں امام ابو حنیفہ کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ فقہائے حنیفہ نے روایتیں نقل کی ہیں۔ ان صاحبوں کو اعتراف تھا کہ "ہم نے جو اقوال ابو حنیفہ کے خلاف کہے وہ بھی امام ابو حنیفہ ہی کے اقوال ہیں۔ کیونکہ بعض مسئلوں میں امام ابو حنیفہ نے متعدد اور مختلف رائیں ظاہر کی تھیں۔" یہ روایتیں شامی وغیرہ میں مذکور ہیں۔ لیکن ان کا ثابت ہونا مشکل ہے ہمارے نزدیک یہ ان فقہا کا حسن ظن ہے، قاضی ابو یوسف اور امام محمد اجتہاد مطلق کا منصب رکھتے تھے اور ان کو اختلاف کا پورا حق حاصل تھا، اسلام کی ترقیاں اسی وقت تک رہیں کہ جب تک لوگ باوجود حسن عقیدت کے بزرگوں اور استادوں کی رائے سے علانیہ مخالفت کرتے تھے اور خیالات کی ترقی محدود نہ تھی،

یہ مسائل جو فقہ حنفی کے نام سے موسوم ہیں نہایت تیزی سے تمام ملک میں پھیل گئے، عرب میں تو چنداں ان مسائل کو رواج نہ ہوا، کیونکہ مدینہ میں امام مالک اور مکہ میں اور ائمہ ان کے حریف مقابل موجود تھے لیکن عرب کے سوا تمام ممالک اسلامی میں جن کی وسعت سندھ سے ایشیائے کوچک تک تھی عموماً انہی کا طریقہ جاری ہو گیا، ہندوستان سندھ، کابل، بخارا وغیرہ میں تو ان کے اجتہاد کے سوا کسی کا اجتہاد تسلیم ہی نہیں کیا جاتا دوسرے ممالک میں گو شافعی و حنبلی فقہ کا رواج ہوا۔ لیکن فقہ حنفی کو دبا نہیں سکا البتہ بعض ملکوں میں وہ بالکل معدوم ہو گیا اور اس کے خاص اسباب تھے۔ مثلاً افریقہ میں ۴۰۷ھ تک امام ابو حنیفہ کا طریقہ تمام طریقوں پر غالب تھا، لیکن معز بن بادیس نے ۴۰۷ھ میں جب وہاں کی مستقل حکومت قائم کی تو حکومت کے زور سے تمام ملک میں مالکی فقہ کو رواج دے دیا جو کہ آج تک قائم ہے [1]۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ عنانِ حکومت جن لوگوں کے ہاتھ میں رہی وہ اکثر حنفی ہی فقہ کے پابند تھے، خلفائے عباسیہ تو اس بحث سے خارج ہیں۔ کیونکہ یہ خاندان جب تک اوج پر رہا، یہ لوگ تلوار کے ساتھ قلم کے بھی مالک رہے۔ یعنی ان کو خود دعویٰ اجتہاد تھا اور کبھی کسی کی تقلید نہیں کی، تنزل کے بعد وہ اس قابل ہی نہیں رہے کہ ان کے حالات سے کسی ملکی اثر کا اندازہ کیا جائے، تاہم ان میں اگر کسی نے تقلید گوارا کی تو ابو حنیفہ ہی کی کی، عبداللہ بن معتز جو فن بدیع کا موجد تھا، اور خلفائے عباسیہ میں سب سے بڑا شاعر اور ادیب تھا حنفی المذہب [2] تھا۔

عباسیہ کے تنزل کے بعد جن خاندانوں کو عروج ہوا، اکثر حنفی تھے خاندان سلجوقی جس نے ایک وسیع مدت تک حکومت کی اور جن کے دائرۂ حکومت کی وسعت طول میں کاشغر سے بیت المقدس تک اور عرض میں قسطنطنیہ سے بلاد خزر تک پہنچی تھی حنفی تھا، محمود غزنوی جس کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے فقہ حنفی کا بہت بڑا عالم تھا فن فقہ میں اس کی ایک نہایت عمدہ تصنیف موجود ہے جس کا نام التفرید ہے اور جس میں کم و بیش ساٹھ ہزار مسئلے ہیں۔

نورالدین زنگی کا نام چھپا ہوا نہیں ہے جو ہماری نمایاں شخصیتوں میں داخل ہے بیت المقدس کی لڑائیوں میں اول اسی نے نام حاصل کیا، صلاح الدین فاتح بیت المقدس اسی کے دربار میں ملازم تھا۔ دنیا میں پہلا دارالحدیث اسی نے قائم کیا اگرچہ وہ شافعی و مالکی فقہ کی عزت

---

[1] تاریخ ابن خلکان ترجمہ معز بن بادیس [2] تاریخ ابن خلکان ترجمہ عبداللہ بن المعتز

کرتا تھا لیکن وہ خود اور اس کا تمام خاندان مذہباً حنفی [1] تھا، صلاح الدین خود شافعی تھا لیکن اس کے خاندان میں بھی حنفی المذہب موجود تھے۔ الملک المعظم عیسیٰ بن الملک العادل جو ایک وسیع ملک کا بادشاہ تھا علامہ ابن خلکان اس کے حالات میں لکھتے ہیں کہ وہ نہایت عالی ہمت، فاضل، ہوشمند، دلیر، پر رعب تھا اور حنفی مذہب میں غلو رکھتا تھا، چراکسہ مصر جو نویں صدی کے آغاز میں مصر کی حکومت پر پہنچے، اور ۱۴۸ برس تک فرماں روا رہے اور بہت سی فتوحات حاصل کی۔ خود حنفی تھے اور ان کے دربار میں اسی مذہب کو زیادہ فروغ تھا۔ سلاطین ترک جو کم وبیش چھ سو برس سے روم کے فرمانروا ہیں اور آج انہی کی سلطنت اسلام کی عزت و وقار کی امیدگاہ ہے عموماً حنفی مذہب تھے، خود ہمارے ہندوستان کے فرماں رواخوانین اور آل تیمور اسی مذہب کے پابند رہے اور ان کی وسیع سلطنت میں اس طریقہ کے سوا اور کسی طریقہ کو رواج نہ ہوسکا۔

بعضوں کا خیال ہے کہ حنفی مذہب کو جو قبول عام حاصل ہوا وہ حکومت کے صدقے سے ہوا ابن حزم جو ارباب ظاہر کے مشہور امام ہیں ان کا قول ہے کہ ''دو مذہبوں نے سلطنت کے زور سے ابتداہی میں رواج عام حاصل کیا ایک ابوحنیفہ کا مذہب، کیونکہ جب قاضی ابو یوسف صاحب کو قاضی القضاۃ کا منصب ملا تو انہوں نے حنفی لوگوں کو عہدۂ قضا پر مقرر کیا۔ دوسرا امام مالک کا مذہب اندلس میں کیونکہ امام مالک کے شاگرد یحییٰ اصمودی خلیفہ اندلس کے نہایت مقرب تھے اور کوئی شخص بغیر ان کے مشورے کے عہدۂ قضا پر مقرر نہیں ہوسکتا تھا وہ صرف اپنے ہم مذہبوں کو مقرر کراتے تھے [2]۔

لیکن یہ ابن حزم کی ظاہر بینی ہے، امام ابوحنیفہ ۱۲۰ھ میں مسند اجتہاد پر بیٹھے، قاضی ابو یوسف نے ۱۷۰ھ کے بعد قاضی القضاۃ کا منصب حاصل کیا۔ کیونکہ ان کے تقرر اور عروج کا زمانہ ہارون الرشید کے عہد سے شروع ہوتا ہے جو ۱۷۰ھ میں تخت نشین ہوا تھا، قاضی ابو یوسف کے فروغ سے پہلے پچاس برس کا زمانہ گزر چکا تھا، جس میں امام ابوحنیفہ کے مذہب نے قبول عام حاصل کرلیا تھا اور ان کے سینکڑوں شاگرد قضاء کے عہدوں پر مامور ہوچکے تھے، اس کامیابی کو کس کی طرف منسوب کیا جائے؟ یہ ضرور ہے کہ قاضی ابو یوسف کی وجہ سے امام صاحب کے مسائل کو اور زیادہ عروج ہوا۔ لیکن مذہب حنفی کا اصل عروج قاضی صاحب کی کوششوں کا محتاج نہ تھا، امام

[1] الجواہر المغنیہ ترجمہ نورالدین زنگی۔ [2] ابن حزم کے اس قول کو ابن خلکان نے یحییٰ اصمودی کے ترجمہ میں نقل کیا ہے

رازی نے باوجود مخالفت کے تسلیم کیا ہے کہ ثم انہ الماقوی مذہب اصحاب الرائے **واشتھر وعظم وقعتہ فی القلوب ثم اتفق اتصال ابی یوسف ومحمد نجدمۃ ھارون الرشید عظمت تلک القوۃ جدالان العلم و السلطنتہ حصلامعاً** یعنی اصحاب الرائے کا مذہب قوی ہو گیا اور شہرت پکڑ گیا اور اس کی وقعت دلوں میں بہت ہو گئی۔ پھر اس کے بعد ابو یوسف و محمد کو ہارون الرشید کے دربار میں رسائی ہوئی تو یہ قوت بہت ہی زیادہ بڑھ گئی کیونکہ علم اور حکومت دونوں مجتمع ہو گئے۔

اس کے علاوہ قاضی ابو یوسف کا اثر ہارون الرشید کے زمانہ تک محدود تھا۔ دیرپا اور غیر منقطع کامیابی کس نے پیدا کی؟ یوں تو بعض اور ائمہ نے بھی اپنے عہد میں نہایت عروج حاصل کیا تھا، امام اوزاعی اپنی زندگی میں بلکہ زمانہ مابعد تک تمام شام کے امام مطلق تسلیم کئے گئے اور ان ممالک میں لوگ عموماً انہی کی تقلید کرتے تھے لیکن وہ ایک محدود اثر تھا جو بہت جلد جاتا رہا۔ ان واقعات سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے مذاہب میں ایسی خاص خوبیاں ہیں جو اور مذہبوں میں نہیں۔

تمام ممالک اسلامی میں جن ائمہ کی فقہوں نے رواج پایا وہ چار ہیں، ابو حنیفہ، مالک شافعی، احمد بن حنبل، مسائل فقہ کی ترویج واشاعت کا سبب اگرچہ خود ان مسائل کی خوبی وعمدگی ہے لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اس امر میں واضع فقہ کے ذاتی رسوخ اور عظمت کو بھی بہت کچھ دخل ہے ہمارے نزدیک امام ابو حنیفہؒ کے سوا اور مجتہدین کی فقہ کی ترویج واشاعت کا باعث زیادہ تر ان کی ذاتی خصوصیتیں تھیں۔ مثلاً امام مالک مدینہ کے رہنے والے تھے جو نبوت کا مرکز اور خلفائے راشدین کا دارالخلافہ رہ چکا تھا۔ اس تعلق سے لوگوں کو عموماً مدینہ اور ارباب مدینہ کے ساتھ خلوص اور عقیدت تھی، ان کا خاندان ایک علمی خاندان تھا، ان کے دادا مالک بن ابی عامر نے بڑے بڑے صحابہ سے حدیثیں سیکھی تھیں، ان کے چچا شیخ الحدیث تھے، امام مالک نے جب حدیث وفقہ میں کمال پیدا کیا تو یہ عارضی اوصاف ان کی ذاتی قابلیت پر طرہ بن کر نمایاں ہوئے اور تمام اطراف و دیار میں ان کی شہرت کا سکہ جم گیا۔

امام شافعی کو اور بھی زیادہ خصوصیتیں حاصل تھیں۔ مکہ معظمہ وطن تھا۔ باپ کی طرف سے قریشی اور مطلبی اور ماں کی طرف سے ہاشمی تھے۔ ان کا تمام خاندان ہمیشہ سے معزز وممتاز چلا

آتا تھا، ان کے پردادا سائب جنگ بدر میں ہاشمیوں کے علم بردار تھے اور گرفتار ہو کر اسلام لائے تھے۔ مکہ معظمہ کی ولایت، خاندان کا اعزاز، رسول اللہ (صلعم) کی ہم نسبی۔ ایسی چیزیں تھیں جن سے بڑھ کر حسن قبول اور مرجعیت کے لیے کوئی کارگر آلہ نہیں ہو سکتا تھا۔

امام ابو حنیفہ میں اس قسم کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ قریشی اور ہاشمی النسل ہونا تو ایک طرف وہ عربی النسل بھی نہ تھے۔ خاندان میں کوئی شخص ایسا نہیں گزرا جو اسلامی گروہ کا مرجع اور مقتدا ہوتا، آبائی پیشہ تجارت تھا اور خود بھی تمام عمر اسی ذریعہ سے بسر کی۔ کوفہ جوان کا مقام ولادت تھا گو دار العلم تھا لیکن مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا ہمسر کیونکر ہو سکتا تھا، بعض اتفاقی اور ناگزیر اسباب سے ارباب روایات کا ایک گروہ ان کی مخالفت پر کمر بستہ تھا۔ غرض حسب قبول اور عام اثر کے لیے جو اسباب درکار ہیں بالکل نہ تھے باوجود اس کے ان کی فقہ کا تمام ممالک اسلامیہ میں اس وسعت اور ترقی کے ساتھ رواج پانا یقیناً اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا طریقہ' فقہ انسانی ضرورتوں کے نہایت مناسب اور موزوں واقع ہوا تھا۔ اور بالخصوص تمدن کے ساتھ جس قدر ان کی فقہ کو مناسبت تھی کسی کی فقہ کو نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ کے مذہب کو زیادہ تر انہی ملکوں میں رواج ہوا جہاں تہذیب و تمدن نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی، علامہ ابن خلدون اس بات کی وجہ بتاتے ہیں کہ مغرب، واندلس میں امام مالکؒ کا مذہب کیوں زیادہ رائج ہوا، وہ لکھتے ہیں کہ مغرب واندلس میں بدویت غالب تھی اور وہاں کے لوگوں نے وہ ترقی نہیں حاصل کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں امام مالکؒ کی فقہ کے سوا اور کسی فقہ کو فروغ نہ ہو سکا۔

حنفی فقہ جس میں امام ابو حنیفہ کے علاوہ ان کے نامور شاگردوں کے مسائل بھی شامل ہیں اس زمانہ کا بہت بڑا قانون بلکہ بہت بڑا مجموعہ قوانین تھا، زمانہ بعد میں گو علمائے حنفیہ نے اس پر بہت کچھ اضافہ کیا۔ اور جزئیات کی تفریع کے ساتھ اصول فن کو نہایت ترقی دی۔ لیکن ایجاد کے زمانہ میں جس قدر کسی فن کی حالت ہو سکتی ہے وہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی جو امام ابو حنیفہ کے عہد میں فقہ کو حاصل ہو چکی تھی، اس مجموعہ میں عبادات کے علاوہ دیوانی، فوجداری، تعزیرات، لگان، مالگذاری، شہادت، معاہدہ، وراثت، وصیت اور بہت سے قوانین شامل تھے، اس کی وسعت اور خوبی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہارون الرشید اعظم کی وسیع سلطنت جو سندھ سے ایشیائے کوچک تک پھیلی ہوئی تھی انہی اصولوں پر قائم تھی اور اس عہد کے تمام واقعات اور

معاملات انہی قواعد کی بنا پر فیصل ہوتے تھے۔

یہ قانون جس کو فقہ کہتے ہیں دو قسم کے مسائل پر مشتمل ہے اور اس لحاظ سے اس کے وضع کی دو مختلف حیثیتیں ہیں۔

(۱) وہ مسائل جو شریعت سے ماخوذ ہیں اور تشریعی احکام کہے جا سکتے ہیں۔

(۲) وہ احکام جن سے شریعت نے سکوت کیا ہے اور جو تمدن اور معاشرت کی ضرورتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ یا جن کا ذکر شریعت میں ہے لیکن تشریعی طور پر نہیں

پہلی قسم کے مسائل کے لحاظ سے فقیہ کی حیثیت شارح اور مفسر کی حیثیت ہے اور اس اعتبار سے اس کے لیے جس قسم کی قابلیت درکار ہے وہ مہارت زبان واقفیت نصوص قوت استنباط، توفیق متعارضات ترجیح دلائل ہے۔ دوسری قسم کے احکام کے لحاظ سے واضع فقہ ایک مقنن کی حیثیت رکھتا ہے اور اس لحاظ سے اس کی قابلیت اس رتبہ کی ہونی چاہیے جیسی کہ دنیا کے اور مشہور مقننوں کی تھی۔ یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسری سے ممتاز ہیں اسلام میں بہت سے نامور گذرے ہیں جو قرآن و حدیث کے عمدہ مفسر یا شارح تھے لیکن مقننانہ قابلیت سے معرا تھے۔ اسی طرح ایسے لوگ بھی گذرے ہیں جو مقنن اور واضع قانون تھے لیکن نصوص شرعی کے مفسر نہیں کہے جا سکتے تھے، جہاں تک ہماری واقفیت ہے، اسلام کے اس وسیع دور میں قدرت نے یہ دونوں قابلیتیں جس اعلیٰ درجہ پر امام ابوحنیفہ میں جمع کر دی تھیں کسی مجتہد یا امام میں جمع نہیں ہوئیں۔

علم فقہ کے متعلق سب سے بڑا کام امام صاحب نے جو کیا وہ تشریعی اور غیر تشریعی احکام میں امتیاز قائم کرنا تھا۔

شارع علیہ السلام کے اقوال و افعال جو سلسلہ روایت سے منضبط کئے گئے ہیں ان میں بہت سے ایسے امور تھے جن کو منصب رسالت سے کچھ تعلق نہ تھا۔ لیکن بطور ایک اصطلاح کے ان سب پر حدیث کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے۔ فقہ کی توضیع میں ایک عام اور سخت غلطی یہ ہوئی کہ لوگوں نے ان امور کو شرعی حیثیت پر محمول کیا اور اس خیال سے ان پر مسائل اور احکام کی بنیاد قائم کی۔ حالانکہ وہ حدیثیں منصب شریعت سے علاقہ نہیں رکھتی تھی شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے [1] ہیں کہ آنحضرت صلعم سے جو کچھ روایت کیا گیا ہے اور کتب حدیث میں اس کی تدوین ہوئی اس کی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ بریلی ص ۱۳۳ و ۱۳۴

دو قسمیں ہیں

(۱) جو تبلیغ رسال سے تعلق رکھتا ہے اور اسی بارے میں یہ آیت اتری ہے مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْ ۔ "یعنی پیغمبر جو چیز تم کو دے اس کو اختیار کرو اور جس سے روکے اس سے باز آؤ۔"

(۲) جو تبلیغ رسالت سے متعلق نہیں۔ چنانچہ ان کی نسبت آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا۔ **انما انا بشر اذا امرتکم بشی من دینکم فخذوہ و اذا امرتکم بشی من رای فانما انا بشر** "یعنی میں ایک آدمی ہوں، جب میں کوئی مذہبی حکم دوں تو تم لوگ اس کے پابند ہو اور جب میں اپنی رائے سے کسی بات کا حکم دوں تو میں صرف ایک آدمی ہوں اس دوسری قسم میں وہ حدیثیں ہیں جو آں حضرت صلعم نے طب کے متعلق ارشاد کیں اور اس قسم میں وہ افعال داخل ہیں جو آنحضرت صلعم سے عادۃً صادر ہوئے نہ کہ عبادۃً اور اتفاقاً واقع ہوئے نہ کہ قصداً۔ اور اسی قسم میں وہ حدیثیں داخل ہیں جو آنحضرت صلعم نے اپنی قوم کے گمان کے موافق بیان کیں، مثلاً ام زرع کی حدیث اور خرافہ کی حدیث اور اس قسم میں وہ امور داخل ہیں جو آنحضرت صلعم نے اس وقت مصلحت جزی کے موافق اختیار فرمائے اور وہ سب لوگوں پر واجب العمل نہیں ہیں مثلاً فوجوں کی تیاری اور شعار کی تعیین، اسی بناء پہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ اب رمل کرنے کی کیا ضرورت ہے جس قوم کے دکھانے کے لیے ہم رمل کرتے تھے اس کو خدا نے ہلاک کر دیا اور آنحضرت صلعم کے بہت سے احکام اسی قسم میں داخل ہیں مثلاً یہ حکم جہاد میں جو شخص کسی کافر کو قتل کرے تو اس کے ہتھیار کا مالک بھی وہی ہوگا۔"

شاہ ولی اللہ صاحب نے حدیث کی قسموں میں جو دقیق فرق بیان کیا یہ وہی نکتہ ہے جس کی طرف سب سے پہلے امام ابوحنیفہ کا ذہن منتقل ہوا اسی بناء پر بہت سے مسائل مثلاً غسل جمعہ، خروج النساء الی العیدین، نفاذ طلاق، تعیین جزیہ، تشخیص خراج، تقسیم غنائم وغیرہ میں جو حدیثیں وارد ہیں ان کو امام ابوحنیفہ نے دوسری قسم میں داخل کیا ہے لیکن امام شافعی وغیرہ ان حدیثوں کو بھی تشریعی حدیثیں سمجھتے ہیں۔

حنفی فقہ کو بمقابلہ اور فقہوں کے بہت بڑی خصوصیت جو حاصل ہے وہ یہی ہے کہ اس کے مسائل عموماً اسی قائدے پر مبنی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس میں وہ وسعت اور آزادی پائی جاتی

ہے جو اور ائمہ کے مسائل میں نہیں پائی جاتی۔ یہ قاعدہ اگرچہ نہایت صاف اور صریح ہے لیکن افسوس ہے کہ اور ائمہ نے اس پر لحاظ نہیں کیا اور اگر خلفائے راشدین کی نظیریں موجود نہ ہوتیں تو شاید امام ابوحنیفہ کو بھی اس کے اختیار کرنے کی جرأت نہ ہوتی، اگرچہ امام صاحب کے بعد بھی بعض ائمہ نے جن کو ان کے مقابلہ میں اجتہاد کا دعویٰ تھا اس عمدہ اصول کی پیروی نہ کی اور اسی غلط خیال پر قائم رہے لیکن اس میں کون شبہ کرسکتا ہے کہ امام صاحب کی رائے نہایت صحیح اور دقیقہ رسی پر مبنی تھی۔

خلفائے راشدین سے بڑھ کر کون احکام شریعت کا نکتہ شناس ہوسکتا ہے۔ انہوں کیا کیا؟ حضرت عمرؓ کے آغاز خلافت تک امہات الاولاد یعنی وہ لونڈیاں جن سے اولاد ہوچکی ہو عموماً خریدی اور بیچی جاتی تھیں۔ حضرت عمر نے اس رواج کو بالکل روک دیا۔ آنحضرت صلعم نے تبوک کے سفر میں غیر مذہب والوں پر جو جزیہ مقرر کیا وہ فی کس ایک دینار تھا۔ حضرت عمرؓ نے ایران میں ۴۸، ۱۲، ۶ کے حساب سے شرحیں مقرر کیں، آنحضرت (صلعم) مال غنیمت جب تقسیم کرتے تھے تو اپنے عزیز و اقارب کا حصہ لگاتے تھے خلفائے راشدین میں سے کسی نے حتیٰ کہ حضرت علیؓ نے بھی ہاشمیوں کو کبھی حصہ نہیں دیا۔ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں بلکہ حضرت ابوبکر صدیق[1] کے عہد تک تین طلاقیں بائن سمجھی جاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں منادی کرادی کہ تین طلاقیں بائن سمجھی جائیں گی۔ آنحضرت (صلعم) کے عہد میں شراب پینے کی سزا میں کوئی خاص حد نہیں مقرر ہوئی تھی، حضرت ابوبکرؓ نے اس کی حد ۴۰ درے قرار دیے۔ اور حضرت عمرؓ نے بسبب اس کے کہ ان کے زمانے میں مے نوشی کا زیادہ رواج ہو چلا تھا ۴۰ سے ۸۰ درے کر دیے۔

یہ وہ واقعات ہیں جو حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں اور جن کے ثبوت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ خلفائے راشدین کسی حکم کو آنحضرت (صلعم) کا تشریعی حکم سمجھ کر اس کی مخالفت کرتے تھے! اگر نعوذ باللہ ایسا کرتے تھے تو وہ خلفائے راشدین نہ تھے بلکہ عیاذاً باللہ رسول اللہ (صلعم) کے حریف اور مقابل تھے!! حقیقت یہ ہے کہ صحابہ رات دن آنحضرت (صلعم) کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور فیض صحبت کی وجہ سے شریعت کے اداشناس ہوگئے تھے ان کو یہ تمیز کرنا نہایت آسان کام تھا کہ کون سے احکام تشریعی حیثیت رکھتے

---

[1] واضح رہے کہ لفظ طلاق تین مرتبہ کہہ کر تاکید مراد لیتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں اسے تاسیس پر محمول کر دیا گیا

ہیں اور کون سے اس حد میں داخل ہیں جن کی نسبت آنحضرت (صلعم) نے فرمایا تھا **انتم اعلم بامور دینا کم** ۔حضرت عائشہؓ نے آنحضرت (صلعم) کی وفات کے بعد ایک موقع پر کہا کہ ''آج اگر رسول اللہ موجود ہوتے تو عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت نہ دیتے یہ صریح اس بات کی شہادت ہے کہ حضرت عائشہ نے رسول اللہ (صلعم) کی اس اجازت کو تشریع اور لازمی نہیں قرار دیا۔ورنہ زمانہ اور حالات کے اختلاف سے اس پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔

ابو حنیفہ نے اس مرحلے پر صحابہ ہی کو دلیل راہ بنایا اور اس قسم کے مسائل میں ان کی رائے عموماً خلفائے راشدین کے طرز عمل کے موافق ہے لیکن جن لوگوں کی نگاہ اس نکتہ تک نہیں پہنچی وہ امام ابو حنیفہ بلکہ صحابہ کو بھی مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔طلاق کے مسئلہ میں قاضی شوکانی نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کر کے لکھا ہے کہ آنحضرت (صلعم) کے مقابلہ میں بے چارے عمرؓ کی کیا حقیقت ہے؟ لیکن قاضی شوکانی یہ نہ سمجھے کہ حضرت عمرؓ قاضی صاحب سے زیادہ اس بات کو سمجھتے تھے کہ رسولؐ کے مقابلہ میں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

فقہ کی پہلی قسم کے متعلق امام ابو حنیفہ نے جو بڑا کام کیا وہ قواعد استنباط کا انضباط تھا۔ جس کی وجہ سے فقہ (جواب تک جزئیات مسائل کا نام تھا) ایک مستقل فن بن گیا امام ابو حنیفہ کی علمی تاریخ میں جو چیز سب سے زیادہ قابل قدر اور تعجب انگیز ہے وہ ان قواعد کی تجدید اور انضباط ہے، ایسے زمانہ میں جب کہ علوم نہایت ابتدائی حالت میں تھے یہاں تک کہ نقل و کتابت کا بھی رواج نہ تھا ایسے دقیق فن کی بنیاد ڈالنی درحقیقت امام ابو حنیفہؒ کا کام تھا۔

عام خیال یہ ہے کہ یہ قواعد جن کو اب اصول فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے سب سے پہلے امام شافعی نے مرتب کئے۔ یہ دعویٰ اس لحاظ سے تو صحیح ہے کہ امام شافعی سے پہلے یہ مسائل مستقل طور سے احاطہ تحریر میں نہیں آئے تھے لیکن اصل فن کی بنیاد پر امام شافعی سے بہت پہلے پڑ چکی تھی اور اگر تحریر کی قید اٹھا دی جائے تو امام ابو حنیفہ اس کے موجد کہے جا سکتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ مسائل کا استنباط اور احکام کی تفریع تابعین بلکہ صحابہ ہی کے زمانے میں شروع ہو چکی تھی، لیکن استنباط اور استخراج کا جو طریقہ تھا وہ کوئی علمی صورت نہیں رکھتا تھا۔ جس طرح عام لوگ کسی عبارت سے کسی نتیجہ کا استنباط یا کسی اور حکم تفریع صرف وجدانی مذاق کی رو سے کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کا استنباط یا تفریع کس قاعدہ کلیہ کے تحت میں داخل ہے اور اس

کے کیا شرائط اور قیود ہیں۔ اسی طرح فقہی مسائل بھی استنباط کیے جاتے تھے نہ علمی اصطلاحیں پیدا ہوئیں، چنانچہ واصل بن عطا نے جو علم کلام کا موجد تھا، احکام شرعیہ کی تقسیم کی اور کہا کہ حق کے ثبوت کے چار طریقے ہیں، قرآن ناطق، حدیث متفق علیہ، اجماع امت، عقل وحجت (یعنی قیاس) واصل نے اور بھی چند مسائل اور اصطلاحیں قائم کیں، مثلاً یہ کہ عموم وخصوص دو جداگانہ مفہوم ہیں۔ نسخ صرف اوامر ونواہی میں ہو سکتے ہیں، اخبار وواقعات میں نسخ کا احتمال نہیں [1]۔

ان مسائل کے لحاظ سے اصول فقہ میں اولیت کا فخر واصل کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے لیکن یہ اسی قسم کی اولیت ہوگی جس طرح نحو کے دو تین قاعدوں کے بیان کرنے سے کہا جاتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فن نحو کے موجد ہیں۔ بہر حال امام ابوحنیفہ کے زمانہ تک جو کچھ ہوا اس سے زیادہ نہیں ہوا تھا لیکن چونکہ امام صاحب نے فقہ کو مجتہدانہ اور مستقل فن کی حیثیت سے ترتیب دینا چاہیے اس لیے استنباط اور استخراج مسائل کے اصول قرار دینے پڑے۔

اگرچہ زمانہ مابعد میں اصول فقہ ایک نہایت وسیع فن فن گیا، اور سینکڑوں مسائل ایسے ایجاد ہو گئے جن کا امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں اثر بھی نہ تھا، لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اس فن کے اہم مسائل جن پر فن کی بنیاد قائم ہے امام صاحب ہی کے زمانہ میں منضبط ہو چکے تھے، اصول اربعہ کی توضیح، حدیث کے مراتب اور ان کے احکام، جرح وتعدیل کے اصول اجماع کے حدود وضوابط، قیاس کے احکام وشرائط، احکام کی انواع عموم وخصوص کی تجدید رفع تعارض کے قواعد، فہم مراد کے طرق، یہ مسائل ہیں جو اصول فقہ کے ارکان ہیں، ان تمام مسائل کے متعلق امام صاحب نے ضروری اصول وقواعد منضبط کر دیے تھے۔

حدیث کے متعلق امام صاحب نے جو اصول قرار دیے ان کو ہم حدیث کی بحث میں لکھ آئے ہیں ان کے علاوہ اور ابواب کے متعلق امام صاحب نے تمام ضروری اصول منضبط کر دیے تھے۔ مثلاً **مالم یثبت بالتواتر لیس بقران الزیادة نسخ ،لایجوز الزیادة علی الکتاب بخبر انواحد، حمل المطلق علی المقیدز یادة علی النص عموم القران لا یتخصص بالأ حاد، العام قطعی کالخامس ، الخاص ان کان متاخر اخصص العام و ان کان متقدما فلابل کان العام نا سخا للخاص وان کان جهل التاریخ**

---

[1] ان مسائل کو ابو ہلال عسکری نے کتاب الاوائل میں واصل بن عطا کی طرف منسوب کیا ہے

تساقطا، ویطلب دلیل اخر مفھوم الصفة لا یحتج بهٖ النھی لا تدل علی البطلان

امام صاحب کے یہ اقوال ان شاگردوں کی تصنیفات یا اصول کی کتابوں میں جو شافعیہ یا حنیفہ وغیرہ نے لکھے ہیں، جستہ جستہ مذکور ہیں جن کو اگر ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو ایک مختصر رسالہ تیار ہو سکتا ہے [1]۔ یہی اصول ہیں جن کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ ایک خاص طریقہ اجتہاد کے بانی ہیں۔ انہی اصول کے اتحاد کی بناء پر امام محمد و قاضی ابو یوسف کا طریقہ امام صاحب کے طریقہ سے الگ نہیں سمجھا جا سکتا حالانکہ جزئیات مسائل میں ان لوگوں نے سینکڑوں ہزاروں جگہ ان سے اختلاف کیا ہے۔

ان اصولی مسائل پر بوجہ اس کے کہ امام شافعی وغیرہ نے ان سے مخالفت کی ہے نہایت وسیع اور دقیق بحثیں قائم ہو گئی ہیں، افسوس ہے کہ ہماری مختصر تالیف میں ان کی گنجائش نہیں، اصول کی کتابوں میں یہ مباحث نہایت تفصیل سے مذکور ہیں۔ جس شخص کا جی چاہے ان کتابوں کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، فقہ کے اس حصہ میں امام صاحب کی حیثیت ایک مفسر اور مستنبط کی حیثیت ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اس بات میں امام صاحب نے جو کام کیا وہ نہ صرف تاریخ اسلام میں بلکہ کل دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے دنیا میں اور بھی قومیں ہیں جن کے پاس آسمانی کتابیں ہیں اور وہ لوگ ان کتابوں سے اخذ احکام کرتے ہیں لیکن کوئی قوم یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس نے استنباط مسائل کے اصول اور قواعد منضبط کئے اور اس کو ایک مستقل فن کے درجہ تک پہنچا دیا۔

[1] لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اصول فقہ کی کتابوں میں جو بہت سے اصول مذکور ہیں ان سب کی نسبت یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ امام ابوحنیفہ کے اقوال ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس پر ایک نہایت عمدہ تقریر لکھی ہے لیکن شاہ صاحب نے بعض ان اقوال سے بھی انکار کیا ہے جو بروایت صحیحہ امام صاحب سے ثابت ہیں۔

فقہ کا دوسرا حصہ

فقہ کا دوسرا حصہ جو صرف قانون کی حیثیت رکھتا ہے پہلے حصہ کی نسبت بہت زیادہ وسیع ہے اور یہ وہ خاص حصہ ہے جس میں امام ابوحنیفہؒ علانیہ تمام مجتہدین سے ممتاز ہیں بلکہ سچ ہے کہ اگر اسلام میں کوئی شخص واضع قانون گزرا ہے تو وہ صرف امام ابوحنیفہ ہیں۔

مسلمانوں میں توضیع قانون کا کام ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا جو مذہبی پیشوا تھے اور زہد و اتقاء میں نہایت غلو کرتے تھے، مذہبی لوگوں میں جو اوصاف نہایت قابل قدر سمجھے جاتے ہیں وہ یہ ہیں۔ دنیاوی امور سے علیحدگی، کم آمیزی، معاملات میں سختی، عام واقعات سے بے خبری، غیر مذہب والوں سے تنفر۔ یہ تمام اوصاف وہ ہیں جو تمدن کے مخالف ہیں اور جس شخص میں یہ اوصاف اعتدال سے بڑھ کر اور فطری ہوں وہ مشکل سے تمدن کی ضروریات کا اندازہ داں ہوسکتا ہے، تقدس و پاکیزہ نفسی کے لحاظ سے ان لوگوں کی جس قدر عظمت کی جائے کم ہے لیکن دنیا اور دنیا والوں کا کام ان سے نہیں چل سکتا۔ حضرت جنید بغدادی معروف کرخی، شیخ شبلی، داؤد طائی کی عظمت و شان سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ واضع قانون نہیں ہوسکتے تھے۔

مجتہدین جنہوں نے فقہ کے نام سے ملکی اور شخصی قانون بنائے اگرچہ رہبانیت کی حد سے دور تھے تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ تمدن کے ان تمام وسیع تعلقات پر ان کی نگاہ پڑسکتی ہے جن سے ان کو عمر بھر کبھی سروکار نہیں رہا، یہی وجہ ہے کہ ان کی قوانین میں بعض جگہ ایسی سختی و تنگی پائی جاتی ہے جس پر مشکل سے عملدرآمد ہوسکتا ہے۔'' امام شافعی وغیرہ کا مذہب ہے کہ نکاح میں بجز ثقاۃ کے کوئی شخص گواہ نہیں سکتا۔ ہمسایہ کو حق شفعہ نہیں پہنچتا، بیع بالمعاطاۃ جائز نہیں۔ ذمیوں کی شہادت کسی حال میں مقبول نہیں۔ ایک مسلمان سینکڑوں ذمیوں کو بے قصور قتل کر ڈالے تاہم وہ قصاص میں پکڑا نہیں جاسکتا ان مسائل میں دنیا کا نظام کیوں کر چل سکتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اس وصف میں اپنے ہمعصروں سے ممتاز تھے کہ وہ مذہبی تقدس کے ساتھ دنیاوی اغراض کے اندازہ شناس تھے اور تمدن کی ضرورتوں کو اچھی سرح سمجھتے تھے مرجعیت اور فصل قضایا کی وجہ سے ہزاروں پیچیدہ معاملات ان کی نگاہ سے گزر چکے تھے، ان کی مجلس افتا بہت بڑی عدالت عالیہ تھی جس نے لاکھوں مقدمات کا فیصلہ کیا تھا، وہ ملکی حیثیت رکھتی تھی اور ارکان سلطنت

مہمات امور میں ان سے مشورہ لیتے تھے، ان کے شاگرد اور ہمنشین جن کی تعداد سینکڑوں سے زیادہ تھی عموماً وہ لوگ تھے جو منصب قضا پر مامور تھے، ان باتوں کے ساتھ ان کی طبیعت مقننانہ اور معاملہ سنج واقع ہوئی تھی وہ ہر بات کو قانونی حیثیت سے دیکھتے تھے اور اس کے دقیق نکتوں تک پہنچتے تھے۔ اس بات کا اندازہ واقعہ ذیل سے ہو سکتا ہے، جس کا ذکر اکثر مؤرخین نے کیا ہے۔

ایک دن امام صاحب قاضی ابن ابی لیلیٰ سے ملنے گئے۔ اس وقت ان کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا، مدعی کا بیان تھا کہ فلاں شخص نے میری ماں کو زانیہ کیا ہے، اس لئے میں ازالہ حیثیت کا دعویدار ہوں، قاضی صاحب نے مدعا علیہ کی طرف جو اس موقع پر موجود تھا خطاب کیا کہ تم کیا جواب دیتے ہو، امام ابو حنیفہ نے قاضی صاحب سے کہا کہ ابھی مقدمہ قائم نہیں ہوا، مدعی کا بیان لینا چاہیے کہ اس کی ماں زندہ ہے یا نہیں کیونکہ اس کو بھی شریک مقدمہ ہونا چاہیے یا اگر اس نے اس کی معرفت مقدمہ دائر کیا ہے تو اس کو مختار نامہ پیش کرنا چاہیے قاضی صاحب نے مدعی کا بیان لیا، معلوم ہوا کہ اس کی ماں مرچکی ہے اس پر قاضی صاحب سے کہا کہ مدعی سے پوچھنا چاہیے کہ اس کے بہن بھائی ہیں یا نہیں، کیونکہ وہ اگر دعویدار موجود ہیں تو ان کو بھی شریک مقدمہ ہونا چاہیے۔ اسی طرح امام صاحب نے اور چند سوالات کیے، جب وہ مراتب طے ہو چکے تو فرمایا کہ "اب مقدمہ قائم ہوا اور اب مدعا علیہ کا بیان لیجئے۔"

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے جس طریقہ سے مقدمہ کی کاروائی شروع کی تھی وہ اس حیثیت سے بڑھ کر نہ تھا جس طرح عوام آپس میں فصل خصوصیات کیا کرتے ہیں لیکن امام صاحب باقائدہ فیصلہ چاہتے تھے، جس کا ضروری اصول یہ ہے کہ ایک حق سے جتنے لوگ دعویدار ہو سکتے ہیں ان سب کو مقدمہ میں شریک ہونا چاہیے تاکہ عدالت کو ایک ہی حق کے فیصلہ کرنے میں بار بار زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

امام صاحب نے مقدمہ کے اس دوسرے حصہ کی جس طرح تدوین کی اور جس ضبط و ربط سے اس کی جزئیات کا استقصاء کیا وہ اس زمانہ کا نہایت وسیع قانون تھا اگرچہ اسکی تعبیر ایک عام لفظ (فقہ) سے کی جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت اس میں بہت سے قوانین شامل تھے، چنانچہ آج تعلیم یافتہ دنیا میں انہی ابواب کے مسائل جو ترتیب دیئے گئے ہیں وہ جدا جدا قانون کے نام سے موسوم ہیں۔ مثلاً قانون معاہدہ، قانون بیع، قانون لگان و مال گزاری، تعزیرات، ضابطہ،

فوجداری وغیرہ وغیرہ۔

اسی بنا پر بعض یورپین مصنفوں کا خیال ہے [1] ہے کہ امام ابوحنیفہ نے فقہ کی تدوین میں رومن لاء یعنی رومیوں کے قانون سے بہت کچھ مدد لی اور اس کے بہت سے مسائل اپنی فقہ میں داخل کر لئے، اس خیال کی تائید میں یہ قرائن پیش کئے جاتے ہیں۔

ا:۔ حنفی کے بہت سے مسائل رومن لا کے مطابق ہیں۔

---

[1] ہم نے اس خیال کو شہرت عام کی بنا پر لکھا تھا، لیکن تالیف کتاب کے بعد ہم کو معلوم ہوا کہ مسٹر شیلڈن ایموز (AHDON AMOS) نے جو آج لندن یونیورسٹی کے لاء پروفیسر ہیں۔ اپنی کتاب رومن ول لا (ROMANCIVIL LAW) صفحہ ۴۰۶ تا ۴۱۵) میں اس دعوے کو بڑے شد و مد سے ثابت کرنا چاہا ہے اور اس پر ایک مفصل بحث کی ہے۔ یورپ کی جو برتری آج کل تمام قوموں اور بالخصوص مسلمانوں پر حاصل ہے اس نے یورپین مصنفوں کے دل میں بالطبع یہ بات پیدا کر دی ہے کہ وہ مسلمانوں کے تمام گذشتہ کارناموں کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھیں اور اگر کوئی کمال ایسا بدیہی اور نمایاں ہو جس سے کسی سے انکار نہ ہو سکے تو یہ دعویٰ کریں کہ وہ مسلمانوں کی ایجاد نہیں ہے بلکہ روم و یونان و مصر وغیرہ سے ماخوذ ہیں، یہی اثر ہے جس نے مسٹر شیلڈون ایموز کو اس بحث پر مجبور کیا کہ انہوں نے اپنے دعوے کو فقہ حنفی تک محدود نہیں رکھا بلکہ عام قانون اسلام کی نسبت ان کا دعویٰ ہے ہم ان کے مضمون کو قریباً ان کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے دعویٰ میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں وہ اپنے مضمون کو اس تمہید سے شروع کرتے ہیں۔

''مشرق میں دفعۃً بالکل جدید وطبع زاد قائم بالذات سلسلہ قانون کا پیدا ہو جانا جسکی نسبت دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ قرآن و حدیث پر مبنی ہے، ایک ایسی عجیب بات ہے کہ خواہ مخواہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی کی نسبت جو دعویٰ کیا جاتا ہے اس کی تاریخی بنیاد کیا ہے علاوہ دوسری شہادتوں کے مؤرخانہ قیاس اس دعوے کے سخت مخالف ہے۔

اس کے بعد پروفیسر موصوف اس کلیہ پر بحث کر کے ہمیشہ سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ ہر سلسلہ قانون کو کسی واقعی یا فرضی واضع قانون کے نام سے موسوم کر دیا کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ،

اس لحاظ سے ابتدا ہی میں ایک قوی قیاس پیدا ہوتا ہے کہ جو باترتیب اور مضبوط سلسلہ قانون مسلمان فاتحوں نے تمام ممالک مفتوح میں جاری کیا وہ بہ تبدیل ہیئت کوئی اعلیٰ درجہ کا مکمل رواج یافتہ سلسلہ قانون تھا۔ پروفیسر موصوف نے تاریخی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ جس وقت مسلمانوں نے شام و مصر کو فتح کیا

۱۲:۔رومن لاءتمام ممالک شام میں جاری تھا اور چونکہ مسلمانوں پر شام کی معاشرت وتمدن کا بہت کچھ اثر پڑا تھا، اس لیے قیاس غالب یہ ہے کہ علمائے اسلام نے قانونی مسائل میں بھی ان سے استفادہ کیا۔

بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے آگے)تو وہاں رومی قوانین کے متعدد مدرسے موجود تھے۔ بیروت میں الگزنڈرسیورس کے زمانے سے ایک مدرسہ قانون چلا آتا تھا جس میں چار پروفیسر تھے، قیصریہ میں وکلاء کی ایک جماعت رہتی تھی۔اسکندریہ میں قانون کی تعلیم جاری تھی۔ان واقعات کی تفصیل کے بعد پروفیسر موصوف فرماتے ہیں کہ۔

اس قیاس کی نسبت کہ اسلام قوانین پر رومی قوانین کا اثر پڑا ہے۔اس قدر کہنا کافی ہوگا لیکن جس طریقہ سے کہ اسلام فتوحات ہوئیں اور جس طرح پر مسلمان ممالک مفتوحہ میں آباد ہوئے اگر ان امور پر غور کیا جائے تو یہ قیاس یقین سے بدل جاتا ہے"۔

اسلامی فتوحات کے طریقہ سے پروفیسر موصوف نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ شروع میں مسلمانوں نے غیر قوموں سے بجز جزیہ وصول کرنے کے اور کسی قسم کا اثر ڈالنا نہیں چاہا لیکن جب علمی ترقی کا زمانہ آیا تو انہوں نے غیر قوموں کے لیے قانون واضع کیے جو خود انہی قوموں سے ماخوذ تھے۔

پروفیسر موصوف کے الفاظ یہ ہیں "نہ تو قرآن اور نہ ابتدائی خلافت کے زمانہ میں اس بات کی کچھ کوشش ہوئی کہ جو اعلیٰ قومیں عرب کے ماتحت ہوگئی تھیں ان ر نیوی زندگی کے پیچیدہ معاملات میں دست اندازی کی جائے نہ اس کے لیے فرصت تھی نہ دماغ اور نہ ایسے آدمی تھے جو اس خدمت کو انجام دے سکتے، جب بغداد اور اندلس کے شہروں اور قاہرہ میں امن وامان کا زمانہ آیا اور مطالعہ وغور کا موقع ملا تو طب وریافیات ومنطق اور علوم نفسیہ میں ترقی ہوئی جس طرح کہ ارسطو سے عربوں نے منطق سیکھی اسی طرح بیسل (BASIL) لیو (LEO) اور ان کے یونانی شارحوں سے علم قانون اخذ کیا۔ اسکے بعد پروفیسر صاحب موصوف اس خیال کی قطعیت پر یہ دلیل قائم کرتے ہیں کہ قرآن میں اس قدر کم احکام ہیں کہ ان پر ایک قانون کی بنیاد نہیں قائم ہوسکتی۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں۔

"قرآن میں صرف یہ احکام ہیں۔خدا کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔تم اپنی بیبیوں کو دو دفعہ طلاق دے سکتے ہو، پھر ان کو رحم دلی یا مہربانی سے علیحدہ کردو۔سوخوار قیامت میں آسیب زدوں کی طرح اٹھیں گے، میعادی قرض کو قلم بند کرلیا کرو۔اگر بیبیوں کے ساتھ انصاف کرسکو کئی نکاح کرسکتے ہو لیکن چار سے زیادہ نہیں۔مرد کو دو حصہ ملے گا اور عورتوں کو ایک لیکن صرف عورتیں ہوں تو دو۔شوہر کو نصف حصہ ملے گا۔مرض الموت

۳:۔اس قدر متعدد اور وسیع قوانین جو فقہ میں شامل ہیں ان کی توضیع بغیر اس کے نہیں ہوسکتی کہ دنیا کے اور قوانین سے مدلی گئی ہے۔

(بقیہ حاشیہ) میں وصیت کے وقت گواہوں کا ہونا ضرور ہے سال بارہ مہینے کا ہوتا ہے مکاتب کو آزادی کا معاہدہ لکھ دو اگر تمھاری مرضی ہو سزائے زنا وغیبت۔

پروفیسر صاحب کے نزدیک قرآن میں صرف اسی قدر قانونی احکام مذکور ہیں اور اس لے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید ایک وسیع قانون کی بنیاد نہیں قرار پاسکتا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جو سید ھے قواعد اوپر درج ہوئے ان میں مشکل سے رومی بنیاد کا پتہ لگ سکتا ہے، اس لحاظ سے یہ امر اور بھی حیرت انگیز ہے کہ جو عمارت مسلمان فقیہوں نے ایسے پرانے مصالحہ سے تیار کی وہ قریب قریب ہر ایک موڑ پر رومی قانون کے کلیوں اور جزئیوں کو یاد دلاتی ہے۔

س کے بعد پروفیسر صاحب نے دعوی کیا ہے کہ مسائل مندرجہ ذیل [1] میں فقہ اسلام اور رومی قانون بالکل یکساں ہے اور بالآخر اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ سلسلۂ قانون یعنی علم فقہ دراصل رومی قانون ہے لیکن یہ تبدیل ہیئت۔

پروفیسر نے تو صفحوں میں یہ بحث لکھی ہے ہم نے اس کا خلاصہ لکھ دیا ہے لیکن کوئی ضروری بات ترک نہیں کی بلکہ اکثر ان کے خاص فقرے لکھ دیے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے جن مقدمات کی ترتیب سے استدلال کیا ہے وہ مختصراً یوں بیان کئے جاسکتے ہیں۔"

"قرآن مجید میں بہت کم احکام ہیں اور ان سے قانون نہیں بن سکتا۔" "ممالک مفتوحہ اسلام میں رومی قانون پہلے سے جاری تھا۔ مسلمانوں نے یونان وروم وغیرہ کی تصنیفات کے ترجمے کئے۔ فلاں فلاں مسائل میں اسلامی فقہ اور رومی قانون متحد ہیں یہ بحث حقیقت میں نہایت مفید ہے اور امپارٹنٹ بحث ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اصل کتاب میں بیان کیا ہے اس معرکہ میں اس شخص کو قدم رکھنا چاہیے جو فقہ اسلام اور رومن لاء دونوں سے پوری واقفیت رکھتا ہو۔ پروفیسر موصوف بے شبہ رومن لاء کی نسبت ہر قسم کی واقفیت کا دعویٰ کرسکتے ہیں۔ لیکن مسائل اسلام کے متعلق انکی وسعت معلومات کا اعتراض کرنا مشکل ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ قرآن مجید میں قانونی احکام معدودے چند ہیں جن کی انہوں نے تفصیل کردی ہے۔ حالانکہ قرآن مجید کی آیات

[1] ہم نے طوالت کے خوف سے ان مسائل کو یہاں نقل نہیں کیا لیکن آگے چل کر ان میں بہت سے مسائل کا ذکر آ

اس بحث کا اصلی تصفیہ تو جب ہو سکتا ہے کہ رومن لا اور حنفی فقہ کا نہایت دقت نظر اور استقصاء کے ساتھ مقابلہ کیا جائے جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ جس قدر دونوں قانونوں میں تطابق ہے وہ توارد کی حد سے متجاوز ہے یا اسی قدر ہے جتنا کہ عموماً تمام قوموں کے قوانین بہت

(بقیہ حاشیہ) احکام کم وبیش پانچ سو ہیں اور اگر چہ ان میں سے بہت سے احکام عبادات وغیرہ کے متعلق ہیں تاہم خاص وہ آیتیں جن میں قانونی احکام ہیں سو سے کم نہیں۔ یہ آیتیں جداگانہ جمع کر لی گئی ہیں اور علماء نے ان پر متعدد تفسیریں لکھی ہیں ان تمام احکام سے واقف ہونا تو ایک طرف پروفیسر صاحب کی وسعت معلومات کا یہ حال ہے کہ نکاح وطلاق کے مسائل میں سے ان کو صرف دو مسئلے معلوم ہیں تعداد طلاق وتعداد نکاح، حالانکہ قرآن مجید میں محرمات نکاح، موطوہ اب، جمع بین الاختین نکاح یا مشرکات طلاق قبل خلوت اور دونوں کے احکام، خلع اور ایلا کے مسائل تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

وراثت کے متعلق پروفیسر صاحب کو صرف شوہر کا حصہ اور یہ کہ مرد کو عورت کے دو حصے کے برابر ملتا ہے۔ معلوم ہے، افسوس ان کو یہ معلوم نہیں کہ وراثت کا پورا باب اجمالاً قرآن مجید میں مذکور ہے اور خصوصاً والدین کا حصہ اور کلالہ کے احکام تو صاف صاف تصریحاً مذکور ہیں، قصاص اور دیت کے مسائل جو نہایت تفصیل سے قرآن مجید میں مذکور ہے جن میں قتل عمد اور قتل خطا اور ان کے احکام کی پوری تفصیل ہے، پروفیسر صاحب کو سرے سے معلوم نہیں۔ حیرت ہے کہ اس محدود واقفیت کے ساتھ پروفیسر صاحب نے اس بحث کے طے کرنے کی کیوں کر جرأت کی۔

یہ تو ضمنی بحث تھی، اب ہم ان مقدمات پر توجہ کرتے ہیں جن پر پروفیسر صاحب کے استدلال کی بنا ہے اس قدر انہوں نے خود تسلیم کر لیا ہے اور واقعہ میں بھی صحیح ہے کہ شروع اسلام یعنی خلافت راشدہ کے اخیر زمانے تک مسلمان غیر قوموں سے بالکل الگ رہے اور ان کے قانون اور احکام سے کسی قسم کی واقفیت نہیں حاصل کی اس لیے دمشق وبیروت واسکندریہ میں اس وقت رومن لاء کے جو مدرسے جاری تھے خود بقول پروفیسر صاحب کے اسلامی فقہ پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑ سکتا تھا اب قابل لحاظ یہ امر ہے کہ پروفیسر صاحب نے اسلام کے جو مسائل اس دعوے کے ساتھ پیش کیے ہیں کہ وہ رومن لاء کے موافق ہیں وہ کس زمانے کے ایجاد شدہ مسائل ہیں۔ مثلاً وراثت کے متعلق پروفیسر صاحب نے لکھا ہے کہ مسائل ذیل یعنی اولاد وسلسلہ اصولی، رشتہ داران طرفی آدھا خون ملا ہو یا کل اور ان کی اولاد، بی بی یا خاوند مولا یا غلام آزاد یہ سب رومن لاء کے موافق ہیں اس کے بعد وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں ترکہ اس طرح تقسیم کیا جاتا تھا جو رومن لاء کا طریقہ تھا یعنی کل حصے یہ تھے،

سی باتوں میں موافق ہوا کرتے ہیں، میں اول تو رومن لاء سے واقف نہیں اور ہوتا بھی تو اتنی فرصت کہاں نصیب کہ تمام مسائل کا مقابلہ کرسکتا۔ اس لیے مجھ کو اعتراف کرنا چاہیے کہ اس موقع

(بقیہ حاشیہ) نصف، ربع، ثمن، دوثلث، ایک ثلث، سدس، یہی حصے رومن لاء میں بھی تھے لیکن پروفیسر صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ یہ حصص خود قرآن مجید میں مذکور ہیں اور قرآن مجید کی نسبت پروفیسر صاحب نے خود تسلیم کیا ہے کہ اس میں رومی بنیاد کا پتہ نہیں لگتا البتہ ورثہ کے بعض افراد قرآن مجید میں مذکور نہیں لیکن وہ زمانہ رسالت و خلافت تک پوری طرح سے معین ومقرر ہو چکے تھے، حدیث وآثار کی نہایت قدیم کتابیں آج موجود ہیں ان کو پڑھ کر متعصب سے متعصب شخص بھی اس سے انکار نہیں کرسکتا۔

وصیت کے متعلق پروفیسر صاحب نے فقہ کے جن مسائل کو رومن لاء سے ماخوذ سمجھا ہے ان کی یہ تفصیل کی ہے، وصیت تقریری یا تحریری دو گواہوں کے سا۔ دص ایک ثلث جائداد کے زیادہ کی وصیت نہیں کر سکتا جب تک کہ ورثاء راضی ہوں لیکن یہ مسائل بھی زمانہ نبوت یا خلافت کے مسائل ہیں اور اس امر سے ایک عام عربی داں بھی انکار نہیں کرسکتا، پروفیسر صاحب نے اور بھی مسائل گنائے ہیں جو ان کی رائے میں رومن لاء سے ماخوذ ہیں ہم ان سب کو تفصیل نہیں کر سکتے۔ مختصر اس قدر کہنا کافی ہے کہ ان میں اکثر مسائل اسی زمانہ کے ہیں جن کی نسبت پروفیسر صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کے قوانین واحکام سے کچھ واقفیت نہیں حاصل کی تھی۔ پروفیسر صاحب کو اس بات پر بڑی حیرت ہے کہ قرآن مجید یا حدیث میں قانونی مسائل بہت کم تھے ان کی بنیاد پر فقہ کا اتنا بڑا دفتر کہاں سے تیار ہو گیا یا سی حیرت نے ان کو مجبور کیا کہ وہ فقہ اسلام کو رومن لا کا خوشہ چین بتائیں۔ لیکن پروفیسر صاحب کس کس بات پر حیرت کریں گے۔ قانونی مسائل تو خیر رومن لاء سے ماخوذ ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوۃ کے متعلق قرآن مجید و احادیث میں کون سی بڑی تفصیل ہے پھر فقہ میں انہی مسائل کا ایک عظیم الشان سلسلہ کیوں کر قائم ہو گیا؟ کیا یہ مسائل بھی رومن لاء سے ماخوذ ہیں۔ اس کو بھی جانے دو۔ تمام اور اسلامی علوم کیونکر پیدا ہو گئے اور اس وسعت کو کیوں کر پہنچے۔ آں حضرت (صلعم) کے زمانہ میں تفسیر، حد ، اصول فقہ، اسماء الرجال کے کتنے مسائل پیدا ہوئے تھے اور آج ان کی کیا حالت ہے کیا آج یہ علوم جداگانہ فن نہیں ہے کہ ان سے مسلمانوں کی وقت نظر، تیزی طبع، وسعت خیال کا اندازہ نہیں ہوتا۔ کیا یہ علوم وفن بھی مسلمانوں نے روم و یونان سے سیکھے۔ فقہ کے جن مسائل کو پرفیسر صاحب نے رومن لاء سے ماخوذ بتایا ہے وہ تو اسی زمانے کے مسائل ہیں۔ جب خود بقول پروفیسر صاحب کے مسلمانوں نے غیر قوموں سے کچھ نہیں سیکھا تھا، لیکن زمانہ مابعد میں بھی فقہ نے رومن لاء کا کبھی احسان نہیں اٹھایا۔ پروفیسر صاحب کا یہ دعویٰ

پر جو کچھ میں لکھوں گا اس کا رتبہ قیاس اور ظن سے زیادہ نہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جن لوگوں نے اس بحث کو چھیڑا ہے وہ بھی قیاس اور ظن ہی سے کام لیتے ہیں کیونکہ باوجود تحقیق کے ہم کو کوئی ایسا منصب نہیں ملا۔ جس کا یہ دعویٰ ہو کر وہ رومن لا اور حنفی فقہ کے تمام یا اکثر مسائل کا مقابلہ کر چکا ہے۔

اس امر سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ فقہ حنفی میں ایسے مسائل موجود ہیں جو عرب اور عراق میں سلام سے پہلے معمول بہ تھے لیکن اس میں فقہ حنفی کی خصوصیت نہیں، یہ سلسلہ اور آگے چلتا ہے۔ جو مسائل آج خاص اسلام کے خیال کیے جاتے ہیں۔ اور خود قرآن مجید میں ان کا ذکر ہے ان میں متعدد ایسے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں معمول و متداول تھے۔ علامہ ابو ہلال عسکری نے کتاب الاوائل میں ان کی تفصیل بھی کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے خراج و ٹیکس کے متعلق جو قاعدے

(بقیہ حاشیہ) صحیح ہے کہ دولت عباسیہ کے عہد ترقی میں مسلمانوں نے یونان و مصر سے علوم وفنون لئے لیکن ان کو جاننا چاہیے کہ یونان و مصر کے شاگردوں کا گروہ ایک خاص گروہ تھا۔ بے شبہ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو غیر قوموں سے مستفید ہوتے تھے اور ان کو عیب نہیں سمجھتے تھے لیکن مسلمانوں ہی میں وہ گروہ بھی تھا (اور وہی بڑا گروہ تھا) جو اپنے فضل و کمال کے زعم میں غیر قوموں کی طرف کبھی رخ بھی نہیں کرتا تھا۔ مجتہدین اور فقہا اسی گروہ میں داخل ہیں یونان اور روم وغیرہ کی کتابیں جو عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں ان کی نہایت مفصل فہرست ہم کو معلوم ہے ان میں فلسفہ، طب، ہندسہ، نجوم، کیمیا، صنعت، تاریخ، لائف، ناول، کی ہر قسم کی کتابیں ہیں لیکن قانون کی ایک تصنیف بھی نہیں جس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ فقہاو محدثین جو اسلام میں واضع قانون تھے غیر قوموں کی خوشہ چینی کو اپنی اصطلاح میں حرام کہتے تھے۔ کیا امام ابوحنیفہ۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل سے یہ امید ہوسکتی ہے کہ وہ مسائل فقہ کو جو ان کے نزدیک مذہب کا ایک حصہ تھا روم و یونان سے سیکھتے۔ اگر پروفیسر صاحب کو ان ائمہ کے حالات معلوم ہوتے اور یہ بھی معلوم ہوتا کہ فقہ کے تمام ابواب ان ہی بزرگوں کے عہد میں مرتب ہو گئے تو ہرگز ایسا دعویٰ نہ کرتے۔

البتہ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ بعض مسائل میں رومن لاء و فقہ اسلام متحد کیوں ہیں لیکن اس میں فقہ اسلام کی تخصیص نہیں۔ اگر دو قانونوں کے گروہ کا جو کتنے ہی بے تعلق ہوں آپس میں مقابلہ کیا جائے تو بہت سے مسائل مشترک ثابت ہوں گے اور قدرتاً ایسا ہونا ضرور ہے۔ جب تمام دنیا کے آدمیوں کی ذاتی تمدنی ملکی ضرورتیں اکثر متحد اور یکساں ہیں تو ان ضرورتوں کے لحاظ سے ہر جگہ جو قوانین وضع کیے جائیں گے ان کے مسائل کا مشترک ہونا کون سے تعجب کی بات ہے۔

دورا ہر وکہ بیک رہ روند دریک سمت
عجب نبا شد اگر او فتند پے درپے

مقرر کئے وہ عموماً وہی ہیں جو نوشیرواں عادل نے اپنے زمانہ حکومت میں وضع کئے تھے اور یہ کچھ تو اردنہ تھا، بلکہ حضرت عمرؓ نے دانستہ نوشیروان کی اقتدا کی تھی، چنانچہ علامہ طبری وابن الاثیر نے صاف الفاظ میں تصریح کی ہے۔

ایک مقنن جب کسی ملک کے لیے قانو بناتا ہے تو ان تمام احکام اور رسم ورواج کو سامنے رکھ لیتا ہے جو اس ملک میں اس سے پہلے جاری تھے ان میں سے بعض کو وہ بعینہ اختیار کرتا ہے بعض میں ترمیم واصلاح کرتا ہے بعض کی بالکل مخالفت کرتا ہے، بے شبہ امام ابوحنیفہؒ نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا لیکن اس حقیقت سے وہ رومن لاء کی نسبت ایران کے قانون سے زیادہ مستفید ہوئے ہوں گے، کیونکہ اولاً تو وہ خود فارسی النسل تھے اور ان کی مادری زبان فارسی تھی۔ دوسرے ان کا وطن کوفہ تھا اور وہ فارس کے اعمال میں داخل تھے۔

غرضیہ امر بہر حال قابل تسلیم ہے کہ امام صاحب کو فقہ کی توضیح میں ان قواعد اور رسم رواج سے ضرور مدد ملی ہوگی جو ان ممالک میں جاری تھے لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی استعانت سے امام صاحب کے واضع قانون ہونے کی حیثیت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یعنی وہ ایک مستقل واضع قانون کہے جاسکتے ہیں یا صرف ناقل اور جامع، جہاں تک ہماری تحقیق ہے مسلمانوں نے غیر قوموں کی قانونی تصنیفات سے بہت کم واقفیت حاصل کی۔ ترجموں کی فہرست میں ہم سینکڑوں ہزاروں کتابوں کے نام پاتے ہیں لیکن فلسفہ وطب وغیرہ کی تصنیفات میں قانون کی ایک کتاب کا بھی پتہ نہیں چلتا جو عربی زبان میں ترجمہ کی گئی ہو۔ اور اس قدر تو قطعاً ثابت ہے کہ امام صاحب نے جس زمانہ میں فقہ کی تدوین کی کسی ایسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا تھا اسلئے یہ احتمال کہ امام ابوحنیفہؒ نے غیر قوموں کی قانونی تصنیفات سے فائدہ اٹھایا ہو بالکل بے اصل ہے ملک میں رسم و رواج کی بنیاد پر جو احکام نافذ تھے اس قابل نہ تھے کہ احاطہ تحریر میں آکر قانون کا لقب حاصل کرسکتے۔''

مختصر یہ ہے کہ جس قدر تاریخی قرائن موجود ہیں ان سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امام صاحب کو درس یا فارس کی کوئی قانونی تصنیف ہاتھ آئی جس کے نمونے پر انہوں نے فقہ کی بنیاد رکھی اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ امام ابوحنیفہ سے پہلے فقہ کے مسائل جسقدر اور جس صورت میں مدون ہو چکے تھے وہ فن کی حیثیت نہیں رکھتے تھے ان باتوں کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ اگر فقہ کو ایک

قانون ماننا چاہیے تو ضرور ماننا پڑے گا کہ امام صاحب ہی اس کے مقنن اور واضع تھے، البتہ ان کو ملک کے رسم و رواج مسائل معمول بہا علماء کے فتاویٰ سے مدد ملی لیکن یہ اسی قسم کی مدد ہے جس سے دنیا کے اور واضعان قانون بھی بے نیاز نہ تھے اس لئے یہ امر امام صاحب کی مقننیت کے رتبہ کو گھٹا نہیں سکتا۔

ان عام مباحث کے بعد اب ہم ان خاصیتوں[1] کا ذکر کرتے ہیں جنکی وجہ سے حنفی فقہ کو اور فقہوں کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے۔

(۱) سب سے مقدم اور قابل قدر خصوصیت جو فقہ حنفی کو حاصل ہے وہ مسائل کا اسرار اور مصالح پر مبنی ہوتا ہے احکام شرعیہ کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو فرقے قائم ہو گئے ایک گروہ کی یہ رائے ہے کہ یہ احکام تعبدی احکام ہیں یعنی ان میں کوئی بھید اور مصلحت نہیں ہے مثلاً شراب خوری یا فسق و فجور صرف اسلئے ناپسندیدہ ہیں کہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے اور خیرات و زکوۃ صرف اسلئے مستحسن ہیں کہ شارع نے انکی تاکید کی ہے ورنہ فی نفسہٖ یہ افعال برے یا بھلے نہیں ہیں امام شافعی کا اسی طرف میلان پایا جاتا ہے اور شاید اسی کا اثر تھا کہ ابوالحسن اشعری نے جو شافعیوں میں علم کلام کے بانی ہیں علم کلام کی بنیاد اسی مسئلہ پر رکھی۔

دوسرے فرقہ کا یہ مذہب ہے کہ شریعت کے تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں البتہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن کی مصلحت عام لوگ نہیں سمجھ سکتے لیکن درحقیقت وہ مصلحت سے خالی نہیں یہ مسئلہ اگرچہ بوجہ اس کے کہ دونوں پہلو بڑے بڑے علماء نے اختیار کئے ہیں ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بن گیا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ اسقدر بحث و اختلاف کے قابل نہ تھا تمام مہمات مسائل کی مصلحت اور غایت خود کلام الٰہی میں مذکور ہے کفار کے مقابلہ میں قرآن کا طرز استدلال عموماً اسی اصول کیمطابق ہے نماز کی مصلحت خدا نے خود بتائی کہ **تنہیٰ عن الفحشاء والمُنکَرِ** روزے کی فرضیت کے ساتھ ارشاد فرمایا **لَعَلکم تَتَّقُونَ** جہاد کی نسبت فرمایا **حتی لا تکون فتنة** اسی طرح اور احکام کے متعلق قرآن و حدیث میں جا بجا تصریحیں اور ارشاد سے موجود ہیں کہ

---

[1] یاد رکھنا کہ جن خصوصیتوں کا ہم نے دعویٰ کیا ہے وہ بلحاظ اکثر مسائل کے ہیں ممکن ہے کہ بعض جزئیات کے لحاظ سے یہ خصوصیتیں امام صاحب کے مذہب میں نہ پائی جائیں اور دوسرے اماموں کے فقہ میں پائی جائیں لیکن ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ امام صاحب کے اکثر مسائل میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی ہیں اور امام شافعی کے اکثر مسائل میں نہیں پائی جاتیں

انکی غرض وغایت کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ کا یہی مذہب تھا اور یہ اصول انکے مسائل فقہ میں عموماً مرعی ہے اسی کا اثر ہے کہ حنفی فقہ جسقدر اصول عقلی کے مطابق ہے اور کوئی فقہ نہیں امام طحاوی نے جو محدث اور مجتہد دونوں تھے اس بحث میں ایک کتاب لکھی ہے جو شرح معانی الآثار کے نام سے مشہور ہے اور جسکا موضوع یہ ہے کہ مسائل فقہ کو نصوص وطریق نظر سے ثابت کیا جائے محدث موصوف نے فقہ کے ہر باب کو لیا ہے اور اگرچہ انصاف پرستی کے ساتھ بعض مسئلوں میں امام ابوحنیفہ سے مخالفت کی ہے لیکن اکثر مسائل کی نسبت مجتہدانہ طرز استدلال سے ثابت کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب احادیث اور طریق نظر دونوں کے موافق ہے۔'' امام محمد نے بھی کتاب الحجج میں اکثر مسائل میں عقلی وجوہ سے استدلال کیا ہے یہ دونوں کتابیں چھپ گئی ہیں اور ہر جگہ ملتی ہیں جسکو تفصیل مقصود ہو تو ان کتابوں کی طرف رجوع کرے۔

اس دعوے سے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب عقل کے موافق ہے شافعیہ وغیرہ کو بھی انکار نہیں اور وہ انکار کیوں کرتے ان کے نزدیک احکام شرعیہ خصوصاً عبادات جس قدر عقل سے بعید ہوں اسی قدر انکی خوبی ہے۔

امام رازی نے زکوۃ کی بحث میں لکھا[1] ہے کہ امام شافعی کا مذہب امام ابوحنیفہ سے زیادہ صحیح ہے جسکی دلیل یہ ہے کہ امام شافعی کا مذہب عقل وقیاس سے بعید ہے اور یہی اسکی صحت کی دلیل ہے کیونکہ زکوۃ کے مسائل زیادہ تر تعبدی احکام ہیں جن میں عقل ورائے کو دخل نہیں''۔

بخلاف اور ہمعصروں کے امام ابوحنیفہ کا اس اصول کی طرف مائل ہونا ایک خاص سبب سے تھا دوسرے ائمہ جنہوں نے فقہ کی تدوین وترتیب کی انکی علمی ابتداء فقہی مسائل سے ہوتی تھی بخلاف اس کے امام ابوحنیفہ کی تحصیل علم کلام سے شروع ہوئی جسکی ممارست نے انکی قوت فکر اور حدت نظر کو نہایت قوی کر دیا تھا معتزلہ وغیرہ جن سے ان کے معرکے رہتے تھے عقلی اصول کے پابند تھے اسلئے امام صاحب کو بھی ان کے مقابلہ میں انہی اصول سے کام لینا پڑتا تھا اور متنازعہ فیہ مسئلوں میں مصالح واسرار کی خصوصیتیں دکھانی پڑتی تھیں اس غور اور تدقیق مشق ومہارت سے ان کو ثابت ہوگیا کہ شریعت کا ہر مسئلہ اصول عقل کے مطابق ہے علم کلام کے بعد وہ فقہ کی طرف متوجہ

---

[1] مناقب الشافعی مصنفہ امام فخر الدین رازی

ہوئے تو ان مسائل میں بھی وہی جستجو رہی۔

حنفی فقہ کے مسائل کا دوسری فقہوں کے مسائل سے مقابلہ کیا جائے تو یہ تفاوت صاف نظر آتا ہے معاملات تو معاملات عبادات میں بھی جس پر ظاہر بینیوں کا خیال ہےکہ اک میں عقل کو دخل نہیں امام صاحب کے مسائل عموماً عقل کے موافق معلوم ہوتے ہیں۔

اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ شریعت میں کن مصلحتوں سے فرض کئے گئے ہیں اور ان مصالح کے لحاظ سے ان احکام کی بجا آوری کا کیا طریقہ ہونا چاہیے تو وہی طریقہ موزوں ثابت ہوگا جو حنفی فقہ سے ثابت ہوتا ہے مثلاً نماز چند افعال کے مجموعہ کا نام ہے لیکن اس لحاظ سے کہ نماز کی اصل غرض کیا ہے؟ (یعنی خضوع، اظہار تعبد، اقرار عظمت الٰہی، دعا، اور اس کے حاصل ہونے میں کن افعال کو کس نسبت سے دخل ہے ان افعال کے مراتب مختلف ہیں بعض لازمی اور ضروری ہیں کیونکہ ان کے نہ ہونے سے نماز کی اصل غرض فوت ہوتی ہے ان افعال کی شریعت کی زبان میں فرض۔ سے تعبیہ کیا جاتا ہے بعض افعال ایسے ہیں جو طریقہ ادا میں صرف ایک حسن وخوبی پیدا کرتے ہیں لیکن ان کے فوت ہونے سے اصل غرض فوت ہوتی ان افعال کا رتبہ قسم سے کم ہے اور ان کو سنت ومستحب سے تعبیر کرتے ہیں۔

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرض وواجب وسنت کی تصریح نہیں فرمائی اس میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا تھا کہ نماز کے تمام افعال یکساں درجہ نہیں رکھتے تھے اس لئے تمام مجتہدین نے ان کے امتیاز مراتب پر توجہ کی اور استنباط واجتہاد کی رو سے ان افعال کے مختلف مدارج قائم کئے اور ان کے جدا جدا نام رکھے امام ابوحنیفہ نے بھی ایسا ہی کیا لیکن اس باب میں ان کو ائمہ پر جو ترجیح ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے جن افعال کو جس رتبہ پر رکھا درحقیقت ان کا ہی رتبہ تھا مثلاً سب سے ضروری یہ ہے کہ نماز کے ارکان یعنی وہ افعال جن کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی کیا ہیں؟ چونکہ نماز اصل میں اقرار عبودیت اور اظہار خشوع کا نام ہے اس لئے اس قدر تو سب مجتہدوں کے نزدیک مسلم رہا کہ نیت، تکبیر قرأت، رکوع سجود وغیرہ جن سے بڑھ کر اقرار عبودیت اور اظہار خشوع کا کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا فرض اور لازمی ہیں اور خود شارع نے ان کے لازمی اور ضروری ہونے کی طرف اشارے کئے بلکہ بعض جگہ تصریح بھی کی لیکن اور ائمہ نے یہ زیادتی کی کہ ان ارکان کی ادائیگی کی خصوصیتوں کو بھی فرض قرار دیدیا، حالانکہ وہ خصوصیتیں لازمی نہ تھیں اسلئے

امام ابوحنیفہؒ انکی فرضیت کے قائل نہیں مثلاً

امام ابوحنیفہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کے سوا اور الفاظ سے بھی ادا ہو سکتی ہے جو اس کے ہم معنی ہیں (مثلاً اللہ اعظم اللہ اجل) امام شافعی کے نزدیک نہیں ہو سکتی، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تکبیر اگر فارسی زبان میں کہی جائے تب بھی جائز ہے امام شافعی کے نزدیک اس سے نماز باطل ہو جاتی ہے امام ابوحنیفہؒ کے قرآن مجید کی کسی آیت کے پڑھنے سے قرأت کا فرض ادا ہو جاتا ہے امام شافعیؒ کے نزدیک بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز ہو ہی نہیں سکتی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جو شخص عربی میں قرآن پڑھنے سے معذور ہے وہ مجبوراً ترجمہ پڑھ سکتا ہے [1] امام شافعی کے نزدیک ترجمہ سے کسی حالت میں نماز نہیں ہو سکتی ہے۔

اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ امام ابوحنیفہؒ یا کسی مجتہد نے صرف عقل و قیاس سے نماز کے ارکان متعین کئے ہیں ائمہ نے ان ارکان کے ثبوت کے لئے عموماً احادیث کی تصریحات واشارات سے استدلال کیا ہے چنانچہ ہر مجتہد کے نقلی دلائل کتب فقہ میں بہ تفصیل مذکور ہیں ہمارا یہ مطلب ہے کہ امام ابوحنیفہ کے دعووں پر جس طرح نقلی دلائل یعنی احادیث کی تصریحیں اور اشارے موجود ہیں اسی طرح عقلی وجوہ بھی انکی صحت کے شاہد ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب شریعت کے اسرار و مصالح کو نہایت دقیق نگاہ سے دیکھتے تھے۔

زکوۃ کے مسائل کا بھی یہی حال ہے زکوۃ کا اصلی مقصد بنی نوع کی ہمدردی اور اعانت ہے اسی لئے زکوۃ کے مصرف میں وہ لوگ خاص کر دیئے گئے ہیں جو سب سے زیادہ ہمدردی اور اعانت کا استحقاق رکھتے ہیں یعنی فقراء، مساکین، عمال زکوۃ، مولفتہ القلوب، مقروض، مسافر، غازی، مکاتب، چونکہ ان لوگوں کی تصریح خود قرآن مجید میں مذکور ہے اسی لئے اس امر میں سب مجتہدین کا اتفاق رہا کہ یہ لوگ مصرف زکوۃ ہیں لیکن تعین نے ایک اختلاف پیدا کر دیا، امام شافعیؒ نے ان اقسام کے ذکر سے یہ خیال کیا کہ یہ سب اشخاص زکوۃ کی ادائیگی میں لازمی ہیں یعنی جب تک ان آٹھوں اقسام کے لوگوں کو زکوۃ ادا نہ کی جائے فرض ادا ہی نہیں ہو سکتا بخلاف اس کے امام ابو

---

[1] امام محمد نے جامع صغیر میں جو روایت کی ہے اس میں مجبوری کی قید نہیں ہے اور اسی بناء پر مخالفین نے امام صاحب پر یہ سخت اعتراض کیا ہے کہ وہ قرآن کی حقیقت ومفہوم میں الفاظ کو دخل نہیں سمجھتے یعنی ان کے نزدیک صرف قرآن معنی پر قرآن کا اطلاق ہو سکتا ہے بے شبہ امام صاحب کی اس غلطی کو ہم تسلیم کرتے ہیں لیکن فقہ حنیفہ نے دعویٰ کیا ہے کہ امام صاحب نے بالآخر اس قول سے رجوع کیا ہے۔ ۱۲

حنیفہ کا یہ مذہب ہے کہ زکوۃ ان اقسام سے باہر نہ جانے پائے باقی یہ امر کہ ان لوگوں میں سب کو دی جائے بعض کو یہ امر مقتضائے وقت اور ضرورت پر موقوف ہے امام اور حاکم وقت ضرورت کے لحاظ سے جسکو چاہے انتخاب کرسکتا ہے۔

ایک اور مسئلہ جس میں امام ابوحنیفہؒ اور دوسرے ائمہ مختلف ہیں یہ ہے کہ چوپاؤں کی زکوۃ ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک زکوۃ میں جانور یا اسکی قیمت ادا کی جاسکتی ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک قیمت ادا کرنے سے زکوۃ ادا ہی نہیں ہوسکتی حالانکہ زکوۃ کی غرض حاصل ہونے میں جانور اور اسکی قیمت دونوں برابر ہیں اس لئے شارع نے بھی کوئی تخصیص نہیں فرمائی۔

ان مسائل کے سوا عبادات کے اور سینکڑوں مسائل ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حنفی مسائل میں ہر جگہ مصالح اور اسرار کی خصوصیت ملحوظ ہے لیکن ہم تطویل کے لحاظ سے ان سب کی تفصیل نہیں کرسکتے معاملات کے مسائل میں یہ عقدہ زیادہ حل ہوجاتا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب کس قدر مصالح اور اسرار کے موافق ہے۔

۲:۔دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حنفی فقہ بہ نسبت تمام اور فقہوں کے نہایت آسان او یسیر التعمیل ہے۔

قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے خدا تم لوگوں کے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا'' رسول اللہ صلعم کا قول ہے کہ میں نرم اور آسان شریعت لے کر آیا ہوں بے شبہ اسلام کو تمام او مذہبوں کے مقابلہ میں یہ فخر حاصل ہے کہ وہ رہبانیت سے نہایت بعید ہے اس میں عبادات شاق نہیں ہیں، اس کے مسائل آسان اور یسیر التعمیل ہیں حنفی فقہ کو بھی اور مذہبوں پر ترجیح حاصل ہے۔

حنفی فقہ کا آسان اور وسیع ہونا ایسا متعارف ہے کہ شعراٗ اور مصنفین اسکو ضرب المثل کے طور پر ذکر کرتے ہیں انوری نے جو ایک فحاش اور بدزبان شاعر تھا اگرچہ برے موقع پر اس استعمال کیا اور کہا ع

چوں رخصتہائے ابو حنیفہ

تاہم اصل مدعا کا ثبوت اس کے کلام سے بھی ہوتا ہے، عبادات اور معاملات کا کوئی باب کوئی فصل لے لو، یہ تفرقہ صاف نظر آتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مسائل ایسے آسان اور نرم ہیں جو آسان شریعت کی شان ہے بخلاف اس کے اور ائمہ کے بہت سے احکام بہت سخت اور دشوار العمل ہیں، مثلاً کتاب الجنایات و کتاب الحدود کے مسائل، انہی میں سے سرقہ کے احکام ہیں۔ چنانچہ ہم اس کے چند جزئیات نمونہ کے طور پر یہاں لکھتے ہیں۔

اس قدر تو سب کے نزدیک مسلم ہے کہ سرقہ کی سزا قطع ید یعنی ہاتھ کاٹنا ہے، لیکن

مجتہدین نے سرقہ کی تعریف میں چند شرطیں اور قیدیں لگائی ہیں جن کے بغیر قطع ید کی سزا نہیں ہو سکتی، ان شروط کے لحاظ سے احکام پر جو اثر پڑتا ہے وہ ذیل کے جزئیات سے معلوم ہوگا کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب کس قدر آسان اور تمدن و شائستگی کے کس قدر موافق ہے۔

امام ابوحنیفہ کے مسائل	اور ائمہ کے مسائل
نصاب سرقہ کم از کم ایک اشرفی ہے	ایک اشرفی کا ربع
اگر ایک نصاب میں متعدد چوروں کا ساجھا ہے تو کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔	امام احمد کے نزدیک ہر ایک کا ہاتھ کاٹا جائے گا
نادان بچہ پر قطع ید نہیں۔	امام مالک کے نزدیک ہے۔
کفن چور پر قطع ید نہیں۔	اور ائمہ کے نزدیک ہے۔
زوجین میں سے اگر ایک دوسرے کا مال چرائے تو قطع ید نہیں۔	امام مالک کے نزدیک ہے۔
بیٹا باپ کا مال چرائے تو قطع ید نہیں۔	امام مالک کے نزدیک ہے۔
قرابت قریبہ والے مثلاً چچا بھائی وغیرہ قطع ید نہیں	اور ائمہ کے نزدیک ہے۔
ایک شخص کسی سے کوئی چیز مستعار لے کر انکار کر گیا تو قطع ید نہیں۔	اور ائمہ کے نزدیک ہے
ایک شخص نے کوئی چیز چرائی پھر بذریعہ ہبہ یا بیع اس کا مالک ہو گیا تو قطع ید نہیں	اور ائمہ کے نزدیک ہے۔
غیر مذہب والے جو مستامن ہو کر اسلام کی عملداری میں رہتے ہیں ان پر قطع ید نہیں۔	اور ائمہ کے نزدیک ہے۔
قرآن مجید کے سرقہ پر قطع ید نہیں۔	امام شافعی و مالک کے نزدیک ہے
لکڑی یا جو چیزیں جلد خراب ہو جاتی ہیں ان کے سرقہ سے قطع ید لازم نہیں آتا	اور ائمہ کے نزدیک لازم آتا ہے۔

فقہ کا ایک بڑا حصہ کتاب الحظر والاباحۃ ہے، یعنی حرام و حلال، جائز و ناجائز کی تفصیل اس باب میں یہ دعویٰ اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے، اور ائمہ کے بہت سے ایسے مسئلے ہیں جن کی پابندی کی جائے تو زندگی دشوار ہو جائے بخلاف اس کے امام ابوحنیفہؒ کے احکام نہایت آسان اور سہل ہیں۔ مثلاً امام شافعی کے نزدیک جو پانی اپلوں کی آگ سے گرم کیا گیا ہو اس سے غسل اور وضو ناجائز ہے، اسی طرح مٹی کے برتن جو اپلوں کی آگ سے پکائے گئے ہوں ان میں کھانا ناجائز

ہے۔ رانگ، کانچ، بلور، عقیق کے برتنوں کا استعمال ناجائز ہے، پشمینہ، آمور، پوستین وغیرہ کا استعمال ناجائز ہے اور ان کو پہن کر نماز نہیں ہوسکتی۔ برتن کرسیاں اور زمین وغیرہ جن پر چاندی کا کام ہو ان کا استعمال ناجائز ہے، بیع بالمعاطاۃ یعنی خرید فروخت کا عام طریقہ جس میں بیع وشرا کی تصریح نہیں کی جاتی ناجائز ہے ان تمام مسائل میں امام ابوحنیفہ کا مذہب امام شافعی سے مخالف ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حنفی فقہ دوسری فقہوں کی طرح تنگ اور سخت گیر نہیں ہے۔

(۳) فقہ کا بہت بڑا حصہ جس سے دینوی ضرورتیں متعلق ہیں معاملات کا حصہ ہے اور یہی موقع ہے جہاں ہر مجتہد کی وقت نظر اور نکتہ شناسی کا پورا اندازہ ہوسکتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے زمانہ تک معاملات کے احکام ایسے ابتدائی حالت میں تھے کہ متمدن اور تہذیب یافتہ ممالک کے لیے بالکل ناکافی تھے، نہ معاہدات کے استحکام کے قاعدے منضبط تھے نہ دستاویزات وغیرہ کی تحریر کا اصول قائم ہوا تھا، نہ فصل قضایا اور ادائے شہادت کا کوئی باقاعدہ طریقہ تھا، امام ابوحنیفہ پہلے شخص ہیں جو ان چیزوں کو قانون کی صورت میں لائے، لیکن افسوس ہے کہ جو مجتہدین ان کے بعد ہوئے انہوں نے بجائے اس کے کہ اس کو اور وسعت دیتے، اسی غیر تمدنی حالت کو قائم رکھنا چاہیے۔ جس کا منشاء وہ زاہدانہ خیال تھے جو علمائے مذہب کے دماغوں میں جاگزین تھے، ایک مشہور محدث نے فقہا پر طعن کیا ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک جب کسی زمین کا دعویٰ کسی عدالت میں پیش کیا جائے تو ضروری ہے کہ عرض دعویٰ میں زمین کا موقع بتایا جائے۔ اس کی حدود اربعہ دکھائی جائیں حیثیت اور صورت کی تفصیل ہو حالانکہ رسول اللہ (صلعم) یا صحابہ کے زمانہ میں ان جزئیات اور قیدوں کا نام ونشان بھی نہ تھا، محدث مذکور کے نزدیک یہ بڑے الزام کی بات ہے۔ لیکن اگر ان کو کسی ترقی یافتہ ملک میں رہنے کا اتفاق ہوتا اور معاملات سے بھی کام پڑتا تو معلوم ہوتا کہ جن چیزوں کو وہ الزام کی بات سمجھتے ہیں ان کے بغیر زندگی بسر کرنی مشکل ہے۔

امام شافعی ہبہ کے لیے قبضہ کو ضروری نہیں سمجھتے، شفعۂ ہمسایہ کو جائز نہیں رکھتے تمام معاملات میں مستور الحال کی شہادت کو ناجائز قرار دیتے ہیں گواہان نکاح کے لیے ثقہ اور عادل ہونے کی قید ضروری سمجھتے ہیں۔ ذمیوں کے باہمی معاملات میں بھی ان کی شہادت جائز قرار نہیں دیتے، بے شبہ یہ باتیں ان ممالک میں نہایت آسانی سے چل سکتی ہیں۔ جہاں تمدن نے وسعت نہیں حاصل کی ہے اور معاملات کی صورتیں بالکل سادہ اور نیچرل حالت میں ہیں لیکن جن ملکوں میں تمدن نے ترقی حاصل کی ہو معاملات کی مختلف پیچ در پیچ صورتیں پیدا ہو جاتی ہوں، حقوق کی تجدید اور انضباط کے بغیر چارہ نہ ہو وہاں ایسے احکام کو قائم رہنا آسان نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان تمام مسائل میں امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ سے مخالف ہیں، مورخ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ امام مالک کا مذہب انہی ممالک میں رواج پا سکا جہاں تمدن نے

وسعت نہیں حاصل کی تھی ؎۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ امام مالک کے مسائل میں اصول تمدن کی رعایت نہ تھی۔

امام ابوحنیفہؒ نے جس وقت نظر اور نکتہ شناسی کے ساتھ معاملات کے احکام منضبط کیے، اس کا صحیح اندازہ تو اس وقت ہو سکتا ہے کہ معاملات کے چند ابواب پر ایک مفصل تبصرہ کیا جائے لیکن ایسی تفصیل کے لیے نہ وقت مساعد ہے، نہ اس مختصر کتاب میں اس کی گنجائش ہے۔ تاہم **مالا یدرک کلہ لایترک کلہ** اس لیے نمونہ کے طور پر ہم صرف مسائل نکاح کا ذکر کرتے ہیں۔ جو عبادات اور معاملات دونوں کا جامع ہے۔

نکاح کو اگرچہ فقہا نے عبادات میں شامل کیا ہے، لیکن یہ صرف ایک اصطلاح ہے ورنہ نکاح بوجہ اس کے کہ تمدن و معاشرت کے دو بڑے بڑے نتائج اس پر متفرع ہوتے ہیں، معاملات کا نہایت ضروری حصہ قرار دیا جا سکتا ہے"۔

مسائل نکاح کے انتخاب کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ بعض یورپین مصنفوں نے یہ دعوےٰ کیا ہے کہ حنفی فقہ کے مسائل نکاح نہایت وحشیانہ اور ظالمانہ ہیں لیکن ہم اس بحث میں دکھا دیں گے کہ آج مہذب سے مہذب ملکوں میں بھی نکاح کے قواعد حنفی فقہ سے عمدہ تر نہیں ہیں نبتھم نے اپنی کتاب یوٹلٹی میں لکھا ہے کہ رومن لاء کے بموجب قواعد نکاح ایک مجموعہ ظلم ہیں لیکن ہم ثابت کر دیں گے کہ حنفی فقہ کے بموجب قواعد نکاح مجموعہ انصاف ہیں، غالباً اس بحث سے ان لوگوں کے خیالات کی بھی کس قدر اصلاح ہوگی جو غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ حنفی فقہ رومن لاء سے ماخوذ ہے

نکاح وازدواج، تمدن اور معاشرت کا نہایت وسیع حصہ ہے، نکاح بقول ایک حکیم کے جماعتوں کا شیرازہ، تہذیب کی اصل، تمدن کی بنیاد ہے اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ جس مقنن نے اس کے اصول وضوابط کی عمدہ توضیح یا تشریح کی وہ قانون تمدن کا بہت بڑا نکتہ شناس ہے، اگرچہ امام ابوحنیفہ ان اصول وضوابط کے موجد نہیں ہیں، شارع نے خود اس کے مہمات مسائل بتا دیے تھے تاہم جس نکتہ سنجی کے ساتھ انہوں نے ان اصول کی تشریح کی اور اس پر احکام متفرع کیے وہ خود ایک بڑے مقنن کا کام تھا۔ شارع کا کلام کہیں مجمل واقع ہوا تھا کہیں محتمل المعانی، بعض جگہ صرف اشارے تھے، خاص کر جزئیات بہت کم مذکور تھیں یہی وجہ ہے کہ نکاح کے اکثر مسائل میں مجتہدوں کی مختلف رائیں قائم ہو گئیں۔ یہی مختلف فیہ مسائل ہیں جن میں امام صاحب کے اجتہاد کے جوہر کھلتے ہیں، اور صاف نظر آتا ہے کہ جس طرح انہوں نے ان موقعوں پر شارع کے اجمال کی تفصیل کی، احتمالات کے محل معین کیے، اشاروں کی تصریحات بتائیں، جزئیات کی تفریع کی اور انہی کا کام تھا جن میں اور مجتہدین کسی طرح ان کی ہمسری نہیں کر سکتے۔

؎ اس قول کو ہم پہلے کر چکے ہیں۔

نکاح کے مسائل جن اصول پر متفرع ہیں وہ یہ ہیں۔
ا:۔کن لوگوں کے ساتھ نکاح ہونا چاہیے۔۲:۔معاملہ نکاح کس کے اختیار سے ہونا چاہیے۔۳:۔اس کی بقاوثبات کا استحکام کس حد تک ضروری ہے۔۴:۔فریقین کے حقوق کیا قرار دیے جائیں۔۵:۔نکاح کن رسوم ورواج کے ساتھ عمل میں آئے۔

یہ امر کہ نکاح کی وسعت کو کس حد تک محدود کیا جائے۔تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ تمام مذاہب میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے، ہر قوم نے چند محرمات قرار دیے ہیں جن کے ساتھ ازواج کو ناجائز قرار دیا ہے اور یہ محرمات قریباً تمام مذہبوں میں مشترک ہیں، جس کی وجہ یہی ہے کہ یہ امر نہایت صریح اصول عقلی پر مبنی ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ اور فلاسفر بنتھم نے کتاب یوٹلٹی میں محرکات کی حرمت کے جو دلائل قائم کئے ہیں بالکل مشترک ہیں چونکہ یہ امر بالکل اصول فطرت کے مطابق ہے، اور قرآن مجید میں محرمات کے نام تصریحاً مذکور ہیں اس لیے اصل مسئلہ میں تمام مجتہدین کا اتفاق رہا لیکن جو جزئیات ظاہر ذیل کے نص میں نہیں آئیں ان میں اختلاف پیدا ہوگی۔انہی میں حرمت بالزنا کا مسئلہ ہے جو امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے اختلاف کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے، امام شافعیؒ کا مذہب ہے کہ زنا سے حرمت کے احکام پیدا نہیں ہوتے۔مثلاً باپ نے کسی عورت سے زنا کیا تو بیٹے کا نکاح اس سے ناجائز نہیں ہے، امام شافعی نے اس کو یہاں تک وسعت دی ہے کہ ایک شخص نے اگر کسی عورت کے ساتھ زنا کیا اور اس سے لڑکی پیدا ہوئی تو خود وہ شخص اس لڑکی کے ساتھ نکاح کرسکتا ہے، ان کی دلیل ہے کہ زنا ایک حرام فعل ہے اس لیے وہ حرام کو حلال نہیں کرسکتا، امام ابوحنیفہؒ اس کے بالکل مخالف ہیں، ان کے نزدیک مقاربت کے ذریعہ سے مرد اور عورت کے تعلقات پر جو فطری اثر پڑتا ہے وہ نکاح پر محدود نہیں ہے اور یہ بالکل صحیح ہے محرمات کی حرمت جس اصول پر مبنی ہے، اس کو نکاح کے ساتھ خصوصیت نہیں ہے اپنے نطفہ سے جو اولاد ہو گو زنا ہی سے ہو اس کے ساتھ نکاح اور مقاربت کا جائز رکھنا بالکل اصول فطرت کے خلاف ہے، باپ کی موطوءٔ کا بھی یہی حال ہے وعلیٰ ہذا القیاس خود قرآن مجید میں اس کے اشارے موجود ہیں۔لیکن چونکہ یہاں نقلی بحث نہیں اس لیے ہم اس کا ذکر نہیں کرتے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ معاملۂ نکاح کا مختار کون ہے؟ یہ ایک نہایت مہتم بالشان ہے، اور نکاح کے اثر کی خوبی یا برائی بہت کچھ اسی امر پر منحصر ہے، امام شافعی و امام احمد بن حنبل کے نزدیک عورت گو عاقلہ بالغہ ہو نکاح کے بارے میں خود مختار نہیں یعنی کسی حال میں وہ اپنا نکاح آپ نہیں کرسکتی، بلکہ ولی کی محتاج ہے، ان بزرگوں نے ایک طرف تو عورت کو اس قدر مجبور کیا، اور دوسری طرف ولی کو ایسے وسیع اختیارات دیے کہ وہ زبردستی جس شخص کے ساتھ چاہے نکاح باندھ

دے، عورت کسی حال میں انکار نہیں کرسکتی۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بالغہ عورت اپنے نکاح کی آپ ہی مختار ہے بلکہ اگر نابالغی کی حالت میں ولی نے نکاح کردیا ہو تو بالغ ہو کر وہ نکاح کو فسخ کرا سکتی ہے۔

اس اختلاف کی اصل بنیاد عورتوں کے حقوق کے مسئلہ پر مبنی ہے۔ تمام مذہبوں میں عورتوں کی حالت نہایت پست قرار دی گئی ہے اور ان کے حقوق نہایت تنگدلی سے قائم کیے گئے ہیں، ہندوؤں اور عیسائیوں کے ہاں عورتوں کو میراث نہیں ملتی۔ خود عرب میں اسلام سے پہلے یہی دستور تھا۔ اسی طرح اور بہت سے امور ہیں جن سے عورتوں کا کم رتبہ ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن اسلام نے مردوں اور عورتوں کے حقوق یکساں درجہ پر قائم کیے ہیں اور فرمایا **لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ**۔ امام ابوحنیفہ نے ان تمام مسائل میں اس اصول مساوات کو مرعی رکھا ہے اور یہی خصوصیت ہے جو اس باب میں ان کی فقہ کو اور ائمہ کی فقہ سے ممتاز کرتی ہے، مثلاً امام ابوحنیفہ کے نزدیک نکاح، طلاق، عتق وغیرہ معاملات میں عورتوں کی شہادت اسی طرح معتبر ہے جس طرح مردوں کی بخلاف اس کے اور ائمہ مجتہدین کے نزدیک عورتوں کی شہادت کا اعتبار نہیں بعض معاملات میں ان بزرگوں نے عورتوں کی شہادت جائز بھی رکھی ہے تو یہ قید لگائی ہے کہ دو سے کم نہ ہوں اور امام شافعی کے نزدیک تو چار سے کم کا کسی حالت میں اعتبار نہیں، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس طرح ایک مرد کی گواہی معتبر ہے عورت کی بھی ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک عورت کو بھی ایسا ہی اختیار دینا چاہیے۔

اس عام اصول مساوات سے قطع نظر صورت متنازعہ میں خصوصیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ نکاح کا معاملہ عام معاملات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا نکاح ایک ایسا تعلق ہے جس کا اثر نہایت وسیع ہے اور زندگی کے اخیر وقت تک قائم رہتا ہے، اس لیے ایسے معاملے میں ایک فریق کو بالکل بے اختیار رکھنا نہایت ناکافی ہے۔

اس بحث میں امام شافعی کا مدار محض نقلی دلائل پر ہے، لیکن اس میدان میں بھی امام ابوحنیفہ ان سے پیچھے نہیں اگر امام شافعی کو **لا نکاح الا بولی** پر استدلال ہے تو امام صاحب کی طرف **الثیب احق بنفسها من ولیها والبکر تستاذن فی نفسها** موجود ہے لیکن اس بحث کا یہ موقع نہیں۔

تیسری بحث یہ ہے کہ معاملہ نکاح کا استحکام و بقا کس حد تک ضروری ہے، عقد و نکاح کی خوبی کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے یعنی یہ کہ وہ تمدن کی بنیاد اور جماعتوں کا شیرازہ ہے، یہ اسی حالت میں ہے جب وہ ایک مضبوط اور دیرپا معاملہ قرار دیا جائے ورنہ وہ صرف تقاضائے شہوت کا ایک ذریعہ ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اس اصول کو نہایت قوت کے ساتھ ملحوظ رکھا ہے انہوں نے طریقہ انعقاد، تعیین مہر، ایقاع طلاق، نفاذ خلع کے جو قاعدے قرار دیے ہیں ان سب میں اصول سے کام لیا ہے۔

اس باب میں سب سے مقدم ان کا یہ مسئلہ ہے۔ ''الطلاق مع استقامۃ حال الزوجین حرام۔'' یعنی جب تک زوجین کی حالت استقامت پر ہے۔ طلاق دینا حرام ہے ضرورت اور مجبوری کی حالت میں طلاق کو جائز قرار دیا ہے تو اس کا طریقہ ایسا رکھا ہے جس سے اصلاح اور رجعت کی امید منقطع نہ ہو، یعنی یہ کہ تین بار کر کے طلاق دے اور ہر طلاق میں ایک مہینہ کا فاصلہ ہوتا کہ اس اثناء میں شوہر کو اپنے ارادے کے فیصلہ کرنے کے لیے کافی وقت ملے، اگر وہ اس ارادے سے باز آنا چاہے تو باز آ سکتا ہے اور مستحب یہی ہے کہ باز آئے، اس وسیع مدت میں بھی اگر اصلاح و آشتی کی توقع نہ ہو اور تجربہ سے ثابت ہو جائے کہ فریقین کی برہمی کس طرح اصلاح پذیر نہیں ہے تو مجبوراً طلاق دے۔ طلاق کے بعد اس کو مہر ادا کرنا ہوگا اور تین مہینے تک زوجہ کی خورد ونوش کی کفالت کرنی ہوگی، اس سے یہ مقصد ہے کہ جب تک وہ دوسرا شوہر نہ پیدا کر سکے گزر اور بسر اوقات کے لیے اس کو تکلیف نہ اٹھانی پڑے اور مہر کی رقم عام مصارف میں کام آئے اس باب میں امام صاحب کے مسائل جو اور ائمہ سے مختلف ہیں ان کو ذیل میں یکجا طور پر لکھتے ہیں جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ امام صاحب نے معاملہ نکاح کو کیسے مہتم بالشان اور مضبوط معاملہ سمجھا ہے اور ہر حالت میں ان کے قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔

۱:۔ جب تک فریقین کی حالت میں استقامت امام [illegible] کے نزدیک حرام نہیں
ہو طلاق دینا حرام ہے

۲:۔ ایک بار تین طلاق دینا حرام ہے اور اس امام شافعی اور امام محمد بن حنبل کے نزدیک کچھ
کا مرتکب عاصی ہے مضائقہ نہیں۔

۳:۔ مہر کی تعداد کسی حالت میں دس درہم امام شافعی و امام احمد بن حنبل کے نزدیک ایک
سے کم نہیں ہو سکتی اس سے یہ مقصد ہے کہ مرد حبہ کی مہر ہو سکتا ہے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ مرد بے
کو فسخ طلاق پر آسانی سے جرأت نہ ہو کیونکہ دریغ بے سوچے سمجھے طلاق دینے پر جرأت کر
یہ تعداد غریب اور مفلس کے لئے ہے اس کو سکتا ہے، اور عورت کو بوجہ اس کے کہ تفریق کے
اس رقم کا ادا کرنا اتنا ہی مشکل ہے جیسے بعد محض مفلس اور نادار رہے گی سخت تکلیف کا
امیروں کو دو چار ہزار کا ادا کرنا۔ احتمال ہے۔

۴:۔ خلوت صحیحہ سے پورا مہر واجب ہو جاتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک نصف واجب ہوتا ہے۔

۵:۔جسمانی بیماریاں مثل برص وغیرہ فسخ نکاح سبب نہیں ہو سکتیں۔	امام شافعی و مالک کے نزدیک ان کی وجہ سے فسخ نکاح ہو سکتا ہے۔
۶:۔اگر کوئی شخص مرض الموت میں طلاق دے اور عدت کے زمانہ میں اس کا انتقال ہو جائے تو عورت کو میراث ملے گی۔	امام شافعی کے نزدیک نہیں ملے گی
۷:۔طلاق رجعی کی حالت میں وطی حرام نہیں ہے، یعنی زوجیت کا تعلق ایسی معمولی بیزاری سے منقطع نہیں ہوتا۔	امام شافعی کے نزدیک حرام ہے گویا وہ بائنہ ہو چکی
۸:۔رجعت کے لیے اظہار زبانی کی ضرورت نہیں، ہر فعل جس سے رضا مندی ظاہر ہو رجعت کے لیے کافی ہے، مطلب یہ ہے کہ آسانی دی جائے تا کہ رجعت بادنیٰ مسامحت ہو سکے۔	امام شافعی کے نزدیک بغیر اقرار و اظہار رجعت ہو ہی نہیں سکتی۔
۹:۔رجعت پر گواہ مقرر کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ورنہ بعض حالتوں میں گواہ نہ مل سکے اور رجعت کی مدت قریب الانقضاء ہے تو طلاق بائن ہو جائے گی۔	امام مالک کے نزدیک بغیر استشہاد کے رجعت صحیح نہیں ہے۔

نکاح کے قواعد مرتب ہونے کے لیے یہ ایک نہایت ضروری امر ہے کہ فریقین کے حقوق نہایت فیاضی اور اعتدال کے ساتھ قائم کئے جائیں۔عورتوں کو مردوں کے ساتھ جن باتوں میں مساوات حاصل ہے وہ باطل نہ ہونے پائے۔کیونکہ نکاح سے عورتوں کو اپنے امن و راحت کی توقع ہونی چاہیے نہ یہ کہ اس کے اصلی حقوق میں بھی زوال آئے۔یہ اسلام کی خاص فیاضی ہے جس کی نظیر کسی اور مذہب میں نہیں مل سکتی کہ اس نے معاملہ نکاح میں عورتوں کے حقوق نہایت وسعت کے ساتھ قائم کئے ہیں۔امام ابو حنیفہ نے اس اصول کی تمام مسائل میں ملحوظ رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان مسائل میں جہاں اور ائمہ نے ان سے اختلاف کیا ہے صریح غلطی کی ہے مثلاً

خلع کا معاملہ جو طلاق سے مشابہ ہے۔

اس باب میں تو سب ائمہ متفق ہیں کہ جس طرح مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے اسی طرح عورت کو کچھ معاوضہ دے کر خلع کا اختیار ہے لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ اس معاملہ کی کیا صورت ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے کہ اگر عورت کا قصور ہے اور خود اس کی بدسلوکی تفریق کا سبب ہوئی ہے تو اس کے مہر کی مقدار کے برابر شوہر کو معاوضہ دینا چاہیے، مرد اگر اس مقدار سے زیادہ معاوضہ کا خواہاں ہو تو مکروہ ہے لیکن اگر مرد کی شرارت ہے تو عورت بغیر کسی جرمانہ ادا کرنے کے خلع کی مستحق ہے اور مرد کو خلع کا معاوضہ لینا مکروہ ہے۔ امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک اولاً مرد جس قدر چاہے معاوضہ لے سکتا ہے اور اس پر عورت کو مجبور کر سکتا ہے اس سے بڑھ کر یہ کہ گو شرارت و زیادتی مرد کی ہو، تاہم وہ عورت سے معاوضہ لے سکتا ہے اور جس قدر چاہے لے سکتا ہے حالانکہ یہ صریح ناانصافی ہے کہ عورت بے گناہ بھی ہو اور معاوضہ بھی ادا کرے۔

اخیر بحث یہ ہے کہ نکاح کن رواجوں کے ساتھ عمل میں آئے۔ ان رسوم میں صرف دو مقصود پیش نظر ہیں، اول یہ کہ فریقین کی رضامندی محقق ہو جائے، دوسرے یہ کہ واقعہ، عقد کا اشتہار ہو جائے ان اغراض کے لحاظ سے امام ابو حنیفہ نے نہایت مناسب قاعدے قرار دیے ہیں یعنی یہ کہ فریقین ایسے الفاظ استعمال کریں جن سے ظاہر ہو کہ انہوں نے معاملہ نکاح کو قبول کر لیا ہے اور یہ کہ عقد نکاح دو گواہوں کے سامنے عمل میں آئے۔ یہ دونوں سادہ اور آسان شرطیں ہیں جو ہر موقع پر استعمال کی جا سکتی ہیں لیکن بعض ائمہ نے بخلاف اس کے ان شرطوں میں ایسی سخت قیدیں لگائی ہیں، جن کی پابندی نہایت مشکل ہے امام شافعی کا مذہب ہے کہ گواہان نکاح عادل ہونے چاہئیں ورنہ نکاح صحیح نہیں۔ عدالت کے جو معنی مجتہدین اور خاص کر امام شافعی نے بیان کیے ہیں اس کے لحاظ سے ہزاروں میں سے ایک آدھ عادل ہو سکتا ہے۔ اس لیے اگر یہ قید ضروری سمجھی جائے تو صحیح نکاح کا وجود ڈھونڈنے سے بھی نہ مل سکے گا، امام شافعی و امام احمد بن حنبل کے نزدیک ضروری ہے کہ گواہ مرد ہوں لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عورتیں بھی گواہ ہو سکتی ہیں اور یہی قرین عقل بھی ہے۔ امام شافعی نے یہ بھی قید لگائی ہے کہ خاص تزویج کے الفاظ استعمال کیے جائیں حالانکہ خاص الفاظ کی پابندی کا کچھ حاصل نہیں جو الفاظ اس مفہوم پر دلالت کرتے ہیں مثلاً

ہبہ، تملیک وغیرہ سب عقد نکاح کے لیے کافی ہیں۔ (۴) ایک بڑی خصوصیت جو فقہ حنفی کو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ذمیوں یعنی ان لوگوں کو جو مسلمان نہیں ہیں مسلمانوں کی حکومت میں مطیعانہ رہتے ہیں نہایت فیاضی اور آزادی سے حقوق بخشے ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جس کی نظیر کسی امام اور مجتہد کے مسائل میں نہیں ملتی۔ اگرچہ ذمیوں کے حقوق کی حفاظت خود شارع کی ہدایتوں میں جابجا موجود ہے لیکن چونکہ وہ عام کلیات ہیں۔ اس کے علاوہ شارع کے بعض اقوال بظاہر اس کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی تعبیر مطالب میں اختلاف پیدا ہوئے ہیں۔ تاہم کچھ شبہ نہیں کہ جو تعبیر امام ابوحنیفہ نے کی ہے وہی صحیح ہے۔ اسلام نہایت وسیع دنیا پر حکمراں رہا ہے اور اس کی حدود حکومت میں سینکڑوں غیر قومیں آباد تھیں اور ہیں اس لئے اگر ان کے حقوق کی واجبی حفاظت نہ کی جائے تو ایک دن بھی امن قائم نہیں رہ سکتا۔ امام ابوحنیفہ نے ذمیوں کو جو حقوق دیے ہیں دنیا میں کسی گورنمنٹ نے کبھی غیر قوم کو نہیں دیے۔ یورپ جس کو اپنے قانون اور انصاف پر بڑا ناز ہے۔ بیشک زبانی دعویٰ کر سکتا ہے لیکن عملی مثالیں نہیں پیش کر سکتا۔ حالانکہ امام ابوحنیفہ کے یہ احکام اسلامی حکومتوں میں عموماً نافذ تھے اور خاص کر ہارون رشید اعظم کی وسیع حکومت انہی احکام پر قائم تھی، سب سے بڑا مسئلہ قتل و قصاص کا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ذمیوں کا خوف مسلمانوں کے خون کے برابر ہے۔ یعنی اگر کوئی مسلمان ذمی کو عمداً قتل کر ڈالے تو مسلمان بھی اس کے بدلے میں قتل کیا جائے گا اور اگر غلطی سے قتل کیا ہے تو جو خون بہا مسلمانوں کے قتل بالخطا سے لازم آتا ہے وہی ذمی کے قتل سے بھی لازم آئے گا۔

تذکرہ امام رازی نے اپنی کتاب مناقب الشافعی میں حنفیوں کو طعنہ دیا ہے کہ ان کے نزدیک ابوبکر صدیقؓ کا خون اور ایک ذلیل ذمی کا خون برابر ہے۔ یعنی اگر ابوبکر صدیقؓ بے جرم کسی ذمی کو قتل کر ڈالتے تو حنفیوں کے نزدیک وہ بھی قتل کیے جانے کے مستحق تھے حنفیوں نے اس مسئلہ کی تعمیم میں کہیں یہ مثال نہیں دی ہے۔ امام رازی نے اس غرض سے کہ وہ اس مسئلہ کو بدنما کر کے دکھائیں۔ خود یہ مثال فرض کی ہے لیکن ہم فخر کے ساتھ اس طعنہ کو قبول کرتے ہیں، بے شبہ انصاف اور حق کی حکومت میں شاہ و گدا، مقبول و مردود کا ایک رتبہ ہے۔ بے شبہ یہ اسلام کی بڑی فیاضی ہے کہ اس نے اپنی رعایا کو اپنے برابر سمجھا۔ اسلام کو اس انصاف پر ناز ہو سکتا ہے اور اگر امام رازی کو عار آتی ہے تو آئیے۔

خد صحابہ کا کیا قول اور کیا عمل تھا۔ حضرت علیؓ کا قول ہے **من کانت له ذمتنا فدمه کدمنا و دیته کدیتنا** ،یعنی ذمی کا خون ہے اور اس کی دیت ہماری دیت ہے''۔ حضرت علیؓ پر موقوف نہیں۔ تمام مہاجرین اور انصار کا یہی قول تھا اور اسی پر عملدرآمد تھا۔ عبید اللہ جو حضرت عمرؓ کے فرزند تھے انہوں نے حضرت عمرؓ کے زخمی ہونے کے وقت دو شخصوں کو جو کافر تھے اور جن پر ان کا شبہ تھا قتل کر ڈالا۔ جب حضرت عثمانؓ مسند خلافت پر بیٹھے تو انہوں نے مہاجرین و انصار کو بلایا اور اس بارے میں رائے پوچھی۔ تمام مہاجرین نے بلا تفاق کہا کہ عبید اللہ کو قتل کرنا چاہیے۔

امام ابوحنیفہ نے ذمیوں کے لیے اور جو قواعد مقرر کیے وہ نہایت فیاضانہ قواعد ہیں وہ تجارت میں مسلمانوں کی طرح آزاد ہیں ہر قسم کی تجارت کر سکتے ہیں اور ان سے اسی شرح سے ٹیکس لیا جائے گا، جس طرح مسلمانوں سے لیا جاتا ہے۔ جزیہ جوان کی محافظت کا ٹیکس ہے اس کی شرح حسب حیثیت قائم کی جائے گیا۔ مفلس شخص جزیہ کا باقی دار ہو کر مر جائے تو جزیہ ساقط ہو جائے گا۔ ذمیوں کے معاملات انہی کی شریعت کے مطابق فیصل کیے جائیں گے۔ یہاں تک کہ اگر مثلاً کسی مجوسی نے اپنی بیٹی سے نکاح کیا تو اسلامی گورنمنٹ اس نکاح کو اس کی شریعت کے مطابق صحیح تسلیم کرے گی اور ذمیوں کی شہادت ان کے باہمی مقدمات میں مقبول ہوگی۔ ذمیوں کی اعزازی حالت یہ ہے کہ وہ حرم محترم میں جا سکتے ہیں۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں آباد ہو سکتے ہیں۔ تمام مسجدوں میں بغیر اجازت حاصل کیے داخل ہو سکتے ہیں۔ بجز ان خاص شہروں کے جو مسلمانوں نے آباد کیے ہیں۔ ہر جگہ وہ اپنی عبادت گاہ بنا سکتے ہیں۔ وہ اگر حربی کافروں کے مقابلے میں مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہیں تو سپہ سالار ان پر اعتماد کر سکتا ہے اور ان سے ہر طرح کی اعانت لے سکتا ہے۔

اس قسم کے اور احکام ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے عموماً تمام معاملات میں ذمیوں کے حقوق مسلمانوں کے برابر قرار دیے ہیں، بلکہ سچ یہ ہے کہ بعض امور میں تو انہوں نے اعتدال سے زیادہ فیاضی کی ہے مثلاً اس امر میں کہ ذمی کس حالت میں عہد سے باہر ہو جاتا ہے۔ ان کا مذہب ہے کہ بجز اس حالت کے کہ ان کے پاس جمعیت ہو اور وہ حکومت کے مقابلے پر اتر آئیں اور کسی صورت میں ان کے حقوق باطل نہیں ہوتے مثلاً کوئی ذمی جزیہ نہ ادا کرے یا مسلمان عورت کے ساتھ زنا کا مرتکب ہو، یا کافروں کی جاسوسی کرے یا کسی مسلمان کو کفر کی

ترغیب دے یا خدا اور رسول ﷺ کی شان میں بے ادبی کرے تو ان تمام حالتوں میں وہ سزا کا مستحق ہوگا لیکن باغی نہ سمجھا جائے گا اور اس کے حقوق باطل نہ ہوں گے۔

اب اس کے مقابلہ میں اور ائمہ کے مسائل دیکھو۔ امام شافعی کے نزدیک کسی مسلمان نے گو بے جرم اور عمداً کسی ذمی کو قتل کیا ہو، تاہم وہ قصاص سے بری رہے گا صرف دیت دینی ہوگی یا مالی معاوضہ ادا کرنا ہوگا وہ بھی مسلمانوں کی دیت کا ایک ثلث اور امام مالکؒ کے نزدیک نصف، تجارت میں یہ سختی ہے کہ ذمی اگر تجارت کا مال ایک شہر سے دوسرے شہر کو لے جائے تو سال میں جتنی بار لے جائے ہر بار اس سے نیا ٹیکس لیا جائے گا۔

جزیہ کے متعلق امام شافعی کا مذہب ہے کہ کسی حال میں ایک اشرفی سے کم نہیں ہوسکتا اور بوڑھے، اندھے، اپاہج، مفلس، تارک الدنیا تک اس سے معاف نہیں۔ بلکہ امام شافعی سے ایک اور روایت ہے کہ جو شخص مفلس ہونے کی وجہ سے جزیہ نہیں ادا کرسکتا وہ سلام کی عملداری میں نہ رہنے پائے۔ خراج جوان پر حضرت عمرؓ کے زمانے میں مقرر کیا گیا تھا اس پر اضافہ ہوسکتا ہے۔ مگر کسی صورت میں کمی نہیں ہوسکتی۔ ذمیوں کی شہادت گو فریقین مقدمہ ذمی ہوں کسی حال میں مقبول نہیں اس مسئلہ میں امام مالک و امام شافعی دونوں متفق الرائے ہیں۔

ذمی کبھی حرم میں داخل نہیں ہوسکتا اور نہ وہ مکہ اور مدینہ منورہ میں آباد ہوسکتا ہے امام شافعی نے نزدیک عام مسجدوں میں اجازت کے ساتھ داخل ہوسکتا ہے لیکن امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک اس کو بالکل اجازت نہیں مل سکتی۔ ذمی اسلامی حدود حکومت میں کہیں اپنی عبادت گاہ نہیں بنوا سکتا۔

ذمیوں پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اور وہ اسلامی فوج میں نہیں شریک ہوسکتے ذمی اگر کسی مسلمان کو قصداً قتل کرڈالے یا کسی مسلمان عورت کے ساتھ زنا کا مرتکب ہو تو اسی وقت اس کے تمام حقوق باطل ہو جائیں گے اور وہ کافر حربی سمجھا جائے گا، یہ احکام بھی عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ خاص ہیں۔ امام شافعی کے نزدیک بت پرستوں کو جزیہ ادا کردینے پر بھی اسلامی حدود میں رہنے کی اجازت نہیں۔

یہ تمام احکام ایسے سخت ہیں، جن کا تحمل ایک ضعیف سے ضعیف محکوم قوم بھی نہیں کرسکتی اور یہی وجہ ہے کہ امام شافعی وغیرہ کا مذہب سلطنت کے ساتھ نہ نبھ سکا۔ مصر میں بے شبہ ایک

مدت تک گورنمنٹ کا مذہب شافعی تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عیسائی اور یہودی قومیں اکثر بغاوت کرتی رہیں۔

اس موقع پر بتا دینا بھی ضروری ہے کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں ذمیوں کے متعلق چند ایسے احکام بھی مذکور ہیں جو نہایت سختی اور تنگدلی پر مبنی ہیں اور چونکہ وہ اس طریقہ سے ظاہر کئے گئے ہیں کہ گویا وہ خاص امام ابوحنیفہ کے مسائل ہیں اس لیے غیر قوموں کو مذہب حنفی پر بلکہ عموماً مذہب اسلام پر حملہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ ذمیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ وضع اور لباس میں مسلمانوں کی ہمسری نہ کریں۔ وہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں۔ ہتھیار نہ لگائیں۔ زنا پہنیں، ان کے گھروں پر علامت بنا دی جائے جس سے ظاہر ہو کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں وغیرہ وغیرہ۔ صاحب ہدایہ نے ان احکام کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ذمیوں کی تحقیر ضروری ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں اس سے بھی زیادہ سخت و بے رحمانہ احکام ہیں لیکن یہ جو کچھ ہے متاخرین فقہاء کی ایجاد ہے ورنہ امام ابوحنیفہ کا دامن اس داغ سے پاک ہے۔

امام ابوحنیفہ سے جو کچھ اس بات میں مروی ہے وہ صرف اس قدر [1] ہے کہ ذمی زنار باندھیں اور ایسے زین پر سوار ہوں جن کی شکل ہتھیلی کی سی ہوتی ہے البتہ قاضی ابویوسف [2] نے بعض اور احکام اس پر بڑھائے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ذمی مسلمانوں کے ساتھ وضع قطع لباس سواری میں مشابہت نہ اختیار کریں اور لمبی ٹوپیاں اوڑھیں اور ان کے زین کے آگے گول لکڑی ہو اور ان کی جوتیوں کے تسمے دوہرے ہوں اور ان کی عورتیں کجاوں پر سوار نہ ہوں قاضی صاحب نے یہ بھی لکھا کہ حضرت عمرؓ نے ذمیوں کے بارے میں یہی احکام صادر فرمائے تھے اور اس کی وجہ خود حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ذمیوں کی وضع مسلمانوں کی وضع سے الگ رہے۔

بلاشبہ یہ حضرت عمرؓ کے احکام ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکلنا کہ یہ احکام ذمیوں کی تحقیر کی وجہ سے صادر ہوئے تھے۔ سخت غلطی ہے اگرچہ افسوس ہے کہ اس غلطی کا ارتکاب اکثر متاخرین فقہا نے کیا ہے، بے شبہ حضرت عمرؓ کا ایک طبعی ذوق تھا کہ وہ قومی امتیاز کو پسند کرتے تھے انہوں نے اہل فوج کے لیے اکثر فرمانوں میں لکھا ہے کہ وہ جاڑوں میں دھوپ کھانا نہ چھوڑیں، گھوڑوں پر رکاب کے سہارے سے سوار نہ ہوں موٹے کپڑے استعمال کریں جس سے مقصد یہ تھا کہ اہل

---

[1] دیکھو جامع صغیر امام محمد [2] قاضی ابویوسف صاحب نے یہ احکام کتاب الخراج میں لکھے ہیں۔

عرب اپنے ملک اور وطن کی خصوصیتوں کو محفوظ رکھیں۔ اسی بناء پر انہوں نے اہل عجم کو جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا، تاکید کی کہ وہ اپنی قومی خصوصیتوں کو ضائع نہ ہونے دیں۔ اہل عجم زمانہ اسلام سے پہلے زنا باندھتے تھے، لمبی لمبی ٹوپیاں[1] اوڑھتے تھے۔ ان کے زین آج کل کے انگریزی زینوں کے مشابہ ہوتے تھے، ان کی عورتیں اونٹوں پر نہیں سوار ہوتی تھیں، چنانچہ انہی رسوم و عادات کی نسبت حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ ذمہ اس کی پابندی کریں یہی احکام ابو حنیفہؒ اور قاضی ابو یوسف نے قائم رکھے، جس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ دونوں قومیں ن اپنی اپنی خصوصیات پر قائم رہیں۔

البتہ امام ابو حنیفہ نے یہ حکم دیا کہ اہل ذمہ اسلامی شہروں میں اپنی عبادت گاہیں نہ بنائیں لیکن اس کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ امن و امان میں خلل نہ ہو اور مسلمان رعایا جو اکثر عرب کی نسل سے تھی اور ناقوس کی صداؤں سے ان کے کان آشنا نہ تھے، فساد پر آمادہ نہ ہوں اس حکم نے ذمیوں کے حق میں چنداں دقت بھی نہیں پیدا کی۔ مسلمانوں نے جو شہر آباد کئے وہ دو چار شہر سے زیادہ نہ تھے۔ باقی تمام ملک انہی شہروں سے معمور تھا جو غیر قوموں کے آباد کئے ہوئے تھے اور جہاں ذمیوں کو عموماً عبادت گاہوں کے بنانے کی اجازت تھی۔ اسلامی شہروں میں بھی یہ قید اس وقت تک قائم رہی، جب تک فتنہ کا احتمال رہا۔ جب یہ خوف جاتا تو ذمیوں کو عام اجازت مل گئی۔ چنانچہ بغداد میں جو خاص اسلامی شہر تھا سینکڑوں چرچ اور گرجے تعمیر ہوئے۔

۵:۔ ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو احکام نصوص سے ماخوذ ہیں اور جن میں ائمہ کا اختلاف ہے، ان میں امام ابو حنیفہ جو پہلو اختیار کرتے تھے وہ عموماً نہایت قوی اور مدلل ہوتا ہے۔

نص کا لفظ قرآن اور حدیث دونوں پر طلاق کیا جاتا ہے اور اس لحاظ سے وہ احکام بھی نصی کہے جاتے ہیں جو قرآن سے نہیں بلکہ صرف حدیث سے ثابت ہیں لیکن اس موقع پر ہم ان سے بحث نہیں کر سکتے اور اس کے مختلف وجوہ ہیں

اول یہ کہ اس قسم کے مسائل نہایت کثرت سے ہیں جن کا مختصر سے مختصر حصہ بھی اس کتاب میں نہیں آ سکتا، اگر چند مسائل نمونہ کے طور پر بیان کئے جائیں تو بدگمانوں کو اس سوء ظن کا

---

[1] خلیفہ منصور نے اپنے درباریوں کو اس قسم کی ٹوپیوں کے اوڑھنے پر مجبور کیا تھا، جس کی نسبت مورخین لکھتے ہیں کہ منصور نے عجم کی تقلید کی۔

موقع باقی رہتا ہے کہ چندقوی مسائل لے لیے اور ضعیف چھوڑ دیے، دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ آج ان مسائل کا فیصلہ مجتہدانہ نہیں ہوسکتا، حدیث کے متعلق بہت بڑی بحث صحت و عدم صحت کی پیدا ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے مسائل فقہ میں ائمہ کو مختلف الآرا کر دیا۔ ایک امام نے نزدیک ایک حدیث قابل حجت ہے اور دوسرے کے نزدیک نہیں۔ اس بحث کے تصفیہ کے لیے جو سامان ہمارے ملک میں موجود ہے وہ بالکل ناکافی ہے اور اس سے کسی حدیث کی نسبت مجتہدانہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، بڑا مرحلہ اسماء الرجال کا ہے، اس فن کی جو کتابیں ہمارے ملک میں موجود ہیں، مثلاً تہذیب الکمال مزنی، تہذیب التہذیب، میزن الاعتدال الحفاظ، تہذیب الاسماء واللغات وغیرہ، ان میں جرح و تعدیل کے متعلق ائمہ کچھ اقوال مذکور ہیں اکثر ان کا سلسلہ سند مذکور نہیں، اس لئے محدثانہ حیثیت سے اس کے ثبوت و عدم ثبوت کا تصفیہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ اکثر جروح مبہم ہیں اور جن جرحوں کو مفسر قرار دیا ہے وہ بھی ابہام سے خالی نہیں۔ قدماء نے اس فن میں جو تصنیفات لکھیں، ان سے بلاشبہ یہ مباحث طے ہو سکتے ہیں لیکن وہ یہاں سیر نہیں آئیں۔ علمائے حنفیہ نے خاص اس بحث پر کہ حنفی فقہ کے مسائل احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جس کو زیادہ شوق ہو ان تصنیفات کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

لیکن قرآن مجید میں اس بحث کا بڑا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن کے ثبوت میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا اس لیے نزاع کا مدار صرف اس پر رہ جاتا ہے کہ جو مسئلہ اس سے مستنبط کیا گیا صحیح طور پر کیا گیا یا نہیں؟ اس حالت میں بحث مختصر رہ جاتی ہے اور نہایت آسانی سے اس کا تصفیہ ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید سے جو احکام ثابت ہیں ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اور وہ فقہ کے مہمات مسائل ہیں اس لیے اگر یہ ثابت ہو کہ حنفی فقہ کے مسائل نصوص قرآن سے زیادہ مطابق ہیں تو مہمات مسائل میں فقہ حنفی کی ترجیح بآسانی ثابت ہو جائے گی اس کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ امام ابوحنیفہ کو حیثیت اجتہاد میں تمام ائمہ پر ترجیح ہے، کیونکہ اجتہاد کا مدار زیادہ تر استنباط اور استخراج ہی پر ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر اگرچہ ہم صرف ان مسائل پر اکتفا کرتے ہیں جو قرآن سے ثابت ہیں تاہم حدیث کے متعلق ایک اجمالی بحث ضرور ہے جس سے بدگمانوں کو سوءِ ظن کا موقع نہ ہو، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امام صاحب کے بہت سے مسائل احادیث صحیحہ کے مخالف

ہیں۔ ان لوگوں میں سے بعض نے الزام دیا ہے کہ امام صاحب نے دانستہ حدیث کی مخالفت کی، بعض انصاف پسند وجہ یہ بتاتے ہیں کہ امام صاحب کے زمانہ تک احادیث کا استقصاء نہیں کیا گیا تھا اس لئے بہت سے حدیثیں ان کو نہیں پہنچیں لیکن یہ خیال لغو اور بے سرو پا ہے امام صاحب کے زمانہ تک تو حدیثیں جمع نہیں ہوئی تھیں، لیکن جب جمع ہو چکیں اس وقت بڑے بڑے محدثین ان کے مسائل کو کیوں صحیح تسلیم کرتے رہے۔ وکیع بن الجراح جن کی روایتیں صحیح بخاری میں بکثرت موجود ہیں اور جن کی نسبت امام احمد بن حنبل کہا کرتے تھے کہ میں نے ان سے بڑھ کر کسی کو حافظ العلم نہیں دیکھا وہ امام ابوحنیفہ کے مسائل کی تقلید کرتے تھے۔ خطیب بغدادی نے ان کے متعلق لکھا ہے **کان یفتی بقول ابی حنیفة** [1] یحییٰ بن سعید بن القطان جو فن جرح وتعدیل کے موجد ہیں۔ اکثر مسائل میں امام ابوحنیفہ کے پیرو تھے خود ان کا قول ہے **قد اخذنا باکثر اقواله** [2] امام طحاوی جو حافظ الحدیث تھے اور مجتہد فی المذہب کا درجہ رکھتے تھے، پہلے شافعی تھے پھر ابوحنیفہ کے مسائل اختیار کیے۔ اور کہا کہ میں ابوحنیفہ کا مقلد نہیں ہوں بلکہ مجھ کو ان سے توارد ہے۔ طحاوی امام بخاری اور مسلم کے ہمعصر تھے اور یہ وہ زمانہ ہے جب حدیث کا دفتر کامل طور سے مرتب ہو گیا تھا متاخرین میں علامہ ماردینی، حافظ زیلعی، ابن الہمام، قاسم بن قطلوبغا وغیرہم کی نسبت قلت نظر کا کون گمان کر سکتا ہے؟ یہ لوگ عموماً حنفی مسائل کے حامی ہیں۔

اس کے علاوہ جو لوگ حافظ الحدیث تسلیم کیے گئے ہیں ان کے مسائل ابوحنیفہ سے کیوں موافق ہیں۔ طبقہ اولیٰ میں سب سے بڑے محدث امام احمد بن حنبلؒ ہیں جن کی شاگردی پر امام بخاری ومسلم کو ناز تھا اور جن کی نسبت محدثین کا عام قول ہے کہ جس حدیث کو احمد بن حنبلؒ نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں'' امام احمد بن حنبل بہت سے مسائل میں امام شافعی کے مخالف اور امام ابوحنیفہ کے موافق ہیں۔ خوارزمی نے لکھا ہے کہ '' فروع وجزئیات چھوڑ کر امہات فقہ کے متعلق ایک سو پچیس مسئلوں میں ان کو امام ابوحنیفہ کے ساتھ اتفاق اور امام شافعی سے اختلاف۔'' ہم نے خود بہت سے مسائل میں تطبیق کی ہے جس سے خوارزمی کے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ سفیان ثوری کو محدثین نے امام الحدیث تسلیم کیا ہے، ان کے مسائل امام ابوحنیفہ کے مسائل کے موافق ہیں۔ قاضی ابو یوسف کہا کرتے تھے کہ **واللہ سفیان اکثر متابعة منی**

---

[1] مختصر تاریخ بغداد لابن جزلہ ترجمہ وکیع بن الجراح [2] تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر ترجمہ امام ابوحنیفہؒ۔

لا بی حنیفة [1] خدا کی قسم سفیان مجھ سے زیادہ ابوحنیفہ کی پیروی کرتے ہیں۔'' صحیح ترمذی میں سفیان ثوری کے مسائل مذکور ہیں جو زیادہ تر شافعی کے مخالف اور ابوحنیفہؒ کے موافق ہیں۔

اس خیال کے پیدا ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض محدثین مثلاً امام بخاری، ابن ابی شیبہ نے امام ابوحنیفہ کے متعدد مسائل کی نسبت تصریح کی ہے کہ حدیث کے خلاف ہیں ،ابن ابی شیبہ نے امام ابوحنیفہ کے رد میں ایک مستقل باب لکھا ہے۔لیکن یہ خیال کرنے والوں کی کوتاہ نظری ہے،اکثر ائمہ نے ایک دوسرے پر جرح اور اعتراض کیا ہے امام شافعی امام مالک کے مخلص شاگرد تھے اور کہا کرتے تھے کہ'' آسمان کے نیچے موطائے امام مالک سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں۔'' باوجود اس کے انہوں نے امام مالکؒ کے رد میں ایک مستقل رسالہ لکھا۔جس میں دعویٰ کیا ہے کہ امام مالک کے بہت سے مسائل احادیث صحیحہ کے خلاف ہیں، امام رازی نے مناقب الشافعی میں اس رسالہ کا دیباچہ نقل کیا ہے اور خود ہی ہماری نظر سے گزرا ہے۔لیث بن سعد جو مشہور محدث ہیں، کہا کرتے تھے کہ امام مالک نے ستر مسئلوں میں حدیث کی مخالفت کی ہے۔ چنانچہ میرا ارادہ ہے کہ میں ان کو اس امر کی نسبت خط لکھوں۔امام شافعی بھی اس اعتراض سے نہیں بچے اور کیونکر بچ سکتے تھے، جہر بسم اللہ وقنوت فی الفجر و ترک توریث ذوی الارحام وغیرہ مسائل میں ان کا مذہب صریح حدیثوں کے مخالف معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اجتہادی امور میں انکی بناء پر ہم کسی کو مخالف حدیث نہیں کہہ سکتے۔جس حدیث کو ایک مجتہد صحیح سمجھتا ہے ضروری نہیں کہ وہ دوسرے مجتہد کے نزدیک بھی صحیح ہو۔

پھر اس مرحلے کے طور ہونے کے بعد استنباط و استدلال کی بحث باقی رہتی ہے۔جس میں مجتہدین بہت کم متفق الرائے ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ استنباط اور استدلال کے اصول جداگانہ ہیں، امام بخاری کا جزء القراۃ ہم نے دیکھا ہے، جامع صحیح میں جہاں وہ حضرت ابوحنیفہؒ کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس سے بھی ہم واقف ہیں۔ بے شبہ ان مسئلوں میں امام بخاری کا دعویٰ ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب حدیث کے مخالف ۔ہے لیکن امام بخاری کی تحریر امام ابوحنیفہ کا فتویٰ دونوں ہمارے سامنے ہیں اور ہم خود سمجھ سکتے ہیں کہ ان مسائل میں امام صاحب کا مذہب حدیث کے مخالف ہے یا امام بخاری کے فہم و اجتہاد کے مخالف ہے۔

قرأت فاتحہ کے مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کا استدلال اس آیت پر ہے''**وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا**'' امام بخاری جزء القراٗہ میں فرماتے ہیں کہ یہ آیت خطبہ کے بارے میں

---

[1] اس قول کو حافظ ابوالمحاسن نے قلائد العقیان میں نقل کیا ہے۔

اتری ہے۔یعنی نماز سے اس کو تعلق نہیں۔امام بخاری کا یہ جواب کس قدر حیرت انگیز ہے اگر رسالہ جزء القراۃ خود ہماری نظر سے نہ گزرا ہوتا تو ہم کو مشکل سے یقین آتا کہ واقعی یہ امام بخاری کا قول ہے اول تو بیسیوں روایتوں سے ثابت ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں اتری ہے۔لیکن اگر ہم ان ہی کے قول کو تسلیم کریں تو یہ کون نہیں جانتا کہ موقع ورود کے خاص ہونے سے آیت کا حکم جو صریحی عام ہے خاص نہیں ہو سکتا۔

ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ امام اور مقتدی کو آمین آہستہ کہنی چاہیے۔امام بخاری برخلاف اس کے جہر کے قائل ہیں اور دلیل یہ لاتے ہیں کہ آنحضرت (صلعم) نے فرمایا کہ جب امام وَلاَ الضَّآلِّیْن کہے تو تم آمین کہو۔" لیکن اس حدیث میں جہر کا کہاں ذکر ہے اور مطلق آمین کہنے سے تو امام ابوحنیفہ کو بھی انکار نہیں۔امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ نبیذ تمر سے بشرطیکہ مسکر نہ ہو وضو جائز ہے امام بخاری اس کے خلاف ترجمۃ الباب باندھتے ہیں اور حدیث نقل کرتے ہیں کہ کل ما اسکر حرام۔

امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ مقتدی کے لیے قرأت فاتحہ ضروری نہیں۔امام بخاری وجوب کے مدعی ہیں اور جامع صحیح میں باب باندھا ہے کہ امام و مقتدی پر ہر نماز میں خواہ سفر میں ہو خواہ حضر میں، نماز خواہ جہری ہو، خواہ سری، قرأت واجب ہے اس دعویٰ پر دو حدیثیں پیش کی ہیں ایک یہ کہ کوفہ والوں نے حضرت عمرؓ کے پاس سعد بن ابی وقاص کی شکایت کی، حضرت عمرؓ نے ان کو معزول کر دیا اور بجائے ان کے عمارؓ کو مقرر کیا۔کوفہ والوں کو شکایت یہ تھی کہ سعد کو تو نماز پڑھنی بھی نہیں آتی۔حضرت عمرؓ نے ان کو بلا بھیجا اور ان سے کہا کہ ان لوگوں کا یہ گمان ہے۔سعدؓ نے کہا واللہ میں ان کے ساتھ رسول اللہ (صلعم) کی سی نماز پڑھتا تھا اور اس سے کچھ کم نہیں کرتا تھا۔میں عشاء کی نماز پڑھتا تھا تو پہلی دو رکعتوں میں دیر تک قیام کرتا تھا اور دو اخیر کی رکعتوں میں تخفیف کرتا تھا۔

اس حدیث سے قرأت فاتحہ کا وجوب کیونکر ثابت ہوا۔حافظ ابن حجر وغیرہ نے جو تاویلیں کی ہیں ان سے اگر بہزار وقت وجوب پر استدلال بھی ہو تو کیا اس کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے حدیث کی مخالفت کی۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی مجتہد کی نسبت یہ خیال کرنا کہ اس کو احکام کے متعلق حدیثیں نہیں پہنچیں، سخت غلطی ہے، لیکن چونکہ حدیثوں کا معیار صحت، وجوہ استنباط طرق استدلال تمام مجتہدین کے نزدیک متحد نہیں۔اس لیے مسائل میں اختلاف پیدا ہونا ضروری تھا۔

اب ہم اس ضمنی بحث کو چھوڑ کر اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ہمارا دعویٰ ہے

کہ قرآن مجید کی تمام آیتیں جن سے کوئی مسئلہ فقہی مستنبط کیا گیا ہے ان کے وہی معنی صحیح اور واجب العمل ہیں جو امام ابو حنیفہ نے قرار دیے ہیں، قرآن مجید میں احکام کی آیتیں سو سے متجاوز ہیں اس لیے ان کا تجزیہ تو نہیں کر سکتے البتہ مثال کے طور پر متعدد مسائل کا ذکر کرتے ہیں جن سے ایک عام اجمالی خیال قائم ہو سکتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے کہ وضو میں چار فرض ہیں، امام شافعی دو فرض اور اضافہ کرتے ہیں۔ یعنی نیت اور ترتیب، امام مالک بجائے ان کے موالاۃ کو فرض کہتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ کا مذہب ہے کہ وضو کے وقت بسم اللہ کہنا ضروری ہے اور اگر قصداً نہ کہا تو وضو باطل ہے، امام صاحب کا استدلال ہے کہ آیت میں صرف چار حکم مذکور ہیں اس لیے جو چیز ان احکام کے علاوہ ہے وہ فرض نہیں ہو سکتی، نیت و موالات و تسمیہ کا تو آیت میں کہیں وجود نہیں، ترتیب کا گمان البتہ داؤ کے حرف سے پیدا ہوتا ہے لیکن علمائے عربیت نے متفقاً طے کر دیا ہے کہ داؤ کے مفہوم میں ترتیب داخل نہیں۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں ترتیب کی فرضیت کے لیے متعدد دلیلیں پیش کی ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کا رتبہ تاویل سے بڑھ کر نہیں، بڑا استدلال یہ ہے کہ **فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ** میں حرف فا تعقیب کے لیے ہے جس سے اس قدر ضرور ثابت ہے کہ منہ کا پہلے دھونا فرض ہے اور جب ایک رکن میں ترتیب ثابت ہوئی تو باقی ارکان میں بھی ہونی چاہیے دوسری دلیل یہ لکھی ہے کہ وضو کا حکم خلاف عقل حکم ہے اس لیے اس کی تعمیل بھی اسی ترتیب سے فرض ہونی چاہیے جس طرح آیت میں مذکور ہے کیوں کہ وضو کا حکم جس طرح خلاف عقل ہے، ترتیب بھی خلاف عقل ہے امام رازی کی یہ دلیلیں جس رتبہ کی ہیں خود ظاہر ہیں اس پر رد و قدح کی ضرورت نہیں۔

امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ عورت کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ امام شافعیؒ اس کے مخالف ہیں اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ **وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا۔** "یعنی اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص غائط[1] سے آئے، یا تم نے عورت کو چھوا ہو اور تم کو پانی نہ ملے تو تم تیمم کر لو۔"

امام صاحب فرماتے ہیں کہ عورت کے چھونے سے جماع و مقاربت مراد ہے اور یہ قرآن مجید کا عام طرز ہے کہ ایسے امور کو صریحاً تعبیر نہیں کرتا۔" لطف یہ ہے کہ اس لفظ کا ہم معنی لفظ "مس"، جس کے معنی چھونے کے ہیں خدا نے اس آیت میں **مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ** جماع کے معنی میں استعمال کیا ہے اور خود امام شافعی تسلیم کرتے ہیں کہ وہاں جماع ہی مقصود ہے حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں ملامستہ کے ظاہری معنی لینے ایسی غلطی ہے جو ہرگز اہل زبان سے نہیں ہو سکتی۔ اس

[1] غائط کے معنی نشیب زمین کے ہیں، لیکن اس سے جاء ضرور یعنی پاخانہ مراد ہے۔

آیت میں غائط کا لفظ بھی تو ہے اس کو تمام مجتہدین کنایہ قرار دیتے ہیں ورنہ ظاہری معنی لئے جائیں تو لازم آئے کہ جو شخص نشیب زمین سے ہو کر آئے اس پر وضو کرنا واجب ہے۔

میری رائے میں اگرچہ امام شافعی کا یہ مذہب ہے کہ عورت کے چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن اس کا استدلال اس آیت پر نہیں ہے وہ حدیث سے استناد کرتے ہوں گے غالباً ان کے بعد ان کے مقلدوں نے حنیفہ کے مقابلے کے لیے آیت سے استدلال کیا اور اس کو امام شافعی کی طرف منسوب کر دیا۔

امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ ایک تیمّم سے کئی فرض ادا ہو سکتے ہیں، امام مالک و امام شافعی کی رائے ہے کہ ہر فرض کے لیے نیا تیمّم کرنا چاہیے۔ امام صاحب کا استدلال ہے کہ جو حیثیت وضو کے حکم کی ہے وہی تیمم کی ہے اور جب ہر نماز کے لیے نئے وضو کی ضرورت نہیں تو تیمّم کی بھی تجدید کی ضرورت نہیں۔ البتہ جن لوگوں کا مذہب ہے کہ ایک وضو سے کئی نمازیں ادا نہیں ہو سکتیں، وہ تیمم کی نسبت بھی یہ حکم لگا سکتے ہیں لیکن وضو اور تیمّم میں تفریق کرنی جیسا کہ امام شافعی وغیرہ نے کی۔ محض بے وجہ ہے۔

امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ اثنائے نماز میں تیمّم کو اگر پانی مل جائے تو تیمّم جاتا رہے گا۔ امام مالک و امام احمد بن حنبلؒ اس کے مخالف ہیں امام صاحب کا استدلال یہ ہے کہ قرآن میں تیمم کا جواز اس قید کے ساتھ مشروط ہے کہ "لَمْ تَجِدُوا مَآءً" یعنی جب پانی نہ ملے صورت مذکورہ میں جب شرط باقی نہیں رہی تو مشروط بھی باقی نہیں رہا۔

امام صاحب کا قول ہے کہ تکبیر تحریمہ جزو نماز نہیں اور فارسی زبان میں تکبیر کہنا درست ہے، امام شافعی وغیرہ مخالف ہیں، امام صاحب کا استدلال ہے کہ جس آیت سے تکبیر کی فرضیت ثابت کی گئی ہے یعنی وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى۔ اس میں زبان کی کوئی خصوصیت نہیں اور چونکہ فَصَلّٰى پر فائے تعقیب داخل ہے اس لیے نماز کا وجود تکبیر سے مؤخر ہونا ضروری ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تکبیر گو فرض ہے لیکن نماز میں داخل نہیں اور جزو نماز نہیں۔

امام صاحب کا مذہب ہے کہ مقتدی کو قرأت فاتحہ ضروری نہیں، امام شافعی و امام بخاری وجوب کے قائل ہیں، امام صاحب اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو سنو اور چپکے رہو۔ اگرچہ اس آیت سے سری نمازوں میں بھی ترک قرأت کا حکم ثابت ہوتا ہے لیکن خاص کر جہری نماز کے لیے تو وہ نص قاطع ہے جس کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی۔ تعجب ہے کہ شافعیہ نے ایسی صاف اور صریح آیت کے مقابلہ میں

حدیثوں سے استدلال کیا ہے۔ حالانکہ حدیثیں جو اس باب میں وارد ہیں خود متعارض ہیں جس درجہ کی وجوب قرأت کی حدیثیں موجود ہیں اسی درجہ کی ترک قرأت کی بھی ہیں۔

امام بخاری نے اس بحث میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ آیت کے استدلال کا جواب دیں لیکن جواب ایسا دیا ہے جس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ یعنی سوائے اس کے نہیں ہے کہ حرام کیا خدا نے تم پر مردہ کو اور خون کو اور سور کے گوشت کو اور اس چیز کو جس پر خدا کے سوا کسی دوسرے کا نام لیا جائے بشرطیکہ نافرمان اور حد سے گزر جانے والا نہ ہو تو اس پر گناہ نہیں۔ اس آیت سے بہت سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں جن میں مجتہدین کو باہم اختلاف ہے ان تمام مختلف فیہ مسائل میں امام ابوحنیفہ نے آیت کا جو مطلب قرار دیا ہے وہی صحیح ہے۔

پہلی بحث یہ ہے کہ مردہ کے کیا معنی ہیں؟ امام ابوحنیفہ وہی عام معنی لیتے ہیں جو عام اطلاق میں شائع ہے۔ امام شافعی نے اس کی وسعت دی ہے، یہاں تک کہ وہ مردہ جانوروں کے بالوں اور ہڈیوں کو بھی مردہ کہتے ہیں، اس بناء پر ان کی رائے ہے کہ ان چیزوں سے کسی قسم کا تمتع مثلاً پوستین وغیرہ کا استعمال جائز نہیں، امام مالک بال اور کھال کا کام میں لانا جائز قرار دیتے ہیں لیکن ہڈی کا استعمال ان کے نزدیک بھی حرام ہے۔

امام شافعی اور امام مالک نے مردہ کے جو معنی لیے ہیں چونکہ صاف غلط معلوم ہوتے ہیں، اس لئے ان کے مقلدوں نے تاویلیں کیں امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ ہڈی کو مردہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ خدا نے قرآن میں فرمایا ہے **مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ** "یعنی ہڈی کو کون زندہ کرے گا۔" اور زندہ وہی چیز ہو سکتی ہے جو پہلے مر چکی ہو۔ اس طرح خدا نے زمین کو مردہ کہا ہے۔ امام رازی کی یہ تاویل نہایت تعجب خیز ہے، اس قسم کے اطلاقات مجازی اطلاق ہیں جن پر احکام کی تفریع نہیں ہو سکتی، امام رازی نے زمین کا مردہ ہونا قرآن مجید سے ثابت کیا ہے تو زمین اور خاک کے استعمال کو بھی ناجائز قرار دینا چاہیے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ خون جس کو اس آیت میں حرام کہا ہے اس سے مراد کیا ہے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ دم مسفوح ہے، یعنی جس خون میں روانی ہو، اسی بنا پر وہ مچھلی کے خون کو حرام نہیں کہتے امام شافعی کے نزدیک اس میں کوئی تخصیص نہیں اور ہر قسم کا خون حرام ہے امام صاحب کا استدلال یہ ہے کہ یہ تخصیص خود خدا نے کی ہے چنانچہ دوسرے موقع پر فرمایا ہے۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا

مَّسْفُوْحاً ،اس آیت میں خون کی تحریم کو مسفوح کے ساتھ مقید کر دیا ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ باغٍ وَّعادٍ سے کیا مراد ہے، امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ کھانے میں بغاوت وعدوان نہ ہو، یعنی جو شخص مجبور ہو اور جاں بلب ہو اس کو مردہ و سور کا گوشت کھانا جائز ہے لیکن اس شرط پر کہ سدرمق سے زیادہ نہ کھائے اور کسی دوسرے مضطر سے چھین کر نہ کھائے۔امام شافعی بغاوت اور عدوان کے معنی یہ لیتے ہیں کہ اس شخص نے سلطان وقت سے بغاوت نہ کی ہو اور گنہگار نہ ہو۔اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان شخص جو سلطان وقت سے باغی ہو کسی موقع پر فاقہ سے جاں بلب ہو جائے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کو مردہ یا سؤر کا گوشت بقدر سدرمق کے کھانا جائز ہے۔بخلاف اس کے امام شافعی کا قول ہے کہ اگر وہ باغی نہ ہوتا تو کھانا جائز تھا لیکن بغاوت کی حالت میں اس کو یہ اجازت نہیں مل سکتی۔

امام شافعی نے ان الفاظ کے جو معنی لئے اولاً تو سیاق عبارت سے بالکل بیگانہ ہیں، دوسرے اصول شرع اسکی مساعدت نہیں کرتے شریعت نے ضرورت کے وقت جن چیزوں کی رخصت یا اجازت دی ہے وہ کسی جرم وعصیان سے باطل نہیں ہوتی، جھوٹ بولنا گناہ ہے اور بعض حالتوں میں مثلاً جب جان کا خوف ہو اسکی اجازت دی گئی ہے کیا ایک گنہگار شخص اس اجازت سے متمتع نہیں ہوسکتا، صورت متنازعہ میں اگر اس شخص کو اس لیے کھانے کی اجازت نہیں دی گئی کہ اس کا ہلاک ہونا ہی بہتر ہے تو حرام کی کیا تخصیص ہے اس کے لیے تو حلال غذا کی بھی اجازت نہ ہونی چاہیے۔

یہ مسائل تو نصی تھے۔امام ابوحنیفہ نے اس آیت سے ایک قیاسی مسئلہ قائم کیا ہے۔اور امام شافعی نے اس سے مخالفت کی ہے یعنی ایک شخص پیاس سے جاں بلب ہو اور شراب کے او: کوئی چیز نہ مل سکے تو اس کو شراب پینے کی اجازت ہے یا نہیں؟ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہے اور امام شافعی کے نزدیک نہیں۔امام شافعی اگر اہل ظواہر کی طرح قیاس کے منکر ہوتے تو اس جواب سے کچھ تعجب نہ ہوتا لیکن قیاس کے قائل ہو کر یہ مخالفت محل تعجب ہے کیونکہ یہ حالت اور جس حالت کا ذکر قرآن میں صریحاً ہے دونوں کی علت مشترک ہے یعنی حفاظت نفس پر حکم کے نہ مشترک ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔باب الجنایات کے باب میں جو احکام قرآن مجید وارد ہیں ان کی تعبیر جس صحت کے ساتھ امام ابوحنیفہ نے کی کسی دوسرے مجتہد نے نہیں کی۔زمانہ جاہلیت میں قصاص کے جو قاعدے رائج تھے نہایت ناانصافی اور جہالت پر مبنی تھے۔اسلام نے نہایت خوبی سے اس کی اصلاح کی اور ایسے احکام مقرر کیے جن سے بڑھ کر نہ کبھی ہوئے نہ ہوسکتے تھے۔

جاہلیت میں قصاص کا اعتبار مقتول وقاتل کی حیثیت سے کیا جاتا تھا۔جو معزز قبیلے تھے وہ دوسرے قبیلوں سے اس طرح قصاص لیتے تھے کہ اپنے غلام کے بدلے دوسرے قبیلہ کے آزاد

کو اپنی عورت کے بدلے ان کے مرد کو اپنے مرد کے بدلے دوسرے قبیلہ کے دو مردوں کو قتل کرتے تھے۔ خدا نے قصاص کا عام حکم صادر فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ قصاص کا حکم کسی قید کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ قاتل ہر حالت میں مقتول کے بدلے مارا جائے گا۔ خواہ شریف ہو یا رذیل مرد ہو یا عورت، غلام، ہو یا آزاد، مسلم ہو یا ذمی زیادہ توضیح کے لئے ان صورتوں کی خاص طور پر بھی نفی کی جو عرب میں اسلام سے پہلے جاری تھیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ:۔

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی

تم پر مقتول کے بارے میں قصاص فرض کیا گیا آزاد، آزاد کے بدلے، غلام، غلام کے بدلے عورت، عورت کے بدلے

زمانہ جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ قتل عمد کے بدلے میں مالی معاوضہ دے دینا کافی سمجھا جاتا تھا اور اس کو دیت کہتے تھے۔ اسلام نے اس کو باطل کیا اور دیت کو جو ایک قسم کا جرمانہ ہے صرف شبہ عمد اور قتل خطا کی حالت میں جائز رکھا اور اس کی مقدار مسلمان و ذمی کے لئے یکساں مقرر کی چنانچہ خدا نے ارشاد فرمایا:۔

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ یَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰی اَهْلِهٖ اِلَّا اَنْ یَّصَّدَّقُوْا فَاِنْ کَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّکُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَاِنْ کَانَ مِنْ قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ فَدِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰی اَهْلِهٖ وَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ۔

اور مسلمان کی شان نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو قتل کرے، مگر غلطی سے اور جو کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کرے تو اس کو ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اور مقتول کے اہل کو دیت دینی ہوگی مگر یہ کہ معاف کریں۔ پھر اگر مقتول ان لوگوں میں کا ہو جو تم مسلمانوں کے دشمن ہیں اور وہ خود مسلمان ہو تو ایک مسلمان بردہ آزاد کرنا ہوگا۔ اور اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ تمہارے اور ان کے درمیان میثاق ہے تو مقتول کے اہل کو دیت دینی ہوگی اور ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہوگا (نساء ۱۳)

قوم سے ہو کر تمہارے اور ان کے درمیان میثاق ہے تو مقتول کے اہل کو دیت دینی ہوگی اور ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہوگا۔ (نساء ۱۳)

یہ احکام نہایت صاف اور صریح طور پر قرآن سے ثابت ہوتے ہیں اور امام ابو حنیفہ انہی احکام کے قائل، لیکن امام شافعیؒ وغیرہ نے بعض مسائل میں اختلاف کیا ہے جس کی نسبت ہم افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ یقیناً ان کی غلطی ہے۔

پہلا اختلاف یہ ہے کہ امام شافعیؒ و امام مالکؒ و امام احمد بن حنبلؒ قائل ہیں کہ غلام کے بدلے آزاد قتل نہیں کیا جا سکتا، غلام اور آزاد میں ایسا بے رحمانہ تفرقہ کرنا ہر گز قرآن سے ثابت نہیں ہوتا، اگر الْحُرُّ بِالْحُرِّ کی تخصیص سے استدلال ہے تو الْاُنثٰی بِالْاُنثٰی کی تخصیص سے لازم آتا ہے کہ عورت کے بدلے مرد نہ قتل کیا جائے۔ حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔

دوسرا اختلاف یہ ہے کہ امام شافعیؒ ذمی کی دیت مسلمان دیت سے کم قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ دیت کے جو الفاظ خدا نے مومن کے حق میں استعمال کئے وہی ان لوگوں کے حق میں بھی ارشاد کئے جو مسلمانوں سے میثاق و معاہدہ رکھتے ہیں۔ بے شبہ یہ اسلام کی نہایت فیاض دلی ہے کہ اس نے مسلمان و ذمی کا حق برابر رکھا۔ لیکن افسوس ہے ایسے فیاضانہ حکم کی لوگوں نے غلط تاویل کی۔

تیسرا اختلاف یہ ہے کہ امام شافعی قتل عمد کی حالت میں بھی مالی معاوضہ ادا کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید میں قتل عمد کی حالت میں قصاص کا حکم ہے۔ دیت کی کہیں اجازت نہیں اور یہی اقتضائے عقل ہے۔ جاہلیت میں قتل مقدمات دیوانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس وجہ سے مالی معاوضہ اس کا بدل ہو سکتا تھا۔ لیکن اسلام ایسی غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔

چوتھا اختلاف یہ ہے کہ امام شافعی کیفیت قتل میں مساوات کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ یعنی قاتل نے پتھر سے سر پھوڑ کر کسی کو مارا ہو تو وہ بھی پتھر سے سر توڑ کر مارا جائے یا کسی نے آگ سے جلا کر مارا ہو تو وہ بھی آگ سے جلا کر مارا جائے۔ لیکن اس قسم کی مساوات پر قرآن کا کوئی لفظ دلالت نہیں کرتا۔

پانچواں اختلاف یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک قتل عمد کی حالت میں کفارہ لازم نہیں آتا۔ امام شافعیؒ قصاص و کفارہ دونوں لازمی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید میں کفارہ کا حکم قتل خطاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ قتل عمد میں کفارہ کا کچھ ذکر نہیں ہے۔

وراثت کے بعض احکام میں جو نہایت مہتم بالشان ہیں امام ابو حنیفہ اور امام شافعی میں اختلاف ہے۔ ان مسائل میں ابو حنیفہ نے جو پہلو اختیار کیا وہ نہایت صریح طور سے قرآن سے ثابت ہوتا ہے۔ وراثت کے قاعدے جو اسلام نے مقرر کئے ہیں وہ تمام دنیا کے قواعد وراثت

سے الگ ہیں اور ایسے دقیق اور نازک اصولوں پر مبنی ہیں جو علانیہ اس بات کی دلیل ہیں کہ خدا کے سوا اور کوئی ان حکام کا واضع نہیں ہوسکتا وراثت کا اصلی اصول یہ ہے کہ متوفی اگر اپنی جائداد کسی خاص شخص کو دے جاتا۔ تو اسی کو ملتی۔ لیکن جب اس نے کوئی ہدایت نہیں کی تو اس پر لحاظ ہوگا کہ اس کے فطری تعلقات کن کن لوگوں کے ساتھ کس کس تفاوت کے ساتھ تھے۔ جو لوگ یہ تعلقات رکھتے ہیں وہ اسی تفاوت درجات کے ساتھ اس کی جائداد کے مالک ہوں گے۔ گویا متوفی کی یہ معنوی ہدایت ہے کہ لوگوں کو اسی مناسبت سے دیا جائے جن نسبت سے میرے تعلقات ان کے ساتھ تھے، دوسرا اصول جو سیاسی تقسیم زر کا عام اصول ہے کہ دولت کا بہت سے اشخاص میں تقسیم ہونا اس سے اچھا ہے کہ وہ ایک شخص تک محدود رہے۔ یہ عمدہ اصول اور قوموں کی نگاہ سے رہ گئے اور اس وجہ سے ان کا قانون وراثت بھی ناتمام اور محدود رہ گیا۔ عیسائیوں کے قانون میں بڑے بیٹے کو جائداد پہنچتی ہے۔ دوسرے بھائیوں کو کچھ دست برداشتہ ملتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں صرف اولادِ ذکور جائداد کی مالک ہے۔ باپ بھائی وغیرہ محروم مطلق ہیں۔ لیکن اسلام نے نہایت وقت نظر سے ان نازک تعلقات پر نگاہ کی جو ورثہ کے متوفی کے ساتھ ہیں اور اسی نسبت سے تین درجے قرار دیئے۔ ذوی الفروض، عصبات، ذوی الارحام، ان تینوں درجوں کی تصریح قرآن مجید میں موجود ہے۔ اور خاص کر ذوی الارحام کا ذکر ان آیتوں میں ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَى بِبَعْضٍ۔

امام ابوحنیفہ نے توریت کے احکام میں یہ تینوں مراتب قائم رکھے۔ لیکن امام شافعی و امام مالک نے ذوی الارحام کو سرے سے خارج کردیا۔ چنانچہ ان کے نزدیک نانا، بھتیجہ، بھانجے وغیرہ کسی حال میں وراثت نہیں پاسکتے۔ ان بزرگوں نے ذوی الارحام کو عام سمجھا ہے اور ذوی الفروض وعصبات اس کے افراد قرار دیئے ہیں۔ جیسا کہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ ایک صریح غلطی ہے۔

نکاح وطلاق کے متعلق قرآن میں بہت سے احکام مذکور ہیں جن میں سے بعض بعض میں مجتہدین مختلف الآرا ہیں، ان اختلافی مسائل میں دو مسئلے نہایت مہتم بالشان ہیں۔ اور ہم اس جگہ ان کا ذکر کرتے ہیں۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ امام شافعی کے نزدیک گو عورت بالغہ اور عاقلہ ہوتاہم کسی حالت میں بغیر ولی کی ولایت کے نکاح نہیں کرسکتی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک بالغہ عاقلہ اپنے نکاح کی آپ مختار ہے۔ اس دعویٰ پر دونوں طرف سے قرآن کی آیتیں اور حدیثیں پیش کی گئیں ہیں۔ احادیث کی بحث کا تو یہ محل نہیں۔ قرآن مجید سے امام شافعی کا استدلال ہے اور جس کو خود انہوں نے کتاب الام میں بڑے شدومد سے لکھا ہے وہ اس آیت پر مبنی ہے۔ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اور جب تم طلاق دو عورتوں کو اور وہ اپنی مدت کو پہنچیں تو ان کو اس بات سے نہ روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے نکاح کریں۔'' امام شافعی کہتے ہیں کہ تَعْضُلُوْهُنَّ میں اولیائے نکاح سے خطاب ہے۔ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ عورت کو نکاح سے نہ روکیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اولیائے نکاح کو روکنے کا حق حاصل ہے ورنہ نہی کی کیا ضرورت ہے۔ امام شافعی نے اس مطلب کی تائید میں آیت کی شان نزول کا ذکر کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ معقل بن یسار نے اپنی بہن کی شادی اپنے چچیرے بھائی سے کردی تھی۔ شوہر نے چند روز کے بعد طلاق دے دی۔ لیکن عدت گذر جانے کے بعد اس کو ندامت ہوئی اور اس نے دوبارہ نکاح کرنا چاہا۔ عورت بھی راضی ہوگئی۔ معقل نے سنا تو بہن کے پاس گئے اور کہا کہ میں نے نکاح کردیا تھا اس نے طلاق دے دی۔ اب میں کبھی اس سے نکاح نہ ہونے دوں گا۔ اس پر یہ آیت اتری''۔ امام شافعی نے اس آیت کے جو معنی لئے ہیں اگر ہم نے خود ان کی کتاب میں اس کو صریحاً نہ دیکھا ہوتا تو ہم کو مشکل سے یقین آتا کہ یہ انہی کا قول ہے۔

اول ہم کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ آیت کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں یا نہیں۔ اس قدر تو سب کے نزدیک مسلم ہے کہ طَلَّقْتُمُ میں شوہروں کی طرف خطاب ہے اور جب یہ مسلم ہے تو ضرور ہے تَعْضُلُوْهُنَّ میں بھی انہی کی طرف سے خطاب ہو۔ ورنہ عبارت بالکل بے ربط ہوگی۔ کیونکہ اس تقدیر پر آیت کا ترجمہ ہوگا کہ اے شوہرو جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی مدت کو پہنچیں تو اسے نکاح کے اولیاء تم ان عورتوں کو نکاح سے مت روکو۔'' اس عبارت کی بے ربطی میں کون شبہ کرسکتا ہے۔ شرط میں تو شوہروں سے خطاب ہوا اور جزا میں ان سے کچھ واسطہ نہ رہے۔ اور اولیائے نکاح سے تخاطب کیا جائے۔ یہ کون سا طریقۂ کلام ہے؟ امام رازی باوجودیکہ شافعی ہیں، تاہم انہوں نے تفسیر کبیر میں صاف تصریح کی ہے کہ یہ معنی بالکل غلط ہیں۔ اور خدا ایسی بے

ربط عبارت بول نہیں سکتا۔ اگر ہم یہ معنی بھی تسلیم کرلیں تو بھی امام شافعی کا استدلال تمام نہیں ہوتا کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ جو شخص ایک کام سے روکا جائے وہ اس کام کا حق بھی رکھتا ہو۔

اب ہم اس آیت کا محل بیان کرتے ہیں۔ جاہلیت میں دستور تھا کہ لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دیتے تھے اور اس غیرت سے کہ جو عورت ان کے ہم بستر رہ چکی ہے دوسرے کے آغوش میں نہ جانے پائے۔ اس عورت کو دوسرا نکاح بھی نہیں کرنے دیتے تھے، اس بری رسم کو خدا نے مٹایا۔ اور یہ آیت نازل کی جس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ اے شوہرو! جب تم عورت کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ چکیں تو ان کو اس بات سے نہ روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے (یعنی جن کو وہ اب شوہر بنانا چاہتی ہیں) نکاح کریں۔ امام ابوحنیفہ نے اس آیت کے یہی معنی لیے ہیں اور اس سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ عورتیں نکاح کے معاملے میں خود مختار ہیں۔ اس استدلال کی زیادہ تائید یَنکِحنَ کے لفظ سے ہوتی ہے کیونکہ اس لفظ میں نکاح کے فعل کو عورتوں کی طرف منسوب کیا ہے نہ اولیائے نکاح کی طرف۔ دوسرا مسئلہ تین طلاقوں کا ہے۔ اس قدر تو چاروں ائمہ مجتہدین کے نزدیک مسلم ہے کہ اگر کوئی شخص ایک بار تین طلاق دے تو طلاق واقع ہو جائے گی اور پھر رجعت نہ ہو سکے گی لیکن اس میں اختلاف ہے کہ اس طرح طلاق دینا جائز اور مشروع ہے یا نہیں امام شافعی کے نزدیک مشروع ہے اور خدا نے اس کی اجازت دی ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حرام اور ممنوع ہے اور طلاق دینے والا گنہگار ہے۔ امام ابوحنیفہ کا استدلال ہے کہ خدا نے جو طلاق کا طریقہ بتلایا ہے وہ اس آیت پر محدود ہے۔ **اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ** یعنی طلاق دو بار کر کے ہے۔ پھر یا تو بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے۔ یعنی رجعت کر لینا ہے یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔ پس اس آیت میں طلاق کا جو طریقہ بتایا گیا صرف وہی شرعی طلاق ہو سکتی ہے۔ بعض لوگوں نے امام ابوحنیفہ کے قول پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر ایک بار تین طلاق دینا شرعاً جائز نہیں تو اس کے نفاذ کے کیا معنی، حالانکہ نفاذ سے امام ابوحنیفہ کو بھی انکار نہیں۔ اس کا جواب ایک بڑی نازک بحث پر مبنی ہے جس کا یہ موقع نہیں، مگر اجمالاً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کسی کام کا ممنوع ہونا دوسری چیز ہے اور نافذ ہونا دوسری چیز ہے۔ باپ کا اولاد کو کم وبیش حصوں میں جائداد کا ہبہ کرنا شرعاً ممنوع ہے۔ لیکن اگر کوئی ناانصاف باپ ایسا کرے تو اس کا نفاذ ضرور ہوگا۔

اب ہم اب بحث کو ختم کرتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم امام ابوحنیفہ کی نسبت یہ عام دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے مسائل صحیح اور یقینی ہیں۔ امام ابوحنیفہ مجتہد تھے، پیغمبر نہ تھے، اس لئے ان کے مسائل میں غلطی کا ہونا ممکن ہے نہ صرف امکان بلکہ ہم وقوع کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ خود ان کے خاص شاگردوں نے بہت سے مسائل میں ان سے مخالفت کی۔ مدت رضاعت، قضا، قاضی کا ظاہراً و باطناً نافذ ہونا قتل بالمثل، نکاح محرمات میں حد کا نہ لازم آنا، ان تمام مسائل میں ہمارے نزدیک امام ابوحنیفہ کے مذہب کی کوئی صحیح تاویل نہیں ہو سکتی۔ ایسے اور بھی مسائل ہیں لیکن ہمارا مقصد اس موقع پر صرف یہ ہے کہ ایک مجتہد کا جس حد تک صائب الرائے ہونا ممکن ہے امام صاحب اس حد تک صائب الرائے تھے۔

خاتمہ

امام صاحب کے تلامذہ

ایشائی ملکوں میں اگرچہ شاگردی اور استادی کا تعقل عموماً نہایت قوی تعلق ہوتا ہے، لیکن بعض شاگردوں کو مختلف وجوہ سے کچھ ایسی خصوصیت ہو جاتی ہے کہ جہاں استاد کا نام آتا ہے ممکن نہیں کہ ان کا نام نہ آئے، جیسا کہ ہم اس کتاب کے پہلے حصہ میں لکھ آئے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے درس و تدریس کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ خلیفہ وقت کی حدود حکومت اس سے زیادہ وسیع نہ تھیں۔ حافظ ابوالمحاسن شافعی نے نوسو اٹھارہ شخصیتوں کے نام بقید نام و نسب لکھے ہیں جو امام صاحب کے حلقۂ درس سے مستفید ہوئے تھے اس گروہ میں سے چند بزرگ ایسے ہیں جن کی بیوگرانی کے بغیر امام صاحب کی علمی تاریخ ناتمام رہتی ہے۔

چالیس جو امام صاحب کے ساتھ فقہ کی ترتیب و تدوین میں شریک تھے۔ ان کے شاگرد اور ارادت مند خاص تھے، امام صاحب کی زندگی کا بڑا کارنامہ فقہ ہے اس لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ امام صاحب کی تاریخ میں انہی لوگوں کا ذکر چھوڑ دیا جائے جو ایسے بڑے کام میں ان کے شریک اور مددگار تھے، ان لوگوں کے حالات صرف امام ابوحنیفہ کی تاریخ سے وابستہ نہیں ہیں بلکہ اس سے عام طور پر حنفی فقہ کے متعلق ایک اجمالی خیال قائم ہوتا ہے، یعنی ان لوگوں کی عظمت

وشان سے فقہ حنفی کی خوبی اور عمدگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، ساتھ ہی امام صاحب کا بلند رتبہ ہونا ثابت ہوتا ہے کہ جس شخص کے شاگرد اس رتبہ کے ہوں گے وہ خود کس پایہ کا ہوگا۔ خطیب بغدادی نے وکیع بن الجراح کے حال میں جو ایک مشہور محدث [1] تھے لکھا ہے کہ ایک موقع پر وکیع کے پاس چند اہل علم جمع تھے۔ کسی نے کہا اس مسئلہ میں ابوحنیفہ نے غلطی کی۔" وکیع بولے کہ "ابوحنیفہ کیونکر غلطی کر سکتے ہیں۔ ابو یوسف وزفر قیاس میں یحییٰ بن زائدہ حفص بن غیاث حبان، مندل حدیث میں قاسم بن معن لغت وعربیت میں داود الطائی وفضیل بن عیاض زہد وتقویٰ میں، اس رتبہ کے لوگ جس شخص کے ساتھ ہوں وہ کہیں غلطی کر سکتا ہے۔ اور کرتا بھی تو یہ لوگ اس کو کب غلطی پر رہنے دیتے۔"

شاگرد کا رتبہ واعزاز استاد کے لئے باعث فخر خیال کیا جاتا ہے، اگر یہ فخر صحیح ہے تو اسلام کی تاریخ میں کوئی شخص امام ابوحنیفہ سے بڑھ کر اس فخر کا مستحق نہیں ہے۔ امام صاحب اگر یہ دعویٰ کرتے تو بالکل بجا تھا کہ جو لوگ امام صاحب کے شاگرد تھے وہ بڑے بڑے ائمہ مجتہدین کے شیخ اور استاد تھے۔ امام شافعیؒ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ میں نے امام محمد سے ایک بار شتر علم حاصل کیا ہے [2] یہ وہی امام محمد ہیں جو امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگرد ہیں اور جن کی تمام عمر امام صاحب کی حمایت میں صرف ہوئی، انصاف یہ ہے کہ امام صاحب کے بعض شاگرد خصوصاً قاضی ابو یوسف وامام محمد اس رتبہ کے عالم تھے کہ اگر امام ابوحنیفہ کی تبعیت سے الگ ہو کر مستقل اجتہاد کا دعویٰ کرتے تو ان کا جدا طریقہ قائم ہو جاتا اور امام مالک وامام شافعی کی طرح ان کے بھی ہزاروں لاکھوں مقلد بن جاتے۔

امام صاحب کے زمانہ میں جو مذہبی علوم نہایت اوج وترقی پر تھے۔ وہ فقہ حدیث اور اسماء الرجال تھے۔ یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ جو لوگ ان علوم کے ارکان تھے اکثر امام صاحب ہی کی کے شاگرد تھے۔ اور شاگرد بھی برائے نام شاگرد نہ تھے بلکہ مدتوں امام صاحب کی صحبت میں

---

[1] وکیع کا مستقل تذکرہ اس کتاب کے آئندہ صفحات میں دیکھو۔

[2] ہمارے زمانہ کے کم نظروں کو اس روایت سے تعجب ہوگا اور وہ اس کو حنفیوں کی گھڑی ہوئی سمجھیں گے مگر ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ علامہ نووی نے جو مشہور محدث ہیں اس روایت کی تصدیق کی ہے۔ دیکھو تہذیب الاسماء واللغات نووی، ترجمۂ امام محمد۔

رہے اوران کے فیض صحبت کا ہمیشہ اعتراف کرتے رہے، فقہ کے متعلق تو غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن حدیث کی نسبت اس دعویٰ پر لوگوں کو تعجب ہوگا اور یہ تعجب بجا ہے۔ کیونکہ امام صاحب کی شاگردی کے تعلق سے جو لوگ مشہور ہوئے۔ وہ اکثر فقیہ ہی تھے۔ محدثین میں سے جو امام صاحب کے شاگرد ہیں اگرچہ بجائے خود شہرت عام رکھتے ہیں لیکن ان کی شاگردی کا تعلق چنداں مشہور نہیں ہے۔ اس موقع پر جن لوگوں کے نام لکھوں گا اس تعلق کا ذکر بھی خصوصیت کے ساتھ کروں گا اور رجال کی نہایت معتبر کتابوں کا حوالہ دوں گا۔

امام صاحب کے بیشمار شاگردوں میں سے ہم ان چالیس شخصوں کا مختصر تذکرہ لکھنا چاہتے ہیں۔ جو امام صاحب سے صرف [1] چند شخصوں کا نام معلوم کر سکے۔ یعنی قاضی ابو یوسف، زفر، اسد بن عمر، عافیۃ الازدی، داؤ الطائی، قاسم بن معن، علی بن مہر، یحییٰ بن زکریا، حبان، مندل، چنانچہ ان لوگوں کے مختصر حالات ہم ذیل میں لکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض ان شاگردوں کا ذکر بھی ضرور ہے، حدیث ورجال کے فن میں امام وقت تھے۔ چنانچہ پہلے ہم انہی سے شروع کرتے ہیں

محدثین

یحییٰ بن سعید القطان

فن رجال کا سلسلہ ان ہی سے شروع ہوا علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال کے دیباچہ میں لکھا کہ فن رجال میں اول جس شخص نے لکھا وہ یحییٰ بن سعید القطان ہیں، پھر ان کے بعد ان کے شاگردوں میں یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، امام احمد بن حنبل، عمرو بن علی الفلاس ابوخثیمہ نے اس فن میں گفتگو کی اور ان کے بعد ان کے شاگردوں یعنی امام بخاری ومسلم وغیرہ نے

حدیث میں ان کا یہ پایہ تھا کہ جب حلقہ درس میں بیٹھتے تو امام احمد بن حنبل، علی ابن المدینی وغیرہ مؤدب کھڑے ہو کر ان سے حدیث کی تحقیق کرتے اور نماز عصر سے جو ان کے درس کا وقت تھا مغرب تک برابر کھڑے رہتے [2]۔ راویوں کی تحقیق وتنقید میں یہ کمال پیدا کیا تھا

[1] ان لوگوں کا ذکر اس حیثیت سے مؤرخ خطیب نے قاضی ابو یوسف کے ترجمہ میں لکھا ہے۔ [2] فتح المغیث و جواہر مضیہ

کہ ائمہ حدیث عموماً کہا کرتے تھے کہ یحیٰ جس کو چھوڑ دیں گے ہم بھی ان کو چھوڑ دیں گے۔[1] امام احمد بن حنبل کا مشہور قول ہے کہ **مارأیت بعینی مثل یحییٰ بن سعید القطان**[2] یعنی میں نے اپنی آنکھوں سے یحیٰ کا مثل نہیں دیکھا۔" اس فضل وکمال کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ کے حلقہ درس میں اکثر شریک ہوتے اور ان کی شاگردی پر فخر کرتے۔ اس زمانہ تک تقلید معین کا رواج نہیں ہوا تھا، تاہم اکثر مسائل میں وہ امام صاحب ہی کی تقلید کرتے تھے۔ خود ان کا قول ہے **قد اخذنا باکثر اقواله**[3] یعنی ہم نے امام ابوحنیفہ کے اکثر اقوال اخذ کئے۔" علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں جہاں وکیع بن الجراح کا ذکر کیا ہے لکھا ہے، **یفتی بقول ابی حنیفة و کان یحییٰ القطان یفتی بقوله ایضاً** ، یعنی وکیع امام ابوحنیفہؒ کے قول پر فتوے دیتے تھے، اور یحیٰ بن القطان بھی ان ہی کے قول پر فتوے دیتے تھے۔

۱۳۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸ھ میں بمقام بصرہ وفات پائی۔

عبداللہ بن المبارک

محدث نوی نے تہذیب الاسماء واللغات میں ان کا ذکر ان لفظوں سے کیا ہے، وہ امام جس کی امامت وجلالت پر ہر باب میں عموماً اجماع کیا گیا ہے جس کے ذکر سے خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے، جس کی محبت سے مغفرت کی امید کی جا سکتی ہے۔"

حدیث میں جو ان کا پایہ تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ محدثین ان کو امیر المؤمنین فی الحدیث" کے لقب سے پکارتے تھے ایک موقع پر ان کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ان سے خطاب کیا کہ یا عالم المشرق، امام سفیان ثوری جو مشہور محدث ہیں اس موقع پر موجود تھے بولے کہ کیا غضب ہے، عالم مشرق کہتے ہو۔ وہ عالم الشرق والغرب ہیں[4] امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ عبد اللہ بن المبارک کے زمانے میں ان سے بڑھ کر کسی نے حدیث کی

---

[1] تہذیب التہذیب۔ حافظ ابن حجر ترجمہ یحیٰ بن القطان۔

[2] میزان الاعتدال علامہ ذہبی، دیباچہ۔

[3] تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر۔ ترجمہ امام ابوحنیفہؒ۔

[4] تہذیب الاسماء واللغات علامہ نووی

تحصیل میں کوشش نہیں کی۔" خود عبداللہ بن المبارک کا بیان ہے کہ میں نے چار ہزار شیوخ سے حدیث سیکھی جن میں سے ہزار سے [1] روایت کی۔ صحیح بخاری و مسلم میں ان کی روایت سے سینکڑوں حدیثیں مروی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ فن روایت کے بڑے ارکان میں سے ہیں۔ حدیث وفقہ میں ان کی بہت سی تصنیفات ہیں لیکن افسوس کہ آج اس کا پتہ نہیں۔

ان کے فضل وکمال، زہد وتقوے نے اس قدر لوگوں کو مسخر کر لیا تھا کہ بڑے بڑے امر اوسلاطین کو وہ رتبہ حاصل نہ تھا۔ ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید رقہ گیا اسی زمانہ میں عبداللہ بن المبارک بھی رقہ پہنچے۔ ان کے آنے کی خبر مشہور ہوئی تو ہر طرف سے لوگ دوڑے اور اس قدر کشمکش ہوئی کہ لوگوں کی جوتیاں ٹوٹ گئیں۔ ہزاروں آدمی ساتھ ہوئے اور ہر طرف گرد چھا گئی۔ ہارون رشید کی ایک حرم نے جو برج کے غرفہ سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی، حیرت زدہ ہو کر پوچھا یہ کیا حال ہے لوگوں نے کہا "خراسان کا عالم آیا ہے، جس کا نام عبداللہ بن المبارک ہے۔" بولی کہ حقیقت میں سلطنت اس کا نام ہے ہارون الرشید کی حکومت بھی کوئی حکومت ہے کہ پولیس اور سپاہیوں کے بغیر ایک آدمی بھی حاضر نہیں [2] ہو سکتا۔

یہ امام ابو حنیفہؒ کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں، اور امام صاحب کے ساتھ ان کو خاص خلوص تھا، ان کو اعتراف تھا کہ جو کچھ مجھ کو حاصل ہوا، امام ابو حنیفہ اور سفیان ثوری کے فیض سے حاصل ہوا۔ ان کا مشہور قول ہے کہ لولا ان اللہ تعالیٰ اغاثنی بابی حنیفہ و سفیان کنت کسائر الناس [3]۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ابو حنیفہ وسفیان کے ذریعہ سے میری دستگیری نہ کی ہوتی تو میں ایک عام آدمی سے بڑھ کر نہ ہوتا۔" امام ابو حنیفہ کی شان میں ان کے اشعار اکثر منقول ہیں۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں چند اشعار نقل کئے ہیں جن میں سے ایک شعر یہ ہے۔

رأیت ابا حنیفة حین تولّٰی
ویطلب علمه بحرا اعزیزاً

مرو کے رہنے والے تھے ۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۱ھ میں مقام ہیت وفات پائی۔

---

[1] خلاصہ تہذیب الکمال ترجمہ عبداللہ بن المبارک۔

[2] تاریخ ابن خلکان ترجمہ عبداللہ بن المبارک [3] تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر ترجمہ۔ امام ابو حنیفہؒ۔

یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ

مشہور محدث تھے۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں صرف ان لوگوں کا تذکرہ لکھا ہے جو حافظ الحدیث کہلاتے تھے، چنانچہ یحییٰ کو بھی انہی لوگوں میں داخل کیا ہے اور ان کے طبقہ میں سب سے پہلے انہی کا نام لکھا ہے۔ علی بن المدینی جو امام بخاری کے مشہور استاد ہیں کہا کرتے تھے کہ ''یحییٰ کے زمانہ میں یحییٰ پر علم کا خاتمہ ہوگیا[1]۔ صحاح ستہ میں ان کی روایت سے بہت سی حدیثیں ہیں۔ وہ محدیث اور فقیہ دونوں تھے اور ان دونوں فنون میں بہت بڑا کمال رکھتے تھے چنانچہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان کا ترجمہ ان لفظوں سے شروع کیا ہے۔

یہ امام ابو حنیفہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور مدت تک ان کے ساتھ رہے تھے یہاں تک کہ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو ''صاحب ابی حنیفہ'' کا لقب دیا ہے یہ تدوین فقہ میں امام صاحب کے شریک اعظم تھے۔ امام طحاوی نے لکھا ہے کہ وہ تیس برس تک شریک رہے۔'' اگر چہ یہ مدت صحیح نہیں ہے، لیکن کچھ شبہ نہیں کہ بہت دنوں تک امام صاحب کے ساتھ تدوین فقہ کا کام کرتے رہے اور خاص کر تصنیف و تحریر کی خدمت انہی سے متعلق تھی [2]۔ میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں کا قول ہے کہ کوفہ میں اول جس شخص نے تصنیف کی وہ یحییٰ ہیں۔'' معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ تحریر کا کام یحییٰ سے متعلق تھا اس لیے بعض لوگوں نے انہی کو مستقل مصنف سمجھ لیا۔

مدائن میں منصب قضاء پر ممتاز تھے۔ اور وہیں ۱۸۲ھ میں ۶۳ برس کی عمر میں وفات پائی۔

وکیع بن الجراح

فن حدیث کے ارکان میں شمار کیے جاتے ہیں، امام احمد بن حنبل کو ان کی شاگردی پر فخر تھا چنانچہ جب وہ ان کی روایت سے کوئی حدیث بیان کرتے تھے تو ان لفظوں سے شروع کرتے

---

[1] میزان الاعتدال علامہ ذہبی، ترجمہ یحییٰ۔

[2] الجواہر المضیۂ ترجمہ یحییٰ

تھے۔ ''یہ حدیث مجھ سے اس شخص نے روایت کی کہ تیری آنکھوں نے اس کا مثل نہ دیکھا ہوگا[1]
یحییٰ بن معین جوفن رجال کے ایک رکن خیال کیے جاتے ہیں۔ان کا قول تھا کہ ''میں نے کسی ایسے شخص کونہیں دیکھا جس کو وکیع پر ترجیح دوں [2] ۔''اکثر ائمہ حدیث نے ان کی شان میں اس قسم کے الفاظ لکھے ہیں۔ بخاری ومسلم میں اکثر کی روایت سے حدیثیں مذکور ہیں،فن حدیث ورجال کے متعلق ان کی روایتیں اورآراءنہایت مستند خیال کی جاتی ہے۔

یہ امام ابوحنیفہ کے شاگرد خاص تھے اوران سے بہت سی حدیثیں سنی تھیں۔اکثر مسائل میں امام صاحب کی تقلید کرتے تھے اورانہی کے قول کے موافق فتوے دیتے تھے خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے **كان يفتي بقول ابي حنيفة و كان قد سمع منه شياً كثيرا**[3] علامہ ذہبیہ نے بھی تذکرۃ الحفاظ میں اس کی تصدیق کی ہے۔ ۱۹۷ھ میں وفات پائی۔

یزید بن ہارون

فن حدیث کے مشہور امام ہیں بڑے بڑے ائمہ حدیث ان کے شاگرد تھے۔امام احمد بن حنبل،علی المدینی،یحییٰ بن معین،ابن ابی شیبہ وغیرہ نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا ہے علامہ نودی نے ان کے تلامذہ کی نسبت لکھا ہے کہ ان کا شمار نہیں ہوسکتا۔یحییٰ بن ابی طالب کا بیان ہے کہ ایک بار میں ان کے حلقۂ درس میں شریک تھا لوگ تخمینہ کرتے تھے کہ حاضرین کی تعداد کم وبیش ستر ہزار تھی [4] کثرت حدیث میں لوگ ان کی مثال دیتے تھے،خودان کا بیان ہے کہ مجھ کو بیس ہزار حدیثیں یاد ہیں [5] ''۔علی بن المدینی (امام بخاری کے استاد) کہا کرتے تھے کہ میں نے ان سے زیادہ کسی کو حافظ الحدیث نہیں دیکھا۔

---

[1] تہذیب الاسماء واللغات علامہ نودی ترجمہ وکیع بن الجراح۔

[2] تہذیب الاسماء واللغات۔

[3] حافظ ابن عبد البر کے قول میں شیا کے بجائے حدثنا کا لفظ ہے اور صریح اس دعویٰ پر دلالت کرتا ہے (دیکھو عقود الجمان خاتمہ فصل اول)

[4] تہذیب الاسماء واللغات نودی، ترجمہ یزید بن ہارون

[5] تہذیب الاسماء واللغات

فنِ حدیث میں ان کو امام ابوحنیفہ سے تلمذ تھا۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں جہاں ان لوگوں کے نام لکھے ہیں، جنہوں نے امام صاحب سے حدیثیں روایت کیں ان کا نام بھی لکھا ہے یہ ایک مدت تک امام صاحب کی صحبت میں رہے اور اس وجہ سے ان کو امام صاحب کے اخلاق و عادات پر رائے قائم کرنے کا کافی موقع ملا تھا ان کا قول ہے کہ میں نے بہت سے لوگوں کی صحبت اٹھائی لیکن امام ابوحنیفہ سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا۔[1]

۱۱۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۶ھ میں وفات پائی۔

حفص بن غیاثؒ

بہت بڑے محدث تھے، خطیب بغدادی نے ان کو کثیر الحدیث لکھا ہے اور علامہ ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل، علی المدینی وغیرہ نے ان سے حدیث روایت کی ہیں، یہ اس خصوصیت میں ممتاز تھے کہ جو کچھ روایت کرتے تھے زبانی کرتے تھے۔ کاغذ یا کتاب پاس نہیں رکھتے تھے، چنانچہ اس طرح جو حدیثیں روایت کیں ان کی تعداد تین یا چار ہزار ہے۔[2] یہ امام صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، امام صاحب کے شاگردوں میں چند بزرگ نہایت مقرب اور با اخلاص تھے جن کی نسبت وہ فرمایا کرتے تھے کہ تم میرے دل کی تسکین اور میرے غم کے مٹانیوالے ہو۔" حفص کی نسبت بھی امام صاحب نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے ہیں مختصر تاریخ بغداد میں ان کی نسبت لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگردوں میں تھے۔

مدت تک دنیاوی تعلقات سے آزاد رہے۔ لیکن اخیر میں ضرورتوں نے بہت تنگ کیا۔ اتفاق یہ کہ انہی دنوں یعنی ۱۷۷ھ میں ہارون رشید نے ان کا شہرہ سن کر ان کو طلب کیا اور قضا کی خدمت سپرد کی، چونکہ قرض سے زیر بار تھے، مجبوراً قبول کرنا پڑا۔ قاضی ابو یوسف قاضی القضاۃ تھے اور قضاۃ کا تمام سررشتہ ان کے اہتمام میں تھا۔ چونکہ ہارون رشید نے قاضی صاحب کی بغیر اطلاع حفص کو مقرر کر دیا۔ اس لیے ان کو فی الجملہ خیال ہوا اور حسن بن زیاد سے کہا کہ حفص کے فیصلے ہمارے مرافعہ میں آئیں تو ان کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے، لیکن جب ان کے فیصلے

---

[1] تہذیب الکمال، حافظ مزی، ترجمہ امام ابوحنیفہ۔

[2] میزان الاعتدال ترجمہ حفص۔

دیکھے تو اعتراف کیا کہ حفص کے ساتھ تائید الٰہی [1] ہے۔

۱۱۷ھ میں پیدا ہوئے، تیرہ برس کوفہ میں اور دو برس بغداد میں قاضی رہے ۱۹۶ھ میں وفات پائی۔

ابو عاصم النبیل

ان کا نام ضحاک بن مخلد ہے، مشہور محدث ہیں۔ صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں ان کی روایت سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ ان کی توثیق پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے نہایت پارسا اور متورع تھے، امام بخاری نے روایت کی ہے کہ ابو عاصم نے خود کہا کہ "جب مجھ کو معلوم ہوا کہ غیبت حرام ہے میں نے آج تک کسی کی غیبت نہیں کی۔"

ان کا لقب نبیل تھا۔ جس کے معنی معزز کے ہیں۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ لقب کیوں ہوا؟ ایک اور روایت ہے کہ ایک دفعہ شعبہ نے کسی وجہ سے قسم کھالی کہ "میں حدیث نہیں روایت کروں گا۔" چونکہ وہ بڑے محدث تھے اور ان کے حلقۂ درس سے ہزاروں طلباء مستفید ہوتے تھے۔ لوگوں کو بہت تشویش ہوئی۔ ابو عاصم نے یہ حال سنا تو اسی وقت شعبہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ "میں اپنے غلام کو آپ کی قسم کے کفارہ میں آزاد کرتا ہوں۔ آپ قسم توڑ ڈالیے اور حدیث کا درس دیجئے۔" شعبہ کو ان کے شوق اور ہمت پر تعجب ہوا اور فرمایا کہ انت نبیل اس وقت سے یہ لقب مشہور ہو گیا۔" [2]

یہ امام صاحب کے مختص شاگردوں میں [3] تھے، خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ کسی نے ان سے پوچھا کہ "سفیان ثوری زیادہ فقیہ ہیں یا ابو حنیفہ؟ بولے موازنہ تو ان چیزوں میں ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوں۔ ابو حنیفہ نے فقہ کی بنیاد ڈالی

---

[1] الجواہر المضیۂ ترجمہ حفص بن غیاث۔

[2] الجواہر المضیۂ ترجمہ ابو عاصم

[3] الجواہر المضیۂ

اور سفیان صرف فقیہ ہیں۔

۲۱۲ھ میں نوے برس برس کی عمر میں وفات پائی۔

عبدالرزاق بن ہمام

علامہ ذہبی نے ان کا تذکرہ ان لفظوں میں شروع کیا ہے **احد الاعلام الثقات،** بہت بڑے نامور محدث تھے، صحیح بخاری و مسلم وغیرہ ان کی روایتوں سے مالا مال ہیں۔ امام احمد بن حنبل سے کسی نے پوچھا کہ حدیث کی روایت میں آپ نے عبدالرزاق سے بڑھ کر کسی کو دیکھا۔ جواب دیا کہ "نہیں"۔ بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً امام سفیان بن عینیہ یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، امام احمد بن حنبل فن حدیث میں ان کے شاگرد تھے، طالبان حدیث بہت دور سے قطع منازل کر کے ان کی خدمت میں سیکھنے جاتے تھے یہاں تک کہ بعضوں کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کے پاس اس قدر دور دراز مسافتیں طے کر کے لوگ نہیں گئے۔ [1]

حدیث میں ان کی ضخیم تصنیف موجود ہے۔ جو جامع عبدالرزاق کے نام سے مشہور ہے۔ امام بخاری نے اعتراف کیا ہے کہ "میں اس کتاب سے مستفید ہوا ہوں۔ علامہ ذہبی نے اس کتاب کی نسبت میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ "علم کا خزانہ ہے۔"

ان کو ابوحنیفہ سے فن حدیث میں تلمذ تھا، عقود الجمان کے مختلف مقامات سے ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب کی صحبت میں زیادہ رہے، چنانچہ ان اخلاق و عادات کے متعلق ان کے اکثر اقوال کتابوں میں مذکور ہیں، ان کا قول تھا کہ "میں نے امام ابوحنیفہ سے بڑھ کر کسی کو حلیم نہیں دیکھا۔"

۱۲۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۱۱ھ میں انتقال کیا۔

داؤد الطائی

خدا نے عجیب حسن قبول دیا تھا، صوفیہ ان کو بہت بڑا مرشد کامل مانتے ہیں۔ تذکرہ

[1] انساب سمعانی و تاریخ یافعی ترجمہ عبدالرزاق بن ہمام

الاولیاء میں ان کے مقالات عالیہ مذکور ہیں۔ فقہاء اور خصوصاً فقہائے حنفیہ ان کے تفقہ اور اجتہاد کے قائل ہیں۔ محدثین کا قول ہے کہ "ثقة بلانزاع"[1] اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ان تمام القاب کے مستحق تھے، محارب بن وثار جو مشہور محدث تھے کہا کرتے تھے کہ "داؤد اگر اگلے زمانے میں ہوتے تو خدا قرآن مجید میں ان کا قصہ بیان کرتا[2]۔

ابتدا میں فقہ وحدیث کی تحصیل کی۔ پھر علم کلام میں کمال پیدا کیا اور بحث ومناظرہ میں مشغول ہوئے، ایک دن کسی موقع پر ایک شخص سے گفتگو کرتے کرتے اس پر کنکری پھینک ماری۔ اس نے کہا "داؤد تمھاری زبان اور ہاتھ دونوں دراز ہو چلے، ان پر عجیب اثر ہوا۔ بحث ومناظرہ بالکل چھوڑ دیا تاہم تحصیل علم کا مشغلہ جاری رہا۔ برس دن کے بعد کل کتابیں دریا میں ڈبو دیں اور تمام چیزوں سے قطع تعلق کر لیا۔ امام محمد کا بیان ہے کہ میں داؤد سے اکثر مسئلے پوچھنے جاتا۔ اگر کوئی ضروری اور عملی مسئلہ ہوتا تو بتا دیتے ورنہ کہتے کہ "بھائی مجھے اور ضروری کام ہیں۔"

یہ امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگرد ہیں۔ خطیب بغدادی، ابن خلکان، علامہ ذہبی اور دیگر مؤرخین نے جہاں ان کے حالات لکھے ہیں امام صاحب کی شاگردی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ تدوین فقہ میں بھی امام صاحب کے شریک تھے۔ اور اس مجلس کے معزز ممبر تھے۔

۱۶۰ھ میں وفات پائی۔

ان بزرگوں کے سوا اور بھی بہت سے نامور محدثین ہیں مثلاً فضل بن وکین، حمزہ ابن حبیب الزیات، ابراہیم بن طہان، سعید بن اوس، عمرو بن میمون، فضل ابن موسیٰ، وغیرہ امام صاحب کے تلامذہ میں داخل ہیں لیکن ہم نے صرف ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو تلامذہ خاص کہے جا سکتے ہیں اور جو مدتوں امام صاحب کی صحبت سے مستفید ہوئے ہیں۔

---

[1] میزان الاعتدال ذہبی

[2] تاریخ ابن خلکان

فقہاء

جو تدوین فقہ میں شریک تھے

قاضی ابو یوسف

ان کی منزلت اور عظمت و شان اس قابت تھی کہ ان کا مستقل تذکرہ لکھا جاتا اور جب ہی ان کے علمی کمالات کا اندازہ بھی ہو سکتا تھا لیکن یہ فرصت کے کام ہیں، خدا کسی کو توفیق دے تو یہ کام پورا ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کے موضوع کے لحاظ سے میرا اسی قدر فرض ہے کہ ان کی مختصر تاریخ لکھ دوں جس سے ان کی لائف اور علمی کمالات پر ایک اجمالی رائے قائم ہو سکے۔

ان کا نسب انصار سے ملتا ہے ان کے مورث اعلیٰ سعد بن صبہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے تھے، ان کے باپ ایک غریب آدمی تھے، اور مزدوری محنت کر کے زندگی بسر کرتے تھے یہ ۱۱۳ھ یا ۱۱۷ھ میں بمقام کوفہ پیدا ہوئے ان کو اگرچہ بچپن سے لکھنے پڑھنے کا ذوق تھا، لیکن باپ کی مرضی نہ تھی وہ چاہتے تھے کہ کوئی پیشہ سیکھ لیں اور گھر میں چار پیسے کما کر لائیں تاہم جب قاضی صاحب موقع اور فرصت پاتے علماء کی صحبت میں جا بیٹھتے۔ ایک دن امام ابو حنیفہ کے حلقۂ درس میں حاضر تھے کہ ان کے باپ پہنچے اور وہاں سے زبردستی اٹھا لائے گھر پر آ کر سمجھایا کہ ''بیٹا ابو حنیفہ کو خدا نے رزق کی طرف سے اطمینان دیا ہے تم ان کی حرص کیوں کرتے ہو۔'' قاضی صاحب نے مجبوراً لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا اور باپ کے ساتھ رہنے لگے، امام ابو حنیفہ نے دو چار دن کے بعد لوگوں سے پوچھا کہ ''یعقوب اب نہیں آتے'' ان کو امام صاحب کی جستجو کا حال معلوم ہوا تو حاضر ہوئے اور ساری کیفیت بیان کی، امام صاحب نے چپکے سے ایک تھیلی حوالے کی، گھر پر آ کر دیکھا تو اس میں سو درہم تھے امام صاحب نے ان سے یہ بھی کہہ دیا کہ جب خرچ ہو جائیں تو مجھ سے کہنا اس طرح برابر ان کو مدد دیتے رہے۔ یہاں تک کہ قاضی صاحب نے تمام علوم میں کمال حاصل کیا اور استاد وقت بن گئے۔

قاضی صاحب نے امام ابو حنیفہ کے علاوہ اور بہت سے ائمہ وقت کی خدمت میں علم کی تحصیل کی، اعمش، ہشام بن عرو، سلیمان تیمی، ابو اسحٰق شیبانی، یحییٰ بن سعید الانصاری وغیرہ سے حدیثیں روایت کیں۔ محمد بن ابو اسحٰق سے مغازی وسیر پڑھی۔ محمد بن ابی لیلےٰ سے فقہ کے مسائل سیکھے خدا نے ذہن وحافظہ ایسا قوی دیا تھا کہ ایک ہی زمانہ میں ان تمام علوم کی تحصیل کرتے تھے، حافظ ابن عبدالبر نے جو ایک مشہور محدث ہیں لکھا ہے کہ ابو یوسف محدثین کے پاس حاضر ہوتے اور ایک جلسہ میں پچاس ساٹھ حدیثیں سن کر یاد کر لیتے۔

امام صاحب جب تک زندہ رہے، قاضی صاحب ان کے حلقۂ درس میں ہمیشہ حاضر ہوتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد دربار سے تعلق پیدا کرنا چاہا۔ چنانچہ خلیفہ مہدی عباسی نے ۱۶۶ھ میں ان کو قاضی کی خدمت دی۔ مہدی کے بعد ان کے جانشین نے بھی ان کو اسی عہدہ پر بحال رکھا لیکن ہارون رشید نے ان کی لیاقتوں سے واقف ہو کر تمام ممالک اسلامیہ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا اور یہ وہ عہدہ تھا جو اس وقت تک اسلام کی تاریخ میں کسی کو نصیب نہیں ہوا تھا کہ زمانہ مابعد میں بھی بجز قاضی احمد بن ابی داؤد کے اور کسی کو نصیب نہیں ہوا قاضی صاحب نے سررشتہ قضا میں جو ترقیاں کیں ان کو تفصیل خود ان کی لائف میں لکھی جائیں تو لکھی جاسکتی ہیں۔

جمعرات کے دن ظہر کے وقت ربیع الاول کی پانچویں تاریخ ۱۸۲ھ میں وفات پائی۔ محمد بن سماعہ کا بیان ہے کہ مرتے وقت یہ الفاظ ان کی زبان پر تھے ''اے خدا تو جانتا ہے کہ میں نے کوئی فیصلہ عمداً خلاف واقع نہیں کیا۔ میری ہمیشہ کوشش رہی کہ جو فیصلہ ہو تیری کتاب اور تیرے پیغمبرؐ کے طریقے کے موافق ہو، جب کوئی مشکل مسئلہ آتا تھا تو میں امام ابو حنیفہ کو واسطہ بناتا تھا، اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہوا ہے امام ابو حنیفہ تیرے، احکام کو خوب سمجھتے تھے اور عمداً حق کے راستے سے باہر نہ جاتے تھے۔ قاضی صاحب بہت بڑے دولتمند تھے لیکن دولت کا استعمال اچھی طرح کیا۔ مرت وقت وصیت کی کہ چار لاکھ روپیہ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، کوفہ، بغداد کے محتاجوں کو دیے جائیں۔

قاضی صاحب متعدد علوم میں کمال رکھتے تھے، اگر چہ ان کی شہرت زیادہ تر ترتیب فقہ میں ہوئی، لیکن اور علوم میں بھی وہ اپنی آپ ہی نظیر تھے۔ مورخ ابن خلکان نے اہل ابن یحییٰ کا قول نقل کیا ہے کہ ''ابو یوسف تفسیر، مغازی، ایام العرب کے حافظ تھے۔ اور فقہ ان کا ادنیٰ سا علم تھا۔''

حدیث میں ان کا یہ پایہ تھا کہ حفاظ حدیث میں شمار کیے جاتے تھے، چنانچہ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ لکھا ہے۔ یحییٰ بن معین کہا کرتے تھے کہ اہل الرائے میں ابو یوسف سے بڑھ کر کوئی شخص کثیر الحدیث نہیں۔" امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ **کان منصفافی الحدیث** مزنی جو امام شافعی کے مشہور شاگرد ہیں کہا کرتے تھے **ابو یوسف اتبع القوم للحدیث** ۱۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں امام احمد بن حنبل کا قول نقل کیا ہے کہ اول جب مجھ کو علم حدیث کا شوق پیدا ہوا تو ابو یوسف کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یحییٰ بن معین و امام احمد بن حنبلؒ اور بہت سے ائمہ حدیث نے قاضی صاحب سے حدیثیں روایت کیں، اس سے زیادہ ان کی عظمت و شان کی کیا دلیل ہو گی ۲۔

فقہ میں ان کا جو پایہ ہے اس سے کون انکار کرسکتا ہے، امام ابو حنیفہ کو خود ان کے کمال کا اعتراف تھا، ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے، امام صاحب عیادت کو گئے۔ واپس آئے تو ساتھیوں سے کہا کہ "اگر خدانخواستہ یہ شخص ہلاک ہوا تو دنیا کا عالم ہلاک ہوا۔" اور ائمہ بھی ان کی روانی طبع اور قوت فہم کے معترف تھے۔ امام اعمش اس زمانے کے مشہور محدث تھے انہوں نے قاضی صاحب سے ایک مسئلہ پوچھا، انہوں نے جواب بتایا، امام اعمش نے کہا اس میں کوئی سند بھی ہے؟ قاضی صاحب نے فرمایا کہ ہاں! وہ حدیث جو فلاں موقع پر آپ نے مجھ سے بیان کی تھی۔ امام اعمش نے کہا کہ "یعقوب یہ حدیث مجھ کو اس وقت سے یاد ہے جب تمہارے والد کا عقد بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کا صحیح مطلب آج ہی سمجھ میں آیا ۳ قاضی صاحب پہلے شخص ہیں جس نے فقہ حنفی میں تصنیفیں کیں۔ مختلف علوم میں ان کی تصنیفات بہت ہیں اور ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں ان کی مفصل فہرست بھی نقل کی ہے لیکن ہماری نگاہ سے صرف کتاب الخراج گذری ہے اس لیے ہم اس کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ ہارون رشید نے خراج و جزیہ وغیرہ کے متعلق قاضی صاحب سے یادداشتیں طلب کی تھیں قاضی صاحب نے اس کے جواب میں چند تحریریں

---

۱ یہ اقوال علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیے ہیں۔

۲ قاضی صاحب کی نسبت کتب رجال میں جرحیں بھی منقول ہیں مگر وہ عموماً ناقابل اعتبار ہیں۔ کیونکہ یا تو وہ مبہم جرحیں ہیں یا ان کا منشاء اجتہادی مسائل کا اختلاف ہے۔

۳ ابن خلکان ترجمہ قاضی ابو یوسف

بھیجیں، یہ کتاب انہی تحریروں کا مجموعہ[1] ہے اگرچہ اس میں بہت سے مضامین ہیں لیکن زیادہ تر خراج کے مسائل ہیں اور اس لیے اس کو اس زمانے کا قانون مالگذاری کہہ سکتے ہیں۔ اس کتاب میں زمین کے اقسام بلحاظ حیثیت اور بلحاظ تنوع، لگان کی مختلف شرطیں، کاشتکاروں کی حیثیتوں کا اختلاف، پیداوار کی قسمیں، اس قسم کے اور مراتب کو اس خوبی اور دقت نظر کے ساتھ منضبط کیا ہے اور ان کے متعلق قواعد قرار دیے ہیں کہ اس زمانہ کے لحاظ سے تعجب ہوتا ہے۔ طرز تحریر میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ نہایت آزادانہ ہے قواعد اور ہدایتوں کے ساتھ جابجا ان ابتریوں کا ذکر ہے جو انتظامات سلطنت میں موجود تھیں، اور ان پر نہایت بے باکی کے ساتھ خلیفہ وقت کو متوجہ کیا ہے۔

قاضی صاحب کی تاریخ زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ قابل قدر ہے وہ یہ ہے کہ ہارون رشید جیسے جبار اور خود پرست بادشاہ کے دربار میں وہ اپنے فرائض اس جرأت اور آزادی سے ادا کرتے تھے جس کی مثال ایشیائی سلطنتوں میں بہت کم ملتی ہے۔ کتاب الخراج میں ایک جگہ وہ ہارون رشید کو لکھتے ہیں کہ "اے امیر المومنین! اگر تو اپنی رعایا کے انصاف کے لیے مہینہ میں ایک بار بھی دربار کرتا اور مظلوموں کی فریاد سنتا تو میں امید کرتا ہوں کہ تیرا دشمن ان لوگوں میں نہ ہوتا جو رعیت سے پردہ کرتے ہیں اور اگر دو ایک دربار بھی کرتا تو یہ خبر تمام اطراف میں پھیل جاتی اور ظالم اپنے ظلم سے باز آتے بلکہ اگر عمال وصبہ داروں کو یہ خبر پہنچے کہ تو برس میں ایک دفعہ انصاف کے لیے بیٹھتا ہے تو ظالموں کو کبھی ظلم پر جرأت نہ ہونے پائے۔"

قاضی صاحب کے سوا کسی کی جرأت تھی کہ ہارون رشید کو یہ الفاظ لکھتا۔

تعجب یہ ہے کہ ایسا آزاد اور پاکیزہ نفس بھی دشمنوں کے حملے سے نہیں بچ سکا۔ قاضی صاحب کے مخالفین نے ان کو خوشامدی اور زمانہ ساز کہا ہے اور اس مضمون کی چند اور روایتیں بھی گھڑلی ہیں بعض مؤرخین کو رطب و یابس سے کچھ بحث نہیں۔ ان بیہودہ روایتوں کو نقل بھی کر دیتے ہیں جو کوتاہ بینوں کے لیے "ہوائے بس است" کا کام دیتی ہیں۔ اس قسم کی بعض حکایتیں تاریخ الخلفاء میں منقول ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کتاب الخراج کے فقرے جو ہم نے نقل کیے ہیں جس قطعیت کے ساتھ ثابت ہیں انکے مقابلے میں ان روایتوں کا کس حد تک اعتبار ہو سکتا ہے۔

حاطب اللیل مؤرخین ایک طرف بعض محدثین نے بھی مخالفت کے جوش میں تحقیق کی

---

[1] یہ کتاب مصر کے مطبع میریہ میں ۱۳۰۲ھ میں چھاپی گئی ہے۔

پروفیسر بیہقی نے امام شافعی کے حالات میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے اس میں لکھا ہے کہ امام شافعی جب ہارون الرشید کے دربار میں گرفتار ہو کر آئے تو قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے ہارون رشید کو امام شافعی کے قتل کی رائے دی اور کہا کہ اگر جلد تدارک نہیں کیا جاتا تو یہ شخص سلطنت کو صدمہ پہنچائے گا۔'' افسوس امام بیہقی کو بایں ہمہ محدثیت یہ بھی خیال نہ آیا کہ قاضی ابو یوسف اس زمانے سے بہت پہلے انتقال کر چکے تھے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ خود محدثین ہی نے اس روایت کی تکذیب کی، حافظ ابن حجر نے جن سے بڑھ کر ان کے بعد محدث نہیں ہوا، امام شافعی کے حالات میں ایک کتاب لکھی [1] ہے جو آج کل مصر میں چھاپی گئی ہے وہ اس روایت کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔ **فهي مكذوبة وغالب ما فيها موضوع وبعضها ملفق من روايات ملفقة واوضح ما فيها من لكذب قوله فيها ان ابا يوسف ومحمد بن الحسن حرضا الرشيد على قتل الشافعي۔** یعنی یہ روایت جھوٹی ہے اور اس کا اکثر حصہ موضوع اور بعض حصے دوسری مختلط روایتوں سے ماخوذ ہیں اور جو صریح جھوٹ اس میں ہے وہ یہ ہے کہ ابو یوسف و محمد بن الحسن نے ہارون رشید کو امام شافعی کے قتل کی ترغیب دی۔

امام محمد بن الحسن الشیبانی

یہ فقہ حنفی کے دوسرے بازو ہیں۔ ان کا اصلی وطن دمشق کے متصل ایک گاؤں تھا جن کو حرستا کہتے ہیں۔ ان کے والد وطن چھوڑ کر واسطہ چلے آئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی، امام محمد ۱۳۵ھ میں یہیں پیدا ہوئے۔

سن رشید کا آغاز تھا کہ کوفہ جانا ہوا۔ یہاں علوم کی تحصیل شروع کی اور بڑے بڑے محدثین وفقہا کی صحبت اٹھائی، مسعر بن کدام، امام سفیان ثوری، مالک بن دینار، امام اوزاعی وغیرہ سے حدیثیں روایت کیں، کم وبیش دو برس تک امام ابو حنیفہ کی خدمت میں رہے امام صاحب کی وفات کے بعد قاضی ابو یوسف سے بقیہ تحصیل کی، پھر مدینہ گئے اور تین برس تک امام مالک سے حدیث پڑھتے رہے، آغاز شباب ہی میں ان کے فضل وکمال کے چرچے پھیل گئے

---

[1] اس کتاب کا نام توالی التاسیس بمعالی ابن ادریس ہے اور ۱۳۰۱ھ میں مطبع میریہ میں طبع ہوئی ہے۔

تھے۔ بیس برس کے سن میں مسند درس پر بیٹھے اور لوگوں نے ان سے استفادہ شروع کیا، ہارون الرشید نے ان کے فضل وکمال سے واقف ہو کر قضاء کی خدمت دی اور اکثر اپنے ساتھ رکھتا تھا، ۱۸۹ھ میں رے گیا تو ان کو بھی ساتھ لے گیا رے کے قریب رنبویہ ایک گاؤں ہے وہاں پہنچ کر قضا کی، اتفاق یہ کہ کسائی جو مشہور نحوی گزرا ہے وہ بھی اس سفر میں ساتھ تھا اور اس نے بھی یہی انتقال کیا۔ ہارون الرشید کو نہایت صدمہ ہوا اور کہا ''آج فقہ اور نحو دونوں کو ہم دفن کر آئے'' علامہ یزیدی نے ایک مشہور ادیب اور ہارون الرشید کے درباریوں میں تھے نہایت جانگداز مرثیہ لکھا۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔

فقلت اذامااشكل ال حطيب من لنا

بايضاحه يوما وانت فقيد

ہم نے کہا جب تو نہ رہا تو ہمارے لیے مشکلات کا حل کرنے والا کہاں سے آئے گا۔

امام محمد نے اگرچہ زندگی کا بڑا حصہ دربار کے تعلق سے بسر کیا، لیکن آزادی اور حق گوئی کا سررشتہ کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ۱۷۵ھ میں یحییٰ علوی نے جب علم بغاوت بلند کیا تو ہارون رشید ان کا سروسامان دیکھ کر حواس باختہ ہوگیا اور دب کر صلح اختیار کی، معاہدہ قلمبند ہوا اور یحییٰ کے اطمینان کے لیے بڑے بڑے علماء فضلاء فقہاء اور محدثین نے اس پر دستخط کیے۔ یحییٰ صلح پر راضی ہو کر بغداد میں آ گئے تو چند روز کے بعد ہارون الرشید نے نقض عہد کرنا چاہا۔ تمام علماء نے ہارون الرشید کے خوف سے فتویٰ دے دیا کہ صورت موجودہ میں نقض عہد جائز ہے لیکن امام محمد نے اعلانیہ مخالفت کی اور اخیر تک اپنے اصرار پر قائم رہے۔

امام محمد جس رتبہ کے شخص تھے اس کا اندازہ ائمہ مجتہدین کے اقوال سے ہوسکتا ہے، امام شافعی کا قول ہے کہ ''امام محمد جب کوئی مسئلہ بیان کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وحی اتر رہی ہے، انہی کا قول ہے کہ میں نے امام محمد سے ایک بار شتر کے برابر علم حاصل کیا۔'' امام احمد بن حنبل سے کسی نے پوچھا کہ ''دقیق مسائل آپ کو کہاں سے حاصل ہوئے؟ فرمایا محمد ابن الحسن کی کتابوں [1] سے۔''

امام محمد کے حلقہ درس سے اگرچہ بہت سے علماء تعلیم پا کر نکلے۔ لیکن ان سب میں امام شافعی کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاسکتا ہے، ہمارے زمانہ کے کم نظروں کو اس سے تعجب ہوگا،

---

[1] یہ تمام اقوال محدث نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں نقل کیے ہیں۔

اگلے زمانہ میں بھی ابن تیمیہ نے امام شافعی کی شاگردی سے انکار کیا تھا لیکن حق کو کون دبا سکتا ہے، تاریخ ورجال کی آج سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، وہ کیا شہادت دے رہی ہیں بے شبہ امام شافعی کو امام محمد کے فیض صحبت نے بڑے بڑے کمالات کے جواہر دکھائے اوران کا خود ان کو اعتراف تھا، حافظ ابن حجر امام شافعی کا قول نقل کرتے ہیں۔ **کان محمد ابن الحسن جید المنزلة عند الخليفة فاختلفت اليه وقلت هو اولیٰ من جهة الفقة فلزمته و كتبت عنه** [1] یعنی محمد بن الحسن خلیفہ کے ہاں بہت معزز تھے۔ اس لیے میں ان کے پاس آتا جاتا تھا۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ وہ فقہ کے لحاظ سے بھی عالی رتبہ ہیں۔ اس لئے میں نے ان کی صحبت لازم پکڑی اور ان کا درس قلمبند کرتا تھا۔

امام محمد خود بھی امام شافعی کی نہایت عزت کرتے تھے اور شاگردوں کی نسبت ان کے ساتھ خاص مراعات کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ایک دفعہ ہارون الرشید کے دربار میں جا رہے تھے، راہ میں امام شافعی ملے جو ان کی ملاقات کو آرہے تھے، اسی وقت گھوڑے سے اتر پڑے اور نوکر سے کہا کہ ''خلیفہ کے پاس جا کر عذر بیان کرو کہ میں اس وقت حاضر نہیں ہوسکتا۔'' امام شافعی نے کہا کہ میں اور کسی وقت حاضر ہوں گا آپ دربار تشریف لے جائیں۔'' امام محمد نے کہا کہ نہیں وہاں جانا کچھ ضروری نہیں [2] ''۔ امام محمد اور امام شافعی میں اکثر مناظرات بھی رہتے تھے اور اسی بناء پر بعضوں کو ان کی شاگردی سے انکار ہے، لیکن اس زمانہ کی استادی وشاگردی میں یہ امور معیوب نہ تھے اور دراصل آج بھی معیوب نہیں۔

امام محمد کی شہرت زیادہ تر فقہ میں ہے اور ان کی تصنیفات عموماً اسی فن کے متعلق پائی جاتی ہیں لیکن وہ تفسیر، حدیث، ادب میں بھی اجتہاد کا درجہ رکھتے ہیں۔

امام شافعی کا قول ہے کہ میں نے قرآن مجید کا عالم امام محمد سے بڑھ کر دیکھا [3] ادب و عربیت میں اگرچہ ان کی کوئی تصنیف موجود نہیں، لیکن فقہ کے جو مسائل نحو کی جزئیات پر مبنی ہیں اکثر جامع کبیر میں مذکور ہیں اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فن میں ان کا کیا پایہ تھا، چنانچہ ابن خلکان وغیرہ نے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] دیکھو توالی التاسیس مطبوعہ مصر صفحہ ۶۹۔

[2] توالی التاسیس صفحہ ۶۹۔ [3] الجواہر المضیۃ ترجمہ امام محمد۔

حدیث میں ان کتاب مؤطا مشہور ہے۔ اس کے علاوہ کتاب الحج جو امام مالک کے رد میں لکھی ہے، اس میں اکثر حدیثیں روایت کی ہیں اور متعدد مسائل میں جوش ادعاء کے ساتھ کہا ہے کہ مدینہ والوں کو دعویٰ ہے کہ وہ حدیث کے پیرو ہیں، حالانکہ ان مسائل میں صریح ان کے خلاف حدیث موجود ہے۔

امام محمد کی تصنیفات تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور آج فقہ حنفی کا مدار ان ہی کتابوں ہے، ہم ذیل میں ان کتابوں کی فہرست لکھتے ہیں جن میں امام ابوحنیفہ کے مسائل روایۃً مذکور ہیں اور اس لیے وہ فقہ حنفی کے اصل اصول خیال کیے جاتے ہیں

مبسوط

اصل میں یہ کتاب قاضی ابو یوسف کی تصنیف ہے ان ہی مسائل کو امام محمد نے زیادہ توضیح اور خوبی سے لکھا۔ یہ امام محمد کی پہلی تصنیف ہے۔

جامع صغیر

مبسوط کے بعد تصنیف ہوئی، اس کتاب میں امام محمد نے قاضی ابو یوسف کی روایت سے امام ابوحنیفہ کے تمام اقوال لکھے ہیں۔ کل ۵۳۲ مسئلے ہیں جن میں سے ایک سو ستر مسائل کے متعلق اختلاف رائے بھی لکھا ہے، اس کتاب میں تین قسم کے مسائل ہیں۔

۱:۔ جن کا ذکر بجز اس کتاب کے نہیں پایا جاتا۔

۲:۔ اور کتابوں میں بھی مذکور ہیں، لیکن ان کتابوں میں امام محمد نے تصریح نہیں کی تھی کہ یہ خاص ابوحنیفہ کے مسائل ہیں، اس کتاب میں تصریح کر دی ہے۔

۳:۔ اور کتابوں میں مذکور تھے، لیکن اس کتاب میں جن الفاظ سے لکھے ہے ان سے بعض نئے فائدے مستنبط ہوتے ہیں، اس کتاب کی تیس چالیس شرحیں لکھی گئیں، جن کے نام مختصر حالات کشف الظنون وغیرہ میں ملتے ہیں۔

جامع کبیر

جامع صغیر کے بعد لکھی گئی، ضخیم کتاب ہے اس میں امام ابوحنیفہ کے اقوال کے ساتھ قاضی ابو یوسف اور امام زفر کے اقوال بھی لکھے ہیں، ہر مسئلہ کے ساتھ دلیل بھی لکھی ہے، متاخرین حنیفہ نے اصول فقہ کے جو مسائل قائم کیے ہیں زیادہ تر اسی کتاب کے طرز استدلال وغیرہ سے استنباط کیے ہیں۔ بڑے بڑے نامور فقہاء نے اس کی شرحیں لکھی ہیں، جن میں سے بیالیس

شرحوں کا ذکر کشف الظنون میں ہے۔

زیادات

جامع کبیر کی تصنیف کے بعد جو فروع یاد آئے۔ وہ اس میں درج کیے زیادات نام رکھا۔

کتاب الحجج

امام محمد امام ابوحنیفہ کی وفات کے بعد مدینہ منورہ گئے اور تین برس وہاں رہ کر امام مالک سے موطا پڑھی۔ اہل مدینہ کا طریقہ جدا تھا۔ بہت سے مسائل میں وہ لوگ امام ابوحنیفہ سے اختلاف رکھتے تھے امام محمد نے مدینہ آکر یہ کتاب لکھی۔ اس میں اول وہ امام ابوحنیفہ کا قول نقل کرتے ہیں پھر مدینہ والوں کا اختلاف بیان کر کے حدیث اثر قیاس سے ثابت کرتے ہیں کہ ابوحنیفہ کا مذہب صحیح ہے اور دوسروں کا غلط، امام رازی نے مناقب الشافعی میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب چھپ گئی ہے اور ہر جگہ ملتی ہے، میں نے اس کا ایک قلمی نسخہ بھی دیکھا ہے۔

سیر وصیغر وکبیر

یہ سب سے اخیر تصنیف ہے۔ اول سیر صغیر لکھی اس کا ایک نسخہ امام اوزاعی کی نظر سے گزرا۔ انہوں نے طعن سے کہا کہ اہل عراق کو فن سیر سے کیا نسبت امام محمد نے سنا تو سیر کبیر لکھنا شروع کی، تیار ہو چکی تو ساٹھ جزوں میں آئی۔ امام محمد اس ضخیم کتاب کو ایک خچر پر رکھوا کر ہارون الرشید کے پاس لے گئے، ہارون الرشید کو پہلے سے خبر ہو چکی تھی، اس نے قدردانی کے لحاظ سے شہزادوں کو بھیجا کہ خود جا کر امام محمد سے اس کو سند لیں۔

ان کتابوں کے علاوہ امام محمد کی اور تصانیف بھی فقہ میں موجود ہیں مثلاً کیانیات، جرجانیات رقیات، ہارونیات، لیکن یہ کتابیں فقہا کی اصطلاح میں ظاہر الروایۃ میں داخل نہیں بلکہ کتاب الحجج جس کا ذکر اوپر ہو چکا وہ بھی اس سلسلے سے خارج ہے۔

امام زفر

فقہ میں اگرچہ ان کا رتبہ امام محمد سے زیادہ مانا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ ان کی کوئی تصنیف موجود نہیں ہے اور ان کے حالات بھی بہت کم معلوم ہیں۔ اس لیے صاحبین سے ان کو مؤخر رکھنا پڑا۔

یہ عربی النسل تھے، شروع زمانہ میں ان کو حدیث کا شغل رہا اور اسی وجہ سے جیسا کہ علامہ نووی نے تہذیب اللغات میں تصریح کی ہے، صاحب، الحدیث کہلاتے تھے۔ پھر فقہ کی

طرف توجہ کی اور اخیر عمر تک یہی مشغلہ رہا۔

یحییٰ بن معین جو فن جرح و تعدیل کے امام ہیں ان کا قول ہے کہ زفر صاحب الرای ثقة مامون۔[1] بعض لوگوں نے ان کی تصنیف بھی کی ہے۔ لیکن وہ مبہم ہے۔ اور قابل اعتبار نہیں۔

ان کو خاص کر قیاسی احکام میں نہایت کمال تھا۔ امام ابو حنیفہؒ کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ اقیس اصحابی۔ وکیع بن الجراح کا ذکر اوپر گزر چکا۔ ان سے استفادہ کرتے تھے، قضا کا عہدہ ان کو بھی ملا تھا۔

۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۸ھ میں وفات ہوئی۔

قاسم بن معن

بہت بڑے نامور شخص تھے، صحاح ستہ کے مصنفین نے ان سے روایت کی ہے۔ اگرچہ ان کو حدیث و فقہ میں بھی کمال تھا۔ لیکن عربیت و ادب میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ امام محمد ان کی خدمت میں استفادہ کی غرض سے حاضر ہوتے تھے۔ خلیفہ نے ان کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا۔ مجبوراً قبول کرنا پڑا، لیکن تنخواہ کبھی نہیں لی۔

امام ابو حنیفہ کو ان سے خاص محبت تھی، یہ بھی منجملہ ان لوگوں کے ہیں جن کی نسبت امام صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ''تم لوگ میرے دل کی تسلی اور میرے غم کے مٹانے والے ہو۔'' ان کو بھی امام صاحب کے ساتھ نہایت خلوص تھا۔ ایک شخص نے پوچھا کہ ''آپ فقہ و عربیت دو کے امام ہیں۔ ان دونوں علموں سے وسیع کون ہے؟ فرمایا کہ ''واللہ امام ابو حنیفہ کی ایک تحریر کل فن عربیت پر بھاری ہے۔'' ۱۷۵ھ میں وفات ہوئی۔

اسد بن عمرو

یہ پہلے شخص ہیں جن کو امام ابو حنیفہ کی مجلس تصنیف میں تحریر کا کام سپرد ہوا۔ بہت بڑے رتبہ کے شخص تھے، امام احمد بن حنبل نے ان سے روایت کی ہے اور یحییٰ بن معین نے ان کو ثقہ کہا ہے۔

ہلال رازی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ہارون رشید مکہ معظمہ گیا۔ طواف سے فارغ ہو کر کعبہ میں داخل ہوا اور ایک جگہ بیٹھ گیا۔ تمام اہل دربار اور اعیان ہاشم کھڑے تھے۔ مگر ایک شخص ہارون الرشید کے برابر بیٹھا۔ مجھ کو نہایت تعجب ہوا۔ لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اسد بن عمرو ہیں۔[2]

---

[1] تہذیب الاسماء واللغات علامہ نووی۔ [2] الجواہر المضیئہ

بغداد میں قضا کے عہدہ پر مامور تھے، ۱۸۸ھ میں انتقال کیا۔

علی بن المسہر

فن حدیث امام اعمش و ہشام بن عروہ سے حاصل کیا تھا، امام بخاری و مسلم نے ان کی روایت سے حدیثیں نقل کی ہیں۔ امام محمد بن حنبل ان کے فضل و کمال کا اعتراف کرتے تھے۔ امام سفیان ثوری نے امام ابوحنیفہ کی تصنیفات پر جو اطلاع حاصل کی ان ہی کے ذریعہ سے کی۔ موصل کے قاضی تھے، ۱۸۹ھ میں انتقال کیا۔

عافیہ بن یزید

یہ وہی بزرگ ہیں جن کی نسبت امام ابوحنیفہ مجلس تصنیف میں فرمایا کرتے تھے کہ جب تک عافیہ نہ آ چکیں کسی مسئلہ کو قلمبند نہ کرو، علامہ ذہبی نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ **کان من خیار القضاۃ**.

حبان

کثیر الروایۃ تھے۔ ابن ماجہ میں ان کی روایت سے متعدد حدیثیں موجود ہیں، امام ابوحنیفہ ان کی قوت حفظ کے بہت مداح تھے۔ ۱۷۲ھ میں وفات ہوئی۔

مندل

حبان کے بھائی تھے، امام اعمش و ہشام بن عروہ و عبدالملک بن عمیر و عاصم احول و امام ابوحنیفہ سے حدیثیں روایت کیں، نہایت متورع اور پرہیزگار تھے، ۱۶۰ھ میں انتقال کیا، ان کے بھائی حبان نے نہایت باثر مرثیہ لکھا۔ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں اس کے چند اشعار نقل کیے ہیں، دو شعر یہ ہیں:۔

فاذا اذكر فقدان اخی — انقلبت فی فراشی ارقا

واخ ای اخ مثل اخی — قد جری فی کل خیر سبقاً

تمت بالخیر

افسانہ یار ان کہن خواندم و رفتم

دریاب کہ لعل و گہرا فشاندم و رفتم

شبلی نعمانی ۱۵ دسمبر ۱۸۹۳ء (علی گڑھ)

---

[1] یہ حالات مجھ کو صرف الجواہر المضیہ سے معلوم ہوئے

ہماری دیگر مطبوعات
تحفۃ العروس
طب نبوی
اسلامی کتب خانہ
Islami Kutab Khana
فضل الٰہی مارکیٹ چوک اُردو بازار لاہور فون: 7223506-7230718